اردو میں تفسیری ادب

(ایک تاریخی اور تجزیاتی جائزہ)

پروفیسر ڈاکٹر محمد نسیم عثمانی

عثمانیہ اکیڈمک ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
ایس ٹی ۱۰/۵، گلشن اقبال کراچی

صدقہ جاریہ

اُردو میں تفسیری ادب

(ایک تاریخی اور تجزیاتی جائزہ)

پروفیسر ڈاکٹر محمد نسیم عثمانی (مرحوم)

عثمانیہ اکیڈمک ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
ایس۔ٹی ۱۰/۵ گلشنِ اقبال۔ کراچی

نام کتاب ــــــ اردو میں تفسیری ادب

سال اشاعت ــــــ ۱۹۹۴ء

تعداد ــــــ ۵۰۰

مطبوعہ ــــــ آر آئی پرنٹرز کراچی

قیمت ــــــ ۱۰۰ روپے

ناشر

عثمانیہ اکیڈمک ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

ایس۔ ٹی ۱۰/۵۔ گلشن اقبال۔ کراچی

فہرست مضامین

عرضِ مولف

تحقیقی مقالے کے لئے موضوع کی تلاش کسی طرح بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اس کدو کاوش میں کئی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ موضوع اچھوتا ہو اور اس پر کسی اور نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ یا اگر کی ہو تو اس کے بعض گوشے ایسے رہ گئے ہوں جن پر پوری طرح روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ موضوع ایسا ہو جو افادیت کا حامل اور دلچسپ ہو۔ ماخذ کثیر تعداد میں اور سہل الحصول ہوں اور ان پر پورے اعتماد سے مقالہ لکھا جا سکے۔

ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر میں نے مختلف موضوعات کا جائزہ لیا اور بہت غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ میں قرآن کریم سے متعلق کوئی موضوع منتخب کروں۔ اس لئے کہ یہی ہماری اصل محسن کتاب اور ہماری دینی و دنیوی سعادتوں کا سرچشمہ ہے۔ یہی ہمیں راہِ ہدایت دکھاتی ہے اور اسی سے ہمیں اپنا نظامِ زندگی مرتب کرنے میں روشنی ملتی ہے۔

یہ فیصلہ ہو جانے کے بعد کہ مجھے اپنے تحقیقی مقالہ کے لئے قرآن کریم سے کوئی موضوع لینا ہے، میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس جامع کتاب سے متعلق جو اللہ کا کلام ہے، موضوعات بھی کثیر تعداد میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کتابِ ہدایت کہہ کر نازل کیا ہے اور اس سے ہدایت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب اس کے

مطالب و مفہوم اچھی طرح سمجھ لیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی زبان میں لکھی جانے والی تفاسیر کا مطالعہ کرنا اور ان کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس خیال نے مجھے یہ فیصلہ کرنے میں مدد دی کہ میں قرآن کریم کی اردو میں لکھی جانیوالی تفاسیر ہی کو اپنی تحقیق کا موضوع بناؤں تاکہ اس سے خود بھی فائدہ حاصل کرسکوں اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا سکوں۔ یہ فیصلہ میرے لئے طمانیت کا موجب ہوا لیکن جب میں نے اس سلسلہ میں معلومات بہم پہنچائیں تو پتہ چلا کہ اور بھی بعض حضرات اس موضوع پر کام کر چکے ہیں جن میں ڈاکٹر سید عبدالحمید شطاری صاحب نے ۱۹۱۴ء تک لکھی جانے والی تفاسیر پر کام کیا ہے۔ حالانکہ زیادہ وقیع کام اس کے بعد ہوا ہے۔ اس بعد کے دور میں نہایت تفصیلی تفاسیر لکھی گئیں جس میں دوسری زبانوں بالخصوص عربی میں لکھی جانے والی بہت سی تفاسیر کے تراجم بھی اردو میں ہوئے ہیں۔ لہٰذا میرے لئے بہتر ہوگا کہ میں اپنے مقالہ کا موضوع بنیادی طور پر اسی دور کی تفاسیر کو بناؤں اور ربط و تسلسل قائم کرنے کے لئے اس سے پہلے کی تفاسیر کو بطور تمہید کام میں لاؤں۔

جب مجھے اس معاملہ میں انشراح قلب حاصل ہو گیا تو میں نے استادِ محترم جناب ڈاکٹر ابواللیث صاحب سے جن کی رہبری اور رہنمائی میں مجھے کام کرنا تھا اس کا ذکر کیا۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر صاحب نے میرے انتخاب کو سراہا اور مجھے اردو زبان میں لکھی جانے والی چودھویں صدی ہجری کی تفاسیر کا جائزہ لینے کی اجازت دے دی۔ یہی نہیں بلکہ مقالہ کا عنوان بھی مقرر کر دیا۔ "اردو میں تفسیری ادب۔ ایک تاریخی اور تجزیاتی جائزہ" بعد میں کراچی یونیورسٹی نے بھی منظوری دے دی اور میں نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔

پہلا کام یہ تھا کہ مجوزہ مقالہ کا خاکہ تیار کیا گیا جو حسب ذیل پانچ ابواب و مباحث پر مشتمل ہے۔

باب اوّل۔ تمہید:۔

تفسیری ادب کا تاریخی پس منظر۔ عربی اور فارسی میں تفسیری ادب کا مختصر جائزہ۔

باب دوم:۔

برصغیر پاک و ہند میں اردو کے ابتدائی دور میں تبلیغ اور تعلیم دین کے سلسلہ میں صوفیاء اور علماء کا کردار۔ ابتدائی دور کے ملفوظات، منظومات اور تفسیر کے نمونے دکن کا دینی سرمایہ ہیں۔

باب سوم:۔

قرآن کے اردو تراجم اور ان کے حواشی ـــــ شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے دورِ حاضر تک حواشی کا جائزہ۔

باب چہارم:۔

اردو کی مشہور تفاسیر۔ تاریخی جائزہ اور تجزیہ۔ فارسی تفاسیر (مثلاً تفسیر بیضاوی، تفسیر حسینی، تفسیر کبیر وغیرہ) کے اردو تراجم۔

باب پنجم:۔

اردو میں تفسیر نگاری کے مختلف مکاتبِ فکر اور ان کے اسلوب و منہاج کا جائزہ۔

ان پانچوں مباحث کے لئے بے شمار کتابوں کی ضرورت تھی۔ کتابوں کی فہرست تیار کی گئی تو ان کی کثیر تعداد کو دیکھ کر مجھے اپنی کم سوادی اور کام کی دشواری کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ لیکن چونکہ کلام اللہ کی تفسیر کا معاملہ تھا اس لئے یقیناً ہر مرحلہ پر نصرت خداوندی شاملِ حال رہی

اور آسانیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ بہت سے کرم فرماؤں کے تعاون سے کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ ان حضرات نے مجھے اپنے ذاتی ذخائر کتب اور اپنے زیرِ نگرانی کتب خانوں سے استفادہ کا پورا پورا موقع دیا اور اس معاملہ میں میری ہر طرح مدد کی۔ میں کھلے دل سے اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ اگر ان حضرات کا تعاون نصیب نہ ہوتا تو میرے لئے اس راہِ دشوار کو طے کرنا مشکل ہو جاتا۔ لہٰذا ان کی کرم فرمائیوں کے لئے مجھ پر ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ کتابیات پر نظر ڈالنے سے پتہ چلا اور میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا کہ دیگر دینی علوم کی طرح تفسیر کے موضوع پر بھی جتنا کام اردو زبان میں ہوا ہے اتنا عربی کے علاوہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہوا۔ چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں جو کام ہوا ہے وہ کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے پچھلی تمام صدیوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وقیع ہے۔ لیکن کلام اللہ کی وسعتوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے ؎

ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالہ

ظاہر ہے اس ہستی کے کلام کی تفسیر کا حق کما حقہٗ کون ادا کر سکتا ہے۔ جس کے اس چیلنج کا بھی ابھی تک کسی سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ "اگر تم سے ہو سکے تو اس جیسی ایک ہی آیت بنا کر لے آؤ۔"

انسان کے اس عجز کے باوجود ہمارے مفسّرین نے اپنی بساط کے مطابق اس سلسلہ میں اپنے اپنے انداز میں گراں قدر کام انجام دیا ہے۔ جس میں ان کے حُسنِ نیت کے جلوے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ قرآن جیسے بلیغ کلام کی تفسیر میں اختلاف کا ہونا

تو ایک قدرتی امر ہے۔ لیکن اگر کام خلوص اور للٰہیت سے کیا گیا ہے تو یہ لوگ دین و دنیا میں اجر کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ ان حضرات نے اللہ کے کلام کا فیض آئندہ نسلوں کی جانب منتقل کرنے میں اس مقدس ذات کا اتباع کیا ہے جس کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے:

بَعَثَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

میں نے اس کام کے لئے جس کی انجام دہی کی مجھے اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے سب سے زیادہ ممنون و متشکر استادِ محترم ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا ہوں جنہوں نے نہایت شفقتِ بزرگانہ سے کام لے کر میری رہبری و رہنمائی فرمائی۔ مجھے پوری طرح احساس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی مشغولیتیں اتنی زیادہ ہیں کہ میرے کام کے لئے وقت نکالنا ان کیلئے تقریباً ناممکن تھا، دوسرے ان کی صحت جسمانی بھی خاصی کمزور ہو چکی ہے۔ ایسی صورت میں مجھ ناچیز کے کام پر اتنی توجہ مبذول کرنا اور نہایت خوش دلی سے اس میں صائب مشورے دینا اور کوتاہیوں کی اصلاح کرنا ان کی بزرگانہ شفقت اور کرم بے نہایت کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ان نوازشوں کے مقابلہ میں مجھے شکریہ کا لفظ ہلکا اور قطعاً ناکافی معلوم ہوتا ہے۔ میں بارگاہِ رب العزت میں ان کی صحت و سلامتی، درازیٔ عمر اور جزائے خیر کے لئے صمیمِ قلب سے دعا کرتا ہوں۔

آخر میں اللہ ربّ السّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی بارگاہ میں شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس نیک کام کرنے کی توفیق ارزانی فرمائی اور اس کو تکمیل کی منزل تک پہنچانے کی سعادت عطا کی۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ

احقر العباد

محمد نسیم عثمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا لیکن زبان کی ترقی میں مذہب کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہی ہے کہ عربی جو عرب ممالک تک محدود تھی اسلام کی دعوت اور نعمت کے ساتھ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئی اور اسی بناء پر جن کی مادری زبان نہیں تھی ان کی تعلیم و تدریس اور تبلیغ کے لیے اس کی ضرورت پڑی تو صرف و نحو کی تدوین وجود میں آئی، لغت کی ضرورت ہوئی اور جن ملکوں کی اپنی اپنی زبانیں اور بولیاں تھیں وہاں بھی عربی کا زور ایسا ہوا کہ عرف عام میں عربی کے عالم کو ہی عالم سمجھا جاتا اور بکثرت علوم کی کتابیں ان ملکوں میں عربی میں لکھی گئیں۔ اور آج بھی دنیائے اسلام میں عربی کی بڑی اہمیت اور حیثیت ہے. اور خدا وہ دن جلد لائے کہ جملہ ممالک اسلامیہ کی اپنی ایک وفاق اور سلطنت ہو تو عربی کی اہمیت اور بڑھ جائے گی اور اس اتحاد و اتفاق کی نشانی عربی ہو گی۔

بات صرف عربی تک محدود نہیں، سنسکرت ہندوؤں کے مقدس ویدوں کی زبان ہے اور روایت یہ ہے کہ سنسکرت کی موجود قواعد کی کتابوں میں پانینی کی قواعد قدیم ترین ہے جو ٹکسلا (حالیہ پاکستان) میں لکھی گئی۔ مقصد یہی تھا کہ وید جو برہمنوں کے طبقہ میں ایک نسل سے دوسری نسل تک صرف زبانی منتقل ہونے کے باعث اس کی عبادت اور

قواعد میں فرق آگیا تھا۔ دورِ جدید میں بھارت اور پاکستان کے قیام کے بعد ہندوؤں نے اپنی سرکاری زبان کو اپنے قدیم مذہب اور کلچر کا رنگ دینے اور پکا کرنے کے لیے اس میں سنسکرت کے متروک اور مردہ الفاظ داخل کرنا شروع کر دیئے۔ اسی طرح لاطینی کو اور پھر انگریزی کو عیسائی مذہب کی تبلیغ کا سہارا نصیب ہوا۔ اسی کی ایک مثال خود اردو کی سلسلے میں ملتی ہے، جہاں ایک طرف اردو کے ابتدائی دور میں ہمارے علماء، صوفیائے کرام اور مبلغین نے جن کی اپنی اپنی زبانیں فارسی، عربی، ترکی تھیں، اردو کو جسے اس دور میں ہندوی اور ہندی کے نام سے پکارتے تھے .... کیا اور ذریعۂ تبلیغ و تعلیم و تدریس بنایا۔ حالانکہ اس دور میں علماء کی تصانیف و تالیفات عربی یا فارسی میں زیادہ تھیں۔ اور فارسی تو تہذیبی زبان تھی لیکن عوام کی تالیف قلوب کے لیے ان سے ان کی زبانوں میں ہم کلام ہو کر تبلیغ کا فریضہ خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ جبکہ سلاطین اور امراء اپنی سیاسی مصلحتوں کی بناء پر تبلیغ کی طرف سے غافل رہے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جس ملک پر انھوں نے آٹھ سو سال سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی وہاں وہ اقلیت میں رہے اور خود دارالخلافہ دہلی میں ان کی آبادی سولہ اور بیس فیصدی سے زیادہ نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کی سلطنت کمزور ہوئی تو پہلے تو فارسی کو جو ہندوستان سے لے کر ایران، افغانستان، وسط ایشیا اور ترکی تک کے مسلمانوں کا ایک مشترکہ ورثہ تھا۔ اپنی کوششوں سے اس کی تعلیم کو ایسا صدمہ پہنچایا کہ جو عالم تھے وہ ایک دن میں جاہل ٹھہرے اور انگریزی مدرسوں کے نیم خواندہ تعلیم و تدریس کے لیے مقرر ہوئے لیکن انگریزی اس ملک کی زبان کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی تھی۔ اور اگرچہ ایک

دور میں سلطنت برطانیہ کے اقبال کا آفتاب چوبیس گھنٹے میں کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ ان کو عوام سے رابطہ کے لیے پھر ان کی زبانوں کا سہارا لینا پڑا اور مشنریوں نے خود اردو سیکھی اردو کی قواعد نویسی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور عیسائیت کی تبلیغ کے لیے بھی وہی زبان اختیار کی جو سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی تھی اور جسے وہ عجیب عجیب ناموں سے یاد کرتے تھے۔ کوئی اسے فارسی کی ایک شاخ بتاتا، کوئی مورس (MOORS) یعنی موروں کی زبان کہتا۔ یہ خطاب انھوں نے ہسپانیہ کے مسلمانوں کو بخشا تھا۔ بعض اسے ہندوستانی کہتے بعض ہندوی، بعض مسلمانی لیکن استعمال سب وہی کرتے جسے ہم آج اردو کہتے ہیں۔

اس طویل مدت میں "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی گئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں دینی یعنی اسلامی لٹریچر روز اول سے ہی تخلیق ہو رہا تھا۔ پہلے پہل محض روزمرہ زندگی کے مسئلے مسائل پر نظم اور نثر میں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا کام شروع ہوا۔ یہاں تک کہ اردو میں مذہبی لٹریچر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا۔ مولوی عبدالحق کی نگرانی میں اردو میں مذہبی لٹریچر کے حوالوں کی ایک جلد مرتب کرائی تھی جو شائع ہو چکی ہے اور اس میں بھی بہت کچھ اضافے کی گنجائش ہے۔

اس کے بعد وہ دور آیا جس میں اسلامی لٹریچر کو اردو میں فروغ دینے کی کوشش شروع ہوئی۔ قرآن حکیم کا ترجمہ پہلے فارسی میں، پھر اردو میں ہوا تاکہ عوام جو عربی سے واقف نہ ہوں اس کے مطالب سے آگاہ ہو سکیں۔ اسی طرح اسلامی علوم عقلی و نقلی، حدیث، فقہ، اسماء الرجال، صرف و نحو قواعد، تاریخ وغیرہ کے موضوعات پر اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے کہ بعض

حضرات کے بقول شاید ہی کسی دوسری زبان میں ہو۔ اس میں ہر علاقہ ہر مسلک، ہر مکتب فکر اور نقطہ نظر سے لکھی جانیوالی اعلیٰ درجے کی علمی و تحقیقی کتابیں، رسالے، مضامین اور مقالات شامل ہیں۔ تفسیری ادب بھی اس فہرست کا ایک اہم جزو ہے۔ اور یہی اس تحقیقی مقالے کا موضوع ہے۔

ڈاکٹر محمد نسیم عثمانی مرحوم نے میرے مشورے پر اس موضوع پر تحقیقی کام شروع کیا اور اسے ایک نظم و ضبط کے ساتھ مکمل کرنے کے لیے بطور عنوان و موضوع مقالہ برائے پی ایچ ڈی جامعہ کراچی سے منسلک ہوئے۔ عثمانی صاحب مرحوم کے تہذیبی اور خاندانی پس منظر سے میں کسی قدر واقف تھا۔ انھوں نے علامہ شبیر عثمانی کے نام پر پہلے ہی ایک اکیڈمی اور اس سے منسلک ایک اسکول قائم کیا تھا۔ وہ خود ایک طویل مدت تک بطور علوم اسلامی کے استاد کے وفاقی گورنمنٹ اردو آرٹس کالج کے شعبۂ علوم اسلامی سے وابستہ رہے۔ اور اس کے صدر تھے۔ وفات سے صرف چند ماہ قبل ان کا تبادلہ اردو سائنس کالج میں اسی حیثیت سے ہوا۔ میں علوم دینی میں اپنی کم علمی سے واقف ہوں لیکن میں نے مقالہ کی نگرانی صرف نسیم عثمانی مرحوم کے علم اور لگن کے اصرار پر قبول کی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ انھوں نے تحقیق، تجزیہ، تبصرہ میں پوری محنت کی اور ایک ایسا مقالہ پیش کیا جو اس موضوع پر اہم تصانیف میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اور اس پر وہ قابلِ مبارک باد ہیں۔

تفسیر اور دیگر علوم میں ایک مشکل یہ ہے کہ ہمارے علماء مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے نظریات اس مکتب فکر کی ترجمانی کرتے ہیں اور اسے اپنا مسلک قرار دیتے ہیں۔ دین کے معاملے میں

تدبّر اور غور کی تاکید خود قرآن حکیم میں موجود ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس تدبّر سے اکثر مختلف نتائج بھی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس سے اسلام کے بنیادی ایمان، عقائد اور سماجی اساس پر کوئی غلط اثر مرتب نہ ہو۔ ہمارے یہاں بعض مسالک میں اختلاف نے بڑی شدت اختیار کرلی ہے۔ سرسیّد کے افکار الگ تھے جس سے بہت سے علماء کو اختلاف تھا اور ہے۔ دیوبندی اور بریلوی مکتبِ فکر اور اس سے وابستہ حضرات کی شدت بھی ہم سب جانتے ہیں۔ تفسیری ادب کے جائزہ میں بھی یہ مسئلہ تھا کیونکہ نسیم عثمانی صاحب کا واسطہ اور تعلق دیوبندی مکتبِ فکر سے تھا۔ اور بعض تفسیر نگاروں کا بریلوی ہے۔ لیکن عثمانی صاحب نے دیانت داری کے ساتھ تجزیہ اور تبصرہ کیا ہے۔ ان کے ایک ممتحن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب تھے جو خود اردو کے پروفیسر، محقق، نقاد، یونیورسٹی کے صدر شعبہ سے قطع نظر ایک عالم دین کی حیثیت سے ایک غیر متنازعہ شخصیت ہیں۔ غلام مصطفیٰ خان صاحب اس زبانی امتحان کی مجلس کے بھی ایک رکن تھے جو اس مقالہ پر ممتحن حضرات کی رائے کے پیشِ نظر مقالہ پر ڈگری دینے کے لیے فیصلہ کرنے کے لیے منعقد ہوئی۔ اپنی رپورٹ میں اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا ارشاد ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے۔

"مقالہ نگار نے اپنے مسلک کو نہیں چھوڑا ہے اور دوسروں کے مسالک کو نہیں چھیڑا ہے"

میں سمجھتا ہوں اس سے بہتر تنقید اس مقالہ پر اور کیا ہو سکتی ہے۔ مرحوم عثمانی صاحب کو اس مقالہ پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تو مل گئی۔ ان کا ارادہ اس سلسلہ کے بعض اور موضوعات پر کام کرنے کا تھا، افسوس کہ ان کی اچانک موت نے اسے ایک خواب ہی رہنے دیا۔

انسان کی جملہ صفات میں اس کی 'انسانیت' سے بڑھ کر اور کوئی صفت نہیں ہو سکتی۔ میں ذاتی واقفیت اور تجربہ کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں اعلیٰ درجے کی انسانی صفات موجود تھیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ ایک کمزور شخصیت تھے، وہ زندگی کی سختیوں سے آشنا تھے۔ اور ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ ان کی وفات سے میں ذاتی طور پر بھی ایک اچھے شاگرد، ایک مخلص دوست اور عزیز سے محروم ہو گیا۔ اگرچہ وہ دل کے مریض تھے مگر انتقال سے چند روز پہلے ہی وہ مجھ سے ملنے آئے اس وقت گمان بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلد رخصت ہو جائیں گے۔ مرضی مولا از ہمہ اولیٰ۔ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے اور جنت الفردوس عطا کرے۔

کراچی

۶ر جولائی ۱۹۹۳ء

ابواللیث صدیقی

حرفِ چند

"اردو میں تفسیری ادب" ڈاکٹر نسیم عثمانی صاحب کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جس پر انھیں جامعہ کراچی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی ہے۔ یہ مقالہ نہایت محنت اور قابلیت سے لکھا گیا ہے۔ اس کی کئی خوبیاں ہیں جن پر نظر رہنی چاہیے۔

۱۔ یہ ایک جامع مقالہ ہے اور موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔

۲۔ یہ مقالہ وقت کے اعلیٰ تحقیقی معیار پر پورا اترتا ہے۔

۳۔ مقالے کے تمام مطالب و مباحث کی تالیف و تدوین سائنٹی فک انداز میں کی گئی ہے۔

۴۔ کسی بحث کو مقالے میں جس حد تک مختصر یا طویل ہونا چاہیے تھا اسکا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ گویا کہ یہ مقالہ تالیف مطالب اور مباحث میں حسنِ توازن کی بہترین مثال ہے۔

۵۔ اس مقالے کی ایک بڑی خوبی مختلف تراجم، حواشی اور تفاسیر کے بارے میں حسنِ اعتدال ہے۔

۶۔ تفاسیر کے جائزے سے قبل تراجم قرآن مجید اور ایسے مختصر حواشی پر جن کی تفصیل تفسیر کے درجے کو نہیں پہنچتی نہایت عمدگی کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے اور نقد و جرح کی نظر ڈالی گئی ہے۔

۷۔ اس کے باوجود کہ فاضل محقق دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے دوسرے مکاتبِ فکر مثلاً بریلوی، اہلِ حدیث اور دیگر مذاہب و فرق مثلاً شیعہ، قادیانی، جماعت اسلامی وغیرہ کے تراجم و تفاسیر پر بھی خالص علمی، غیر فرقہ وارانہ انداز میں بحث کی ہے اور ان خصائص کے بیان میں

کسی تعصب سے کام نہیں لیا۔

۸۔ مقالہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس کا علمی و تحقیقی معیار، جامعیت و حسنِ تالیف و تدوین پی ایچ ڈی کے عام مقالوں سے بہت مختلف اور نہایت بلند ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مقالہ کسی ریسرچ اسکالر نے محض ڈگری کے حصول کے لیے نہیں لکھا بلکہ موضوع کی علمی اہمیت کے پیشِ نظر خالص علمی ذوق سے تحقیق کے جدید اصولوں کے مطابق کسی اکادمی، دار المصنفین یا ندوۃ المصنفین کی عظیم الشان لائبریری میں برسہابرس کی محنت شاقہ، نہایت جاں سوزی اور بہت جگر کاوی سے لکھا گیا ہے۔

۹۔ یہ مقالہ اردو کے دینی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

۱۰۔ اس مقالے میں ان بہت سی خوبیوں کے جمع ہو جانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس مقالے کی تحقیق اور تالیف و تدوین میں وقت کے مایہ ناز عظیم محقق اور استاذ الاساتذہ حضرت مخدومی ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مدظلہٗ کی رہنمائی حاصل رہی تھی۔ حضرت مخدومی کے ذوقِ علم و تحقیق اور خصوصی توجہ نے اسے تحقیق کا شاہکار بنانے میں بہت مدد دی۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس موضوع کے انتخاب میں حضرت مخدومی ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ کے مشورے کو دخل تھا۔

۱۱۔ اس تحقیق پر میں ڈاکٹر نسیم عثمانی صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

۱۲۔ میں یہ مشورہ دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ

الف:۔ اشاعت سے قبل اس پر نظرِ ثانی کر لی جائے تاکہ ٹائپ کی غلطیاں اور سہوِ قلم درست ہو جائیں۔

ب:۔ نیز یہ کہ مودودی صاحب کے تفہیم القرآن کے بارے میں ماہنامہ بینات کراچی، ماہنامہ البلاغ کراچی، ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک، ماہنامہ طلوع اسلام لاہور میں شائع ہونے والے مقالات اور دیوبند سے شائع ہونے والی کتاب "تفہیم القرآن" کا

تحقیقی وتنقیدی جائزہ ازمولانا خلیل الرحمٰن پرتاب گڑھی پر ایک نظر ڈالی جائے تو مجھے امید ہے کہ ان میں بعض مفید اور نئے نکتے ضرور ملیں گے۔ تفہیم القرآن میں بعض فاش اغلاط اور تاویلاتِ باطلہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وزارت اوقاف مملکت سعودی عربیہ نے اسے چھاپنا شروع کیا تھا لیکن جب اس کے اغلاط علم میں لائے گئے تو اس کی اشاعت موقوف کردی گئی اور ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن مع تفسیر عثمانی شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو اب تک کئی لاکھ کی تعداد میں شائع کیا جا چکا ہے۔

ج:- اسی طرح مولوی محمد علی لاہوری (قادیانی) کے ترجمے کے بارے میں بحث پر نظر ثانی ضرور کرلی جائے۔

یہ رائے میں نے ڈاکٹر عثمانی صاحب کی زندگی میں لکھی تھی اور انھیں دکھادی تھی۔

میرا خیال تھا کہ اس رائے میں بعض مباحث کے بارے میں چند اشارات کا اضافہ کروں گا۔ مرحوم سے میری آخری ملاقات ان کے انتقال سے تقریباً ایک ہفتہ یا دس دن قبل ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں اور یہ مقالہ مرحوم کی یادگار کے طور پر شائع کیا جارہا ہے۔ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ بحث و نظر کا کوئی دروازہ کھولا جائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی اس خدمت علمی و دینی کو قبول فرمائے، ان کے مراتب کو بلند فرمائے اور انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

ابوسلمان شاہجہان پوری

تفسیری ادب کا تاریخی پس منظر

لفظ "تفسیر" کا مادہ ہے فَسَّرَ (ف-س-ر) جس کا مفہوم ہے واضح کرنا یا ظاہر کرنا۔ چنانچہ "فسر المغطی" کے معنی ہوئے "ڈھکے ہوئے کو کھول دینا" اسی سے "التفسیر" کے معنی ہوئے "تاویل، کشف، وضاحت، بیان، شرح" ——— تفسیر کی جمع تفاسیر ہے۔[1]

اصطلاحاً "تفسیر" سے مراد کسی تحریر کے مطالب کو سامعین کے "قریب الفہم" کردینا ہے۔[2] ظاہر ہے کہ اگر کوئی بات مجملاً یا مختصراً بیان کی جائے تشبیہات و استعارات کو کام میں لایا جائے، تلمیحات اور تاریخی واقعات کو استعمال کیا جائے، بیان و بلاغت کے اصولوں کو برتا جائے تو اس کا سمجھنا ہر شخص کے لئے آسان نہیں ہوگا۔ لہٰذا کسی بات کو سب کے لئے قابلِ فہم بنانے کی غرض سے اس کی مختلف انداز سے توضیح و تشریح کرنی پڑے گی۔ اسکے ہر پہلو کو واضح طور پر بیان کیا جائے گا۔ اگر بات مختصر طور پر بیان کی گئی ہے تو اس کی تفصیلات بیان کی جائیں گی۔ مجاز اور تشبیہات و استعارات کو کام میں لایا گیا ہے تو اس کے حقیقی معنی بیان کرکے بات کہنے والے کے مافی الضمیر

---

1. مصباح اللغات صفحہ ۶۲۱، مرتبہ ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی مطبوعہ عبدالحئی پریس دہلی، اکتوبر ۱۹۵۸ء۔
2. تاریخ التفسیر ——— از مولانا عبدالصمد صارم الازہری، صفحہ ۱۱ مکتبہ معین الادب اردو بازار۔ لاہور۔ مطبع سلطانہ پریس لاہور ۱۹۷۹ء

کو پورے طور پر واضح کیا جائے گا۔ تاکہ بات میں کوئی ابہام یا الجھاؤ باقی نہ رہ جائے۔ اگر تلمیحات کو برتا گیا ہے یا تاریخی واقعات کا حوالہ دیا گیا ہے تو ضروری ہوگا کہ جن چیزوں کو بطور تلمیح استعمال کیا گیا ہے ان کو واضح طور پر بتا دیا جائے اور جن تاریخی واقعات کے صرف حوالے دیے گئے ہیں ان کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ جس بات کو بتانے کے لیے وہ تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں، اس سے ان تاریخی واقعات کا تعلق واضح ہو جائے اور اس بات کی حقیقت و اہمیت کا بھی پوری طرح اندازہ ہو جائے۔

جہاں تک کہ بیان و بلاغت کا تعلق ہے یہ چیزیں کلام کا زیور ہوتی ہیں اور کلام میں حسن، زور اور اثر پیدا کرنے کے لیے ان کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے لیکن ان سے وہی حضرات فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور محظوظ ہو سکتے ہیں جن کو قدرت نے ادبی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ عام سوجھ بوجھ کے انسانوں کے لیے تو یہ چیزیں بسا اوقات معمہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا ان کو سمجھانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ان صنائع، بدائع کی سادہ الفاظ میں توضیح و تشریح کر دی جائے اور یہ بھی بتا دیا جائے کہ ان صنائع، بدائع کے استعمال سے کلام میں کیا کیا خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

غرض تشریح و تفسیر کسی بات کی بھی کی جائے وہ ہر شخص کے لیے مفید ہوتی ہے۔ عام انسانوں کو تو اس بات کو سمجھانے کے لیے اس کی ضرورت بھی ہے، خواص کے لیے بھی اس میں افادیت و تفہیم کا بہت کچھ عنصر ہوتا ہے۔

جب عام انسانوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات کو دوسروں کے ذہن نشین کرانے کی غرض سے اس کی توضیح و تشریح کریں تو قرآن حکیم کے معاملہ میں، جو اللہ کا کلام ہے اس کی کیسے ضرورت نہیں ہوگی۔

دنیا کے تمام ذی فہم اور سلیم الطبع انسان اس بات پر متفق ہیں کہ

قرآن مجید سے زیادہ جامع کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس کا ایجاز حقیقی معنوں میں اعجاز ہے۔ ایک ایسی مختصر کتاب میں پورا نظامِ زندگی سمو دینا اور دنیوی اور اخروی زندگی کے تمام حقائق کو بیان کر دینا اسی ہستی کا کام ہو سکتا ہے جس کو ہم قادرِ مطلق کہتے ہیں ـــــ اللہ کی اس کتاب میں کتنی طرح کے اسٹائل ہیں۔ ایک سے ایک حسین و رنگین ـــــ اس میں سادہ نثر اور نثرِ رنگین کے بھی اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ مسجع مقفیٰ عبارتیں بھی ہیں۔ لفظی اور معنوی خوبیاں بھی ہیں اور تشبیہات و استعارات بھی ہیں۔ تلمیحات اور تاریخی واقعات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ روزانہ زندگی کے واقعات بھی ہیں اور حیاتِ اخروی کی کیفیات کا بھی ذکر ہے۔ روحانی لذتیں بھی اور سائنسی حقائق بھی۔ غرض اس میں اتنی خوبیاں ہیں کہ کوئی انسان بھی ان کا احصاء و احاطہ نہیں کر سکتا۔ کسی شاعر کے اس مصرع کا صحیح مصداق یہی کتاب ہے

ع دامانِ نظر تنگ و گلِ حسن تو بسیار

اتنی لامحدود خوبیوں سے مالا مال تحریر کی توضیح و تشریح کرنا اور تفسیر بیان کرنا بھی کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے غیر محدود علم کی ضرورت ہے۔ اور وہ کسی انسان کو حاصل نہیں۔ تاہم اس پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے اور سمجھانے کے لیے ضروری ہے کہ جن لوگوں کو اس کی جتنی فہم ہے اس کے مطابق وہ دوسروں کو بھی آگاہی بخشیں۔ چنانچہ عہدِ رسالت سے یہ کام ہو رہا ہے۔ اور جن لوگوں کو قدرت نے جتنی صلاحیت اور سمجھ دی ہے اس کے مطابق وہ عوام کو سمجھانے کے لیے اس کی وضاحت اور تشریح و تفسیر بیان کر رہے ہیں۔ چونکہ اس کے متعدد پہلو اور ان گنت گوشے ہیں اس لیے مفسرین نے اپنے ذوق اور میلانِ طبع کے بموجب مختلف انداز سے تفسیریں بیان کی ہیں کسی نے زبان و بیان کے نکات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کسی نے تاریخی واقعات کی روشنی میں تشریح کی ہے اور کسی نے اوامر و نواہی اور مسائلِ شرعیہ کو بنیاد بنا کر

سمجھایا ہے۔ بعد میں جب بعض اور علوم و فنون بھی مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بنے تو ان علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنے والوں نے ان کو مرکز و محور بنا کر تمام مسائل کو ان کی نسبت سے جانچا ہے۔ مثلاً بعض حضرات نے علم کلام کو بنیاد بنایا ہے اور بعض نے تصوّف کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ موجودہ زمانہ میں سائنس کا زور ہے تو کچھ لوگوں نے اپنی تفسیروں کا مدار سائنسی انکشافات و ایجادات کو بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تگ و دو میں بعض حضرات نے افراط و تفریط سے بھی کام لیا، جس کی وجہ سے نزولِ قرآن کا اصل مقصد پس منظر میں چلا گیا اور لوگ غیر ضروری اور لایعنی بحثوں میں الجھ کر رہ گئے۔

اس بحث و تمحیص میں اکثر حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ قرآنِ کریم کتابِ ہدایت ہے اور اس کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ حق کے متلاشی انسان اس کو اسی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں اور اِدھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے اس سے ہدایت حاصل کر کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہوں۔ یہی ہمارا وہ مطلوب و مقصود ہے جس کے لیے ہم دن میں کم از کم پانچ مرتبہ بارگاہِ رب العزت میں نہایت عاجزی سے ان الفاظ میں دعا کرتے ہیں:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ اور اس کے جواب میں مستجاب الدعوات نے ہمیں یہ نوید سنائی ہے۔

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ؁ البقرہ۔ ۱۔۳۔

اس میں ہدایت کے لیے بنیادی باتیں یہ بتائی گئی ہیں۔ تقویٰ۔ ایمان بالغیب قیام صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ جو کوئی بھی ان بنیادی باتوں کو اپنی زندگی کا محور بنائے گا اور ہر کام ان ہی کی روشنی میں کرے گا۔ وہ صراطِ مستقیم کو پالیگا

یہ نکات بتانے کے بعد فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نے پورے قرآن میں ان نکات کی وضاحت کر دی ہے اور ہمارے لیے زندگی کا پورا لائحہ عمل مرتب کر دیا ہے۔ اسی ضمن میں ماضی کی داستانیں اور تاریخی واقعات بیان کر کے یہ بتا دیا ہے کہ جن لوگوں نے اس لائحہ عمل کو اپنایا وہی اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے صحیح مصداق تھے۔ وہی اولیاء اللہ کہے جاتے ہیں اور ان ہی کی جماعت کو حزب اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف جن لوگوں نے اللہ کے بتائے ہوئے اس لائحہ عمل سے روگردانی اختیار کی وہ "مَغْضُوْب" اور "ضَآلِّيْن" کے زمرہ میں شامل ہیں۔ ان ہی کو "اولیاء الشیطان" کہا گیا ہے اور ان کی جماعت "حزب الشیطان ہے"۔

یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے عظیم ترین ہستی کی یہ عظیم ترین کتاب انسان پر نازل کی گئی۔ لہٰذا بہترین توضیح و تشریح اور تفسیر وہ ہوگی جو اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی جائے اور دیگر مباحث کو ضمنی حیثیت حاصل ہو۔

چونکہ قرآن کریم کے مخاطب اوّل عرب تھے اس لیے اس کو عربی زبان میں نازل کیا گیا اور قدرتی طور پر اس کی تفسیریں بھی سب سے پہلے عربی زبان میں کی گئیں۔ پھر چونکہ مہبطِ وحی ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تھی اس لیے قرآن کریم کی سب سے پہلی تفسیر بھی آپؐ ہی کی زبانِ مبارک سے ہوئی۔ اس مقصد کے لیے آپؐ نے جو کچھ بیان فرمایا وہ احادیثِ صحیحہ کے مجموعہ کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ چونکہ قرآن کریم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ یعنی (امورِ دین میں) آپؐ اپنی مرضی اور خواہش سے کچھ نہیں بولتے۔ جو کچھ فرماتے ہیں وہ وحی کے ذریعہ آپؐ کو بتایا جاتا ہے۔

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کریم کا متن اور اس کی جو تفسیر آپؐ نے بیان فرمائی دونوں پر وحی کا اطلاق ہوتا ہے۔ دونوں میں امتیاز کرنے کے لیے قرآنِ کریم کے متن کو "وحی متلو" اور احادیث کی شکل میں جو تفسیر آپؐ نے بیان فرمائی اس کو "وحی غیر متلو" کہا جاتا ہے۔

گلدستۂ حدیث کا یہ بیان حقیقت کا ترجمان ہے کہ:

خاتم النبیین حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقریر (سکوت) کو حدیث کہتے ہیں۔ حدیث قرآن کریم کی تفسیر ہے جس کے بغیر قرآن کی تفہیم ناممکن ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ

(النحل، ع ۶) ۔ ۴۴ ۔ ۱۴

(ترجمہ) اور آپؐ پر بھی ہم نے یہ یادداشت نازل کی کہ جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ آپؐ اس کو کھول کر لوگوں سے بیان کر دیں۔

احادیث، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ارشادات ہیں جس نے قرآن حکیم پڑھا، سنایا اور سکھایا یعنی "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے قرآن مجید کو آپؐ کی زبان میں آسان کر دیا تاکہ آپؐ لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرائیں اور مومنوں کو خلد بریں کی بشارت دیں۔"[1]

عہدِ رسالت کے بعد خلافتِ راشدہ کا دور شروع ہوا۔ اس دور میں صحابہ کرام کی مقدس جماعت موجود تھی جس نے براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اکتسابِ فیض کیا تھا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے

---

۱ گلدستۂ احادیث صفحہ ۲۲، پروفیسر محمد نسیم عثمانی، شائع کردہ شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ وفاقی گورنمنٹ اردو کالج، کراچی ۱۴۰۷ھ

بموجب تبلیغ کے کام کو جاری رکھا اور جملہ صحابہ نے کسی نہ کسی حد تک قرآن کی تفسیر بھی بیان فرمائی۔ اس کام کو کسی قدر بڑے پیمانے پر دو صحابہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ نے انجام دیا اور صحابیات میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جاری رکھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ نے اپنی بیان کردہ تفسیر کو تحریری شکل بھی دی۔ تفسیر ابن عباس کو تو آج بھی بطور حوالہ کثرت سے پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کی تفسیر کے بارے میں گلدستۂ احادیث میں مبادی التفسیر کے حوالہ سے کہا گیا ہے۔

"حضرت ابی بن کعبؓ نے بطور تفسیر ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اس مجموعہ سے امام جریر طبری نے کثرت سے اخذ کیا ہے۔ حاکم نے مستدرک میں اور امام احمد بن حنبل نے بھی اس میں سے لیا ہے۔"[1]

خلافتِ راشدہ کے بعد عہدِ بنی امیہ میں کئی تفسیریں لکھی گئیں لیکن یہ کام دوسرے علوم کی طرح زیادہ بڑے پیمانہ پر نہیں ہوا۔ بعض خلفائے بنو امیہ نے جو علمی مذاق رکھتے تھے اپنے دور کے بعض علماء و ائمہ سے جن میں سے اکثریت تابعین اور تبع تابعین کی تھی کچھ تفسیریں لکھوائیں۔ مثلاً خلیفہ عبدالملک بن مروان نے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اگر وہ خلافت کی ذمہ داریوں میں نہ پھنستا تو مدینہ کا سب سے بڑا فقیہ ہوتا حضرت سعید بن جبیر تابعی سے قرآن کریم کی تفسیر لکھوائی تھی۔ یہ خزانہ شاہی میں محفوظ رہی۔ کچھ عرصہ بعد عطاء بن دینار کے ہاتھ آگئی اور ان ہی کے نام سے مشہور ہوئی۔[2]

تابعین میں تفسیریں لکھنے والوں میں امام حسن بصری، ہمام ابن منبہ،

---

۱ گلدستۂ احادیث، صفحات ۲۸ ۔ ۲۹

۲ فہرست ابن الندیم نمبر ۶، بحوالہ تاریخ التفسیر از سید محمد عادم الازہری ص ۲۷ ۔

عکرمہ، قتادہ، ابن جریج اور سفیان ثوری کے نام نہایت اہم ہیں۔[1]

تابعین کی تحریر کردہ تفاسیر کا طرز یہ تھا کہ آیت اور اس کے تحت حدیث اور اقوال صحابہ و تابعین نقل کرتے تھے قصص اور علمی نکات پر زیادہ توجہ نہیں تھی۔[2]

اس کے بعد کے متصل دور میں علوم قرآن، تفسیر قرآن اور علوم تفسیر سے متعلق تصنیف کا کام جاری رہا اور ان موضوعات پر ساٹھ سے زیادہ کتابیں لکھی گئیں۔ اس دور سے تفسیر میں علمی نکات پر بھی بحث ہونے لگی۔[3]

ابتدائی دور کی تفسیر قرآن کے موضوع سے متعلق جن کتابوں کے نام ابن الندیم نے الفہرست میں دئیے وہ درج ذیل ہیں:[4]

(۱) کتاب الباقر محمد بن علی بن الحسینؑ۔ یہ کتاب باقر سے ابوالجارود زیاد بن منذر رئیس جارودیہ نے روایت کی۔ [1]

(۲) کتاب ابن عباس۔ اس کتاب کو مجاہد نے روایت کیا اور مجاہد سے حمید بن قیس نے روایت کیا۔ علاوہ ازیں ورقا نے ابونجیح سے اور ابونجیح نے مجاہد سے روایت کیا۔

(۳) کتاب التفسیر لابن ثعلب۔ کتاب التفسیر ابی حمزۃ الثمالی۔ اس کا نام ثابت بن دینار اور کنیت دینار ابو صفیہ ہے۔ ابو حمزہ پیروانِ علیؑ میں سے تھا۔ اس کا شمار نجباء ثقات میں ہوتا تھا۔ اس نے ابو جعفر کی مصاحبت و رفاقت اختیار کی تھی۔

۱۔ تاریخ التفسیر ص ۲۰ ۲۔ ایضاً ص ۲۸ ۳۔ ایضاً ص ۲۸

۴۔ الفہرست ابن الندیم صفحات ۸۳-۸۴ الفہرست (اردو) تصنیف اسحاق ندیم، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔ مطبع دین محمد پریس لاہور۔ طبع اول جون ۱۹۶۹ء۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۴۔ کتاب تفسیر محمد بن علی بن حسن۔ یہ قرآن کے چند اجزا پر مشتمل ہے۔

۵۔ کتاب التفسیر از زید بن اسلم بخط سکری۔

۶۔ کتاب تفسیر مالک بن انس۔

۷۔ کتاب تفسیر سدی

۸۔ کتاب تفسیر اسماعیل بن ابی زیاد۔

۹۔ کتاب تفسیر داؤد بن ابی ہند۔

۱۔ تہذیب التہذیب جلد ۲ کے حوالے سے الفہرست کے اردو ترجمہ میں حسب ذیل نوٹ دیا گیا ہے۔ جارودیہ ——— یہ ابوجارود زیاد بن منذر ہمدانی ایک روایت کے مطابق مہندی ثقفی، کوفی کا پیرو تھا۔ یہ شخص اس قسم کی حدیثیں وضع کرتا تھا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مخالفت اور ذم کا پہلو نکلتا ہو۔ یہ ۱۵۰ھ سے ۱۶۰ھ کے درمیانی عرصہ میں فوت ہوا۔

جارودیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ اسماً حضرت علیؑ کی امامت کی تصریح نہیں کی تاہم وصفاً کر دی تھی۔ لہٰذا آپ کے بعد مستحق امامت حضرت علیؓ ہی تھے۔ لوگ چونکہ وصف کو سمجھنے سے قاصر رہے اس لیے مطلوب کو نہ پا سکے اور اپنی مرضی سے ابوبکرؓ کو خلیفہ مقرر کر دیا۔

(الملل والنحل شہرستانی)

ابوالجارود کے بارے میں اس وضاحت کے بعد ہر شخص یہ آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس کی تفسیر کس معیار کی ہوگی۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس شخص نے جو کتاب حضرت محمد بن علی بن حسینؑ (یعنی امام محمد باقر) کے نام سے پیش کی ہے وہ واقعی ان کی لکھی ہوئی ہے یا اس نے خود لکھ کر اس کو معتبر بنانے کے لیے ان سے منسوب کر دیا۔ پھر یہ معاملہ تنہا ابوالجارود ہی کا نہیں بلکہ اس طویل فہرست میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی نظر آتی ہے۔

۱۰ کتاب تفسیر ابی دوق۔
۱۱ کتاب تفسیر رشید بن داؤد۔
۱۲ کتاب تفسیر سعید بن عیینۃ۔
۱۳ کتاب تفسیر نہشل بروایت ضحاک بن مزاحم۔
۱۴ کتاب تفسیر عکرمہ ابن عباس۔
۱۵ کتاب تفسیر الحسن بن ابی الحسن البصری
۱۶ کتاب تفسیر ابی بکرم الاصم ـــــ اس کا شمار متکلمین میں ہوتا ہے۔
۱۷ کتاب تفسیر ابی کریمہ یحییٰ بن مہلب۔
۱۸ کتاب سیار بن عبدالرحمٰن النحوی۔
۱۹ کتاب سعید بن بشیر از قتادہ۔
۲۰ کتاب تفسیر محمد بن ثور از معمر بن قتادہ۔
۲۱ کتاب تفسیر الکلبی محمد بن سائب۔
۲۲ کتاب تفسیر مقاتل بن سیمان
۲۳ کتاب تفسیر یعقوب الدودمی۔
۲۴ کتاب تفسیر الحسن بن واقد۔ ان کی ایک تصنیف کتاب الناسخ والمنسوخ بھی ہے۔
۲۵ کتاب تفسیر مقاتل بن حیان۔
۲۶ کتاب تفسیر سعید بن جبیر۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۲۷ کتاب تفسیر وکیع بن الجراح۔
۲۸ کتاب تفسیر ابی رجاء محمد بن سیف۔
۲۹ کتاب تفسیر یوسف القطان۔
۳۰ کتاب تفسیر محمد بن ابی بکر المقدمی۔

۳۱ کتاب تفسیر ابی بکر بن ابی شیبہ۔
۳۲ کتاب تفسیر ہشیم بن بشیر۔
۳۳ کتاب تفسیر ابن ابی نعیم الفضیل بن وکین۔
۳۴ کتاب تفسیر ابی سعید الاشج۔
۳۵ کتاب تفسیر الامی الذی نزل فی اقوام باعیانہم از ہشام کلبی۔
۳۶ کتاب ابوجعفر الطبری۔
۳۷ کتاب تفسیر ابن ابی داؤد السجستانی۔
۳۸ کتاب تفسیر بکر بن ابی الثلج۔
۳۹ کتاب ابی علی محمد بن عبدالوہاب الجبائی۔
۴۰ کتاب ابوالقاسم البلخی۔
۴۱ کتاب ابی مسلم محمد بن بحر الاصفہانی۔
۴۲ کتاب ابی بکر بن الاخشید (اختصارین)۔
۴۳ کتاب ابوجعفر الطبری۔
۴۴ کتاب المدخل الی التفسیر از ابن امام معری۔
۴۵ کتاب التفسیر لابی بکر الاصم۔

تبع تابعین کا دور تقریباً دوسری صدی ہجری کے اختتام تک ختم ہوگیا۔ تیسری صدی کے آغاز سے ہر شعبۂ زندگی میں عجمیت کا غلبہ ہونا شروع ہوا۔ تفسیر قرآن پر بھی عجمیت کے اثرات پڑنے لگے۔ اس سلسلہ میں بعض نئے فنون ایجاد ہوئے۔ جیسے علم افراد جمع، علم اسباب نزول، علم اختلاف،

مصاحف، علم ناسخ و منسوخ وغیرہ۔ اسی عہد سے اسرائیلیات اور تاریخی قصص کا بھی ذکر تفسیر میں آنے لگا۔ فتوحات کے ساتھ ساتھ عربوں کے علاوہ دوسری قومیں بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوتی چلی گئیں۔ عرب تو خود اہلِ زبان تھے اس لیے وہ عربی زبان کی خصوصیات اور باریکیوں کو کسی نہ کسی حد تک سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ فطرتاً بھی اختصار پسند تھے۔ لہٰذا وہ قرآن کی تفسیر کو چند لفظوں میں بلکہ بعض اوقات اشاروں میں سمجھ لیتے تھے لیکن دوسری قومیں جن پر عجمی کا اطلاق ہوتا ہے ان دونوں خوبیوں سے محروم تھیں۔ وہ نہ زبان کی باریکیوں کو سمجھتی تھیں اور نہ مختصر تشریح سے مطمئن ہوتی تھیں۔ لہٰذا ان کو سمجھانے کے لیے زیادہ وضاحت کی ضرورت تھی جس کی وجہ سے مفصل تفسیریں بیان کی گئیں۔

عجمیوں کو تفہیمِ قرآن کے سلسلہ میں اس چیز کی ضرورت بھی پیش آئی کہ تفسیر سے پہلے ان کو ان کی اپنی زبان میں متن قرآن کا ترجمہ بھی سمجھایا جائے اس لیے کہ تمام عجمی عربی زبان نہیں جانتے تھے۔ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا ترجمہ کی ضرورت بڑھتی گئی۔ اور اب یہ نوبت آگئی ہے کہ ترجمہ سمجھے بغیر تفسیر کا سمجھنا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔ اسی لیے موجودہ زمانہ میں غیر عرب قوموں میں قرآن فہمی کے لیے ترجمہ اور تفسیر لازم و ملزوم سے ہوگئے ہیں اور اس غرض سے ہر زبان میں قرآن کے متعدد ترجمے دکھائی دینے لگے ہیں۔

تفسیر قرآن کے سلسلہ میں اسرائیلی قصے اور تاریخی واقعات کسی حد تک عہدِ صحابہ میں بھی بیان ہونے لگے تھے۔ کیونکہ بعض صحابہ جو دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے پہلے یہودی تھے۔ اپنے ذہنوں میں یہ داستانیں اور قصّے لے کر آئے تھے۔ انھوں نے بڑی دیانت داری سے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں یہ قصّے عربوں کے سامنے بیان کیے اور سادہ مزاج عربوں نے ان کو صحیح سمجھ کر قبول

کرلیا۔ اور بعض قصّے تفسیروں میں داخل ہوگئے۔ لیکن اس وقت یہ زیادہ نہیں بڑھنے پائی۔ بعد میں عجمیوں کے ہاتھوں یہ باتیں مبالغہ کے تمام حدود پار کرتی ہوئی اتنے آگے نکل گئیں کہ تفسیر کا اصل مقصد پسِ پشت جا پڑا اور یہی چیزیں اصل تفسیر سمجھی جانے لگیں۔ رفتہ رفتہ اسرائیلیات شانِ نزول ناسخ و منسوخ وغیرہ پر اتنا زور دیا جانے لگا کہ ان باتوں پر قدغن لگانے کے لیے تفسیر کے اصول وضع کرنے پڑے۔ اور اصولِ تفسیر کے نام سے ایک نیا علم معرضِ وجود میں آگیا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سی کتاب "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" اسی موضوع سے متعلق ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے ان امور پر جو تفسیر میں بڑی اہمیت اختیار کر گئے تھے، بحث کر کے ان کی حدیں مقرر کی ہیں۔ انھوں نے اسرائیلیات کو بیان کرنے سے منع کیا ہے۔ شانِ نزول پر بھی خاصی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ہر سورۃ اور آیت کا شانِ نزول تلاش کرنا فعل عبث ہے۔ قرآن حکیم کتابِ ہدایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے جس وقت جس حکم کی ضرورت سمجھی نازل فرمایا۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوا کہ اس حکم سے ملتا جلتا کوئی واقعہ پیش آگیا جس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ حکم اس واقعہ کی وجہ سے نازل ہوا ایسے بعض اتفاقی واقعات کو بنیاد بنا کر ایک کلیہ قائم کرنا اور ہر حکم کے لیے شانِ نزول تلاش کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

ناسخ و منسوخ کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۵۰۰ تک جا پہنچی تھی شاہ صاحب اس تعداد کو گھٹا کر پانچ تک لے آئے اور بتایا کہ وہ بھی دراصل تدریجی احکام تھے جو ـــــــ ضعیف انسان کی فطری کمزوری کی وجہ سے اس کی ایک خصلت و عادت کو چھڑا کر دوسری متضاد خصلت پر لانے کے لیے نازل کیے گئے تھے۔ مثلاً نشے کی عادت کو چھڑانے کے لیے خمر کی حرمت کا حکم تین مرحلوں میں نازل ہوا۔

عربی تفاسیر کی جو فہرست محمد بن اسحاق ندیم کی کتاب "الفہرست" سے پیش کی گئی ہے وہ ۳۷۷ھ تک کی ہے۔ خود ابن الندیم کی صراحت کے بموجب مفسرین میں مختلف مکاتب فکر کے لوگ شامل ہیں۔ اس لیے ان کی تفسیریں بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ ان میں ابن جریر طبری کی تفسیر سب سے زیادہ تفصیلی ہے۔ اس کو شہرت بھی بہت حاصل ہوئی۔

اس کے بعد بھی تفسیریں لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ صرف عربی میں ہی اتنی تفسیریں لکھی گئیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ تاہم برصغیر سے باہر جن عربی تفاسیر کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) تفسیر طبری
(۲) کشاف
(۳) مفاتح الغیب
(۴) تفسیر بیضاوی (انوار التنزیل و اسرار التاویل)
(۵) تفسیر محی الدین ابن عربی۔
(۶) تفسیر ابن کثیر
(۷) تفسیر جلالین

(۱) تفسیر ابن جریر طبری کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ابن الندیم کی رائے ہیں،

"اس سے بہتر کوئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی۔ ایک گروہ نے اس کا اختصار کر لیا ہے جن میں ابوبکر بن اخشید وغیرہ شامل ہیں"[1]

---

[1] الفہرست ص ۳۴۹

لیکن ابن الندیم کی اس رائے سے اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے۔ ممکن ہے اسکے زمانہ تک اس کتاب کو یہی حیثیت رہی ہو لیکن بعد کے ایک ہزار سالہ دور کے لیے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ طبری کی تاریخ کو کبھی "اصح التواریخ" کا درجہ دیا گیا تھا۔ مگر اب اس کو ایک دعویٰ بے دلیل سمجھا جاتا ہے۔ یہی بات تفسیر طبری کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

(۲) کشاف یا تفسیر کشاف: اس کے مصنف علامہ ابوالقاسم جاراللہ محمود بن عمر الزمخشری خوارزمی (۵۳۸ھ / ۱۱۴۴ء) ہیں۔ وہ معتزلی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے کلامی بحثیں زیادہ کی ہیں اور بہت کچھ فرقہ معتزلہ کے عقیدہ کے مطابق تفسیر بیان کی ہے مولانا عبدالصمد صارم الازہری لکھتے ہیں:

"اس تفسیر میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن بعض نقائص بہت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ جو آیت عقیدہ اعتزال کے خلاف ہے مفسر نے کلام طویل اور تاویلات رکیکہ سے اس کو اعتزال کے مطابق بتانے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے یہ کہ مفسر نے اولیاء اللہ پر طعن کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اہل سنت کو سخت سست کہا ہے"[1]

(۳) مفاتح الغیب ـــــ یہ امام فخرالدین رازی کی تفسیر ہے اور تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے۔ امام صاحب اس کو اپنی زندگی میں مکمل نہیں کر سکے تھے۔ وہ سورۃ انبیاء تک دس جلدوں میں تفسیر لکھنے پائے تھے کہ (۶۰۶ھ / ۱۲۱ء) میں ان کا انتقال ہو گیا۔ شیخ نجم الدین احمد بن محمد القمولی (۷۷۷ھ / ۱۳۵۷ء) نے اس کی تکمیل کی۔

---

[1] تاریخ التفسیر ص ۶۳

مولانا عبدالصمد صارم صاحب اس تفسیر کے متعلق ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

"اس میں .... علوم عقلیہ ونقلیہ کی بحثیں ہیں۔ عجیب و غریب مفید تفسیر ہے[1]"

لیکن نواب صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی نے اس پر بڑی سخت تنقید کی ہے اور یہ تک کہہ دیا ہے کہ:

"یہ تفسیر کے سوا سب کچھ ہے"

اس ریمارک پہ مولانا عبدالصمد صارم صاحب نواب صدیق حسن صاحب کی بات کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ تفسیر جس زمانہ میں تصنیف ہوئی اگر تصنیف نہ ہوئی ہوتی تو ہزاروں مسلمان سلام کر چکے ہوتے[2]"

(۴) تفسیر بیضاوی۔ اس تفسیر کا اصل نام انوار التنزیل واسرار التاویل ہے۔ اس کے مصنف قاضی ابوسعید ناصر الدین علی بن عمر بیضاوی ہیں۔ لیکن مصنف کے نام سے زیادہ اس تفسیر کی شہرت ہے۔ قاضی بیضاوی شافعی المذہب تھے۔ وہ ۶۸۵ھ / ۱۲۸۶ء میں فوت ہوئے۔ ان کی تفسیر کے بارے میں عبدالصمد صارم رقم طراز ہیں۔

"یہ نہایت عمدہ اور معتبر تفسیر ہے۔ مگر اس میں فضائل سورہ میں بعض احادیث ضعیف و موضوع بھی لائے ہیں۔ علما و فضلا نے کثرت سے اس تفسیر پر تعلیقات اور حواشی لکھے ہیں۔ بعض نے تلخیص کی ہے[3]۔"

---

۱ تاریخ التفسیر ص ۱۱۲

۲ ایضاً ص ۶۴

۳ تاریخ التفسیر ص ۷۰-۷۱

(۵) شیخ محی الدین ابن عربی کے دو تفسیریں ہیں (۱) تفسیر کلاں چھ جلدوں میں ہے مگر صرف سورہ کہف تک اور (۲) تفسیر خورد دو جلدوں میں اور مکمل ہے۔ شیخ اکبر تصوف اور وحدۃ الوجود کے بہت بڑے داعی تھے اس لیے ان کی تفسیریں اسی رنگ میں ہیں۔ بعض باتیں جو شرعی نقطۂ نظر سے کھٹکتی ہیں شیخ عبدالوہاب شعرانی کے نزدیک بعد میں شریر لوگوں نے اپنی طرف سے شامل کر کے شیخ اکبر کے نام سے منسوب کر دی ہیں۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی کا یہ خیال درست بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ اکابر کی تصانیف میں تحریف کا عمل بہت بڑے پیمانہ پہ ہوا ہے۔

(۶) تفسیر ابن کثیر۔ یہ تفسیر بھی بے حد مشہور و مقبول ہے۔ اس میں زبان و بیان کے نکات زیادہ بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا عبدالصمد صارم الازہری فرماتے ہیں۔

"حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ / ۱۳۷۲ء) کی تفسیر صحیح اور معتبر ہے[1]"

(۷) تفسیر جلالین ــــ اس تفسیر کو جلال الدین نام کے دو علماء نے مکمل کیا، اس لیے اس کا نام تفسیر جلالین (دو جلال والی) پڑ گیا۔ اس کو شیخ جلال الدین محمد بن احمد محلی (متوفی ۸۱۴ھ / ۱۴۱۱ء) نے لکھنا شروع کیا تھا لیکن وہ اپنی بے وقت رحلت کی وجہ سے مکمل نہیں کر سکے تھے۔ اس لیے بعد میں اس کو علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء) نے پورا کیا۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بے حد مختصر ہے۔ کہیں تو قرآن کے متن پر ہی دو چار لفظوں کا اضافہ کر کے مطلب کو واضح کر دیا گیا ہے۔ کہیں کوئی مختصر سی عبارت بڑھا دی گئی ہے۔ لیکن اس اختصار

---

۱ تاریخ التفسیر ص ۱۱۷

کے باوجود اس کو بے حد شہرت ہوئی اور یہ تفسیر درس نظامی میں ہمیشہ داخل رہی۔ طلبہ جو لمبی چوڑی بحثوں میں پڑنا نہیں چاہتے اس تفسیر کو پسند کرتے ہیں۔ اس تفسیر کے حروف سورہ مزمل تک قرآن مجید کے حروف کے برابر ہیں۔

اس کے اختصار کی وجہ سے اس پر کثرت سے حواشی اور شرحیں لکھی گئیں۔ حواشی میں قبس النیرین از شیخ شمس الدین محمد بن علقمی ———— جمالین از شیخ نور الدین ———— الفتوحات الالٰہینہ از شیخ سلیمان اور زلالین قابلِ ذکر ہیں اور شروح میں زیادہ شہرت مجمع البحرین و مطلع البدرین اور ہلالین کو حاصل ہے۔

برِ صغیر میں عربی تفاسیر

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے سلسلہ میں مورخین اور مصنفین مختلف الخیال ہیں۔ بعض حضرات تو یہ تک کہتے ہیں کہ برصغیر میں اسلام عہدِ رسالت ہی میں پہنچ گیا تھا۔ بعض صاحبان عہدِ فاروقی اور بعض عہدِ عثمانی کو اس کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر ان آراء کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی یہ ماننا ممکن نہیں کہ اسی وقت سے یہاں سلطنتِ اسلامیہ کا قیام عمل میں آگیا تھا یا علمی اور تمدنی سرگرمیاں شروع ہوگئی تھیں۔ وثوق سے جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ محمد بن قاسم کی فتحِ سندھ کے بعد سے ہی اس ظلمت کدہ میں اسلام کی شمع روشن ہوئی۔ اسی وقت سے تبلیغ کا کام شروع ہوا اور اسی کے بعد سے علمی کاموں کا آغاز ہوا۔ لیکن اس زمانہ کے علمی کام اور تحریری نمونے محفوظ نہیں رہے۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس دوران قرآن کریم کی کوئی تفسیر لکھی گئی یا نہیں۔

برصغیر میں اسلامی دور کی علمی اور تمدنی سرگرمیوں کا تفصیلی حال فتح دہلی کے بعد سے معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت بھی چونکہ فرمانرواؤں کا اور ان کے اثر سے عوام کا رجحان تصوّف، اخلاقیات اور فقہ کی جانب زیادہ تھا۔ اس لیے تفسیر اور حدیث کی جانب بہت کم توجہ کی گئی۔ فتح دہلی سے تقریباً ڈھائی، تین صدی بعد تک تفسیر قرآن کا کوئی قابلِ ذکر نمونہ سامنے نہیں آتا۔ اس کے بعد بھی دار الحکومت سے دور گجرات اور دکن میں اس راہ میں کچھ پیش رفت دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں لکھی جانے والی سب سے پہلی قابلِ ذکر تفسیر جس کا سراغ ملتا ہے وہ کاشف الحقائق اور قاموس الدقائق ہے اور یہ گجرات کے ایک بزرگ محمد بن احمد (م ۸۴۰ھ / ۱۴۳۷ء) کی تصنیف ہے لیکن اس میں بھی مصنف نے تصوّف کی رنگ آمیزی کی ہے اور صوفیہ اور اولیاء اللہ کے حوالے دئے ہیں۔ وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

> "...... اولیاء اللہ صلحاء اور بزرگوں کے قصے کہیں کہیں بعض جگہوں پر بیان کیے گئے ہیں..... اس لیے کہ صوفیانہ رنگ کی کوئی تفسیر نظر نہیں آتی۔ اسی نقطۂ نظر کے پیشِ نظر میں نے اس کی ضرورت سمجھی"[1]

چنانچہ سورہ فاتحہ کی تفسیر اسی صوفیانہ رنگ میں اس طرح شروع کی گئی۔

> "(اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے بجائے) اَحْمَدُ اللّٰهَ کہتے تو اس میں ادائے لفظ کے وقت حضورِ قلب ضروری تھا ورنہ کذب بیانی ہوتی۔ پھر اَحْمَدُ اللّٰهَ" (میں اللہ کی حمد کرتا ہوں کہنے میں صرف اپنی

---

[1] ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں ڈاکٹر محمد سالم قدوائی ص ۲۵ مکتبہ جامعہ ملیہ لمیٹڈ نئی دہلی مطبوعہ کوہِ نور پرنٹنگ پریس۔ دہلی۔ ۶ر اگست ۱۹۷۳ء۔

حمد کا ذکر ہونا اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" اپنی وغیرہ سب کی حمد پر حاوی ہے" (مفہوم ملخص)۔[17]

عربی زبان میں لکھی جانے والی دوسری قابلِ ذکر تفسیر "تفسیر ملتقط" ہے جو سید محمد گیسو دراز ...... (م ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء) سے منسوب ہے۔ حضرت سید محمد گیسو دراز کا صوفیائے ہند میں جو مقام ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ـــ اس صورت میں اس تفسیر پر صوفیانہ خیالات کا رنگ چھایا ہوا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ تھوڑا سا نمونہ ملاحظہ ہو:

سورۃ الحجر میں لطائف کے تحت ایک جگہ "وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا فِيْهَا رَوَاسِيَ۔ الآیۃ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں: (ترجمہ)

"نفوسِ عابدین ارض عبادۃ قلوب عارفین ارض معرفت اور ارواح مشتاقین ارضِ محبت ہے۔ امید و بیم پہاڑ ہیں۔ کہا جاتا ہے اولیاء اوتادِ ارض ہیں جن کے ذریعہ اللہ مخلوق سے بلاؤں کو دور کرتا ہے....[18]

اس کے بعد عربی زبان میں برصغیر میں جو تفسیریں لکھی گئیں ان میں چودہ پندرہ تفسیریں زیادہ توجہ کے قابل ہیں۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے ان تفاسیر اور ان کے مصنفین کے نام ذیل میں درج ہیں۔

(۱) تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان بعض ما یشیر الی اعجاز القرآن — مصنف شیخ علاؤ الدین علی بن احمد المہائمی۔
ولادت ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء وفات ۸۳۵ھ/۱۴۳۲ء

[17] ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں ص ۳۴

[18] ایضاً ص ۲۰۶

(۲) تفسیر القرآن — مصنف شیخ حاجی عبد الوہاب (م ۹۳۳ھ/۱۵۲۷ء)

(۳) تفسیر محمدی — " حسن محمد بن میا نجیوی، ولادت (۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء)

(۴) منبع عیون المعانی و مطلع شموس المثانی — شیخ مبارک بن خضر ناگوری (م ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء)

(۵) سواطع الالہام — ابو الفیض فیضی (م ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء)

(۶) انوار الاسرار فی حقائق القرآن — شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی (م ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء)

(۷) زبدۃ التفاسیر — شیخ عین الدین بن خاوند محمود کشمیری (م ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء)

(۸) زبدۃ التفاسیر للقدماء المشاہیر — شیخ الاسلام بن قاضی عبد الوہاب گجراتی (متوفی ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۸ء)

(۹) ثواقب التنزیل فی اشارۃ التاویل — ملا علی اصغر بن عبد الصمد قنوجی (متوفی ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۸ء)

(۱۰) قرآن القرآن بالبیان — شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی، ولادت ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء وفات ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۹ء

(۱۱) تفسیر صغیر — امیر عبد اللہ محمد بن علی اصغر قنوجی (م ۱۱۷۸ھ/۱۷۶۴ء)

(۱۲) تفسیر مظہری — قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء)

(۱۳) فتح البیان فی مقاصد القرآن — نواب صدیق حسن خاں قنوجی (م ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء)

(۱۴) تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن — مولانا ثناء اللہ امرتسری (م ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء)

یوں تو ان میں سے ہر تفسیر کی کوئی نہ کوئی خوبی ہے لیکن لوگ ابوالفیض فیضی کی تفسیر "سواطع الالہام" کو اس وجہ سے بڑی اہمیت دیتے ہیں کہ وہ صنعت غیر منقوط میں لکھی گئی ہے۔ جو لوگ اس طرح کی کارگزاریوں سے متاثر ہوتے ہیں وہ تو اس کو فیضی کا بہت بڑا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے قلوب میں قرآن کریم کی عظمت کے کچھ نقوش قائم ہیں۔ وہ تفسیر قرآن کے سلسلہ میں فیضی کے اس طرح کے کرتبوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ چنانچہ ملا عبدالقادر نے اس کے اس فعل کی مذمت کی ہے۔ اگر ہم بفرض محال اس کو ملا بدایونی کی مبالغہ آرائی پر بھی محمول کریں تب بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فیضی نے اپنی ذہانت وذکاوت کا بے محل استعمال کیا ہے۔ اس لیے کہ تفسیر لکھنے کا مقصد قرآنی تعلیم کو لوگوں کے ذہن نشیں کرنا ہوتا ہے نہ کہ اپنی ذہانت وقابلیت کی نمائش کرنا۔

برصغیر میں بہ زبانِ عربی لکھی جانے والی ایک قابلِ ذکر تفسیر "تفسیرِ مظہری" ہے۔ یہ مرزا جان جاناں مظہر کے شاگرد قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی لکھی ہوئی ہے۔ "تفسیرِ مظہری" دس جلدوں میں ہے۔ اس میں قاضی صاحب نے الفاظ کی تشریح اور معنی ومطالب کے ساتھ ساتھ مسائل کی تشریح میں حنفیوں کے نقطۂ نظر کو مدلل طور پر پیش کیا ہے۔ اس سے پہلے "بیضاوی" تفسیر کی کتابوں میں بڑی مقبول تھی اور اپنے دقیق اسلوب اور علمی نکات کی وجہ سے درس میں شامل تھی۔ مصنف خود شافعی مسلک کے حامل تھے اس لیے تفسیر میں

بھی شافعی نقطۂ نظر نمایاں رہتا تھا۔ برصغیر کے سنی مسلمان عموماً حنفی المذہب تھے۔ اس لیے طلبہ کو اس کے مطالعے میں بڑی الجھنیں پیش آتی تھیں اس دقت ودشواری کو دور کرنے کے لیے قاضی صاحب نے حنفی مسلک کو سامنے رکھ کر یہ تفسیر لکھی۔ لیکن غالباً ضخیم ہونے کی وجہ سے نہ تو کبھی درس میں داخل کی گئی اور نہ طلبہ نے اس سے زیادہ استفادہ کیا۔ تاہم اپنی جگہ پر یہ ایک اچھی کوشش اور مفید کام ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو برصغیر کے مسلک حنفی کے ماننے والے سنی مسلمانوں کے لیے یہ گراں قدر تحفہ ہے۔

"فتح البیان فی مقاصد القرآن" نواب صدیق حسن قنوجی ثم بھوپالی کی تفسیر ہے۔ وہ خود اپنی اس تفسیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"درباب خود بے مثل وعدیم النظیر واقع شدہ است....
.... تفسیر قرآن چناں می باید"[۱]

لیکن یہ نواب صاحب کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ وہ خود اہلِ حدیث کے مسلک پر عامل تھے اس لیے ہر چیز کو اسی کی روشنی میں جانچتے اور اپنی ہر تحریر کو دوسروں پر فوقیت دیتے تھے

"فتح البیان فی مقاصد القرآن" میں بعض خوبیاں ضرور ہیں لیکن اس کو بے مثل وعدیم النظیر کہنا مبالغہ سے خالی نہیں۔

برصغیر میں جو تفاسیر عربی زبان میں لکھی گئیں ان میں سب سے آخری قابلِ ذکر تفسیر "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" ہے۔ یہ تفسیر مولانا ثناء اللہ امرتسری نے تحریر کی ہے۔ وہ بھی نواب صدیق حسن خاں صاحب کی طرح "اہلِ حدیث" کے مسلک پر کاربند تھے۔ لیکن انھوں نے تفسیر لکھنے میں ایک منفرد طریقہ اختیار کیا ہے۔ یعنی یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی آیتوں کی تفسیر

---

[۱] تاریخ التفسیر ص ۶۸

یکساں مفہوم والی آیتوں سے کریں۔ چنانچہ اس کام میں انھیں بڑی محنت کرنی پڑی لیکن ـــــ وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب رہے۔

یہ تو پورے قرآن کی تفسیریں تھیں۔ ان کے علاوہ بہت سی تفسیریں الگ الگ سورتوں کی لکھی گئیں لیکن ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کے نام گنانا بھی ممکن نہیں۔

فارسی تفاسیر

جب عالم اسلامی کے ایک بڑے حصہ میں فارسی زبان کا رواج بڑھا تو دینی علوم سے متعلق اس زبان میں بھی کتابیں لکھی گئیں لیکن چونکہ اس وقت لوگوں کے ذہنوں پر مسائلِ تصوّف کا غلبہ تھا اس لیے زیادہ تر تصانیف اخلاقیات اور تصوّف پر ہوئیں۔ فارسی زبان میں صرف چند تفسیریں برصغیر سے باہر لکھی گئیں اور چند برصغیر میں۔ ان میں سے بھی اس وقت صرف چند دستیاب ہیں

ماثر عالمگیری مصنفہ محمد ساقی مستعد خاں کے حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "اورنگ زیب کے دور حکومت میں" ملا صفی الدین اردبیلی نے شاہزادی زیب النساء کے حکم سے تفسیر کبیر کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا جو زیب التفاسیر کے نام سے مشہور ہے"[1]

قاضی محمد اعلیٰ تھانوی صاحب کشاف اصطلاحات الفنون کے چچازاد بھائی محمد مکرم خاں فاروقی نے بھی فارسی زبان میں ایک تفسیر لکھی تھی مگر چونکہ اس وقت برصغیر میں پریس قائم نہیں ہوئے تھے اس لیے اس کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی ایک آدھ قلمی نسخہ تھا وہ غالباً ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران تلف ہوگیا۔ مصنف کے اخلاف میں مولانا شیخ محمد محدث تھانوی تلمیذ شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی نے اپنی ایک کتاب "دافع وسواس فی اثر ابن عباس" میں اس تفسیر کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کی بہت تعریف کی ہے"

۱۔ ماثر عالمگیری (اردو) مصنفہ محمد ساقی مستعد خاں شائع کردہ بک لینڈ ۱۲ محمد بلڈنگ بندر روڈ کراچی (سال اشاعت دسمبر ۱۹۶۱ء) ص ۳۷۵۔

تفسیر فتح العزیز معروف بہ تفسیر عزیزی۔ یہ پارہ عم کی فارسی تفسیر ہے اور ماہ ذی الحجہ ۱۳۱۹ھ مطابق مارچ ۱۹۰۲ء میں طبع ہوئی تھی۔ مالک مطبع محمد عبدالاحد خاتمہ الطبع میں تحریر فرماتے ہیں:

"...... کتاب مستطاب تفسیر عزیزی مؤلف راس المحدثین سند المفسرین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث و مفسر دہلوی غفر اللہ لہ تفسیریست عجیب و کتابیست بس غریب کہ درایراد لطائف و نکات نظیرے نہ دارد۔"

فارسی کی ایک تفسیر کا ذکر مولانا عبدالصمد صارم صاحب نے تاریخ التفسیر میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"غرائب الرحمٰن: مصنفہ مفتی محمد سعید احمد مدراسی (بزبان فارسی) مطبوعہ ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء"[1]

قرآن کریم کی تفاسیر کا یہ وہ ذخیرہ ہے جو ہمارے اسلاف عربی اور فارسی زبانوں میں تحریر فرما کر ہمارے لیے فراہم کر گئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد گیارہ سو سے زیادہ ہے۔ اس ذخیرہ کو سامنے رکھ کر گزشتہ دو تین صدیوں میں ہمارے بعد کے علماء نے اردو زبان میں تفسیریں لکھیں جو اب ایک بڑے ذخیرہ کی شکل اختیار کر گیا ہے اور اس میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

---

[1] تاریخ التفسیر ص ۸۵۔

باب دوم

برصغیر پاک و ہند میں تبلیغ اور تعلیم دین کے سلسلہ میں صوفیہ اور علماء کا کردار

پس منظر

اردو زبان کی ابتداء اور اس کے ارتقاء کا مسئلہ ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ زبانوں کے کردار کا مذہب کے رشتہ سے کچھ ذکر کیا جائے۔ لسانی مطالعہ سنسکرت یا پراکرتوں کا ہو یا عربی کا یا لاطینی کا، اس کی بناء تفہیم دین ہے۔ مثلاً سنسکرت جو اپنے ویدک دور میں صرف ویدوں کی زبان تھی اور برہمنوں کی زبانی روایت سے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہی تھی اور عام بول چال کی زبانوں یا بولیوں یعنی "پراکرت کے بولنے والوں کے لیے" ناقابلِ فہم ہو گئی تو اس کی تفہیم کے لیے سنسکرت کے قواعد نویسوں کو اس کے صرف و نحو کی طرف توجہ کی ضرورت ہوئی۔ اسلام جب سرزمینِ عرب سے باہر پھیلا تو یہی ضرورت ایران اور ہندوستان میں ہوئی۔ بلکہ جن ممالک میں مسلمان پہنچے وہاں عربی کی تعلیم و تدریس مقامی زبانوں میں بھی دینی ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ دورِ جدید میں جب عیسائی مشنریوں نے برصغیر پاک و ہند میں عیسائیت کی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا تو انھوں نے بھی دیسی زبانوں اور بولیوں کا سہارا لیا۔ اور سلسلہ اب تک جاری ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی آمد کے وقت جو مقامی زبانیں اور بولیاں

موجود تھیں ان میں عربی فارسی اور ترکی کے عناصر کا اضافہ ہوا۔ آنے والوں کی زبان میں اکثریت فارسی بولنے والوں کی تھی اس لیے آگے چل کر فارسی ہی دفتری عدالتی اور تہذیبی زبان قرار پائی اور اس کی یہ حقیقت انیسویں صدی تک باقی رہی تاآنکہ اس کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ عربی دین اور علم کی زبان تھی اور عالم کے لفظ کا اطلاق عموماً عربی زبان کے عالم پر ہوتا تھا اور عربی کے نصاب میں علوم قرآنی کے علاوہ مسلمانوں کے جملہ علوم معقول و منقول کا درس شامل تھا لیکن عوام میں اکثریت کی زبان نہ فارسی تھی نہ ہی عربی۔ مسلمانوں نے ہر علاقہ کی زبان عوام کو صرف ایک نام سے یاد کیا اور وہ لفظ ہندوی اور "ہندی" ہے۔ یہ بولی خواہ قدیم پنجابی ہو یا دہلوی، گجراتی ہو یا دکنی، ان کی ابتدائی تصانیف میں کہیں یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مقامی الفاظ جو ایک علاقہ کی بولی کو دوسرے علاقے کی بولی سے مختلف بناتے ہیں وہ بہت محدود ہیں۔ مثلاً اگر دکنی کا جائزہ لیا جائے تو اس کا ایک لفظ "نکو" بمعنی "نہیں" ایسا ملتا ہے جس کا سراغ اور کسی بولی میں نہیں ملتا۔ صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین جو ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ آئے ان کا تعلق درباروں کے بجائے عوام سے تھا بلکہ حکمران تو سیاسی مصلحتوں کی بناء پر اسلام کی تبلیغ میں زیادہ مستعد نظر نہیں آتے اور اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ دہلی میں جو کم و بیش آٹھ سو سالوں تک مسلمانوں کے دورِ حکومت میں دارالخلافہ رہی۔ ان کی آبادی ۴۰ فیصد سے زیادہ نہ تھی۔ محض ایک غلط فہمی تھی کہ بعض حضرات نے اردو کو شاہی لشکر اور شاہی دربار سے وابستہ کر کے اسے محض درباری یا لشکری زبان بنا دیا ورنہ یہ تو ایک مدت تک درباروں میں باریاب نہ ہوئی تھی اور اس کا حلقہ صرف عوام کی بول چال اور صوفیائے کرام کی مجلسوں تک محدود تھا۔ چنانچہ اردو کا ابتدائی اور قدیم سرمایہ صوفیائے کرام اور مبلغین کے مختصر رسالوں، منظوم اور

نثری رسالوں سے شروع ہوتا ہے اور اس طرح شاعری اور نثر دونوں کی سرپرستی کا سہرا انہی بزرگوں کے سر ہے۔

بلاذری کی شہادت کے بموجب مسلمانوں کی سب سے پہلی مہم حضرت فاروق اعظم کے دورِ خلافت میں ۱۵ھ تھانہ (احاطہ بمبئی)، گئی اور وہاں سے سب لوگ صحیح سلامت واپس آ گئے۔ بلاذری کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"ہم سے علی بن محمد بن عبداللہ بن ابی سیف نے کہا۔ عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سنہ ۱۵ھ میں عثمان بن ابی العاص الثقفی کو البحرین و عمان کی ولایت پر مقرر کیا۔ وہ خود تو عمان آ گئے اور اپنے بھائی الحکم کو البحرین بھیجا۔"

عمان پہنچ کر انھوں نے ایک دریائی مہم تانہ (تھانہ) کی طرف بھیجی۔ جب یہ لوگ صحیح سلامت واپس آ گئے تو عمر (رضی اللہ عنہ) کو اس کی اطلاع دی انھوں نے لکھا۔ ثقیف کے بھائی تو نے کیڑے کو لکڑی پر چڑھایا۔ قسم ہے اگر وہ لوگ ضائع ہو جاتے تو میں تیری قوم سے اتنے ہی آدمی لے لیتا۔

"الحکم نے اپنے بھائی المغیرہ کو خلیج دیبل کی طرف روانہ کیا۔ اور خود بروص (بروچ) پر حملہ کیا۔ دشمن سے مقابلہ ہوا اور اس پر غالب ہوئے۔"[1]

دوسری مہم حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) کے دور میں بلوچستان اور سندھ کے مشرقی علاقہ کی طرف بھیجی گئی مگر وہ اس علاقہ کا صرف جائزہ لے کر واپس آ گئی۔ اس کے سردار حکیم بن جبلہ العبدی جب حضرت عثمان غنی رض کی

---

[1] فتوح البلدان جزو دوم (اردو ترجمہ) شائع کردہ سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ص ۱۷۶۔

خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے حضرت عثمانؓ کے استفسار پر نہایت دلچسپ انداز میں رپورٹ پیش کی۔

"(امیرالمومنین) پانی کم، پھل ردی، چور بے باک، لشکر کم ہو تو ضائع جائے گا۔ بہت ہو تو بھوکوں مرے گا۔"

حضرت عثمان نے یہ سن کر کہا "خبر دے رہے ہو یا سجع کہہ رہے ہو۔" بولے امیرالمومنین! خبر دے رہا ہوں۔ یہ سن کر انھوں نے لشکر کشی کا خیال ترک کر دیا۔[1]

پھر ۳۸ھ یا اوّل ۳۹ھ میں حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اجازت لے کر حارث بن مرۃ العبدی نے سرحدِ ہند پر حملہ کیا۔ فتحیاب ہوئے کثیر غنیمت ہاتھ آئی۔ صرف لونڈی غلام ہی اتنے تھے کہ ایک دن میں ایکہزار تقسیم کیے گئے۔[2]

اس کے بعد چوتھی مہم حضرت امیر معاویہؓ کے دورِ خلافت میں آئی اور ۴۴ھ میں المہلب بن ابی صفرہ نے اس سرحد پر حملہ کیا اور بنہ (بنوں) اور الاہواز تک جا پہنچے۔ یہ دونوں شہر ملتان اور کابل کے درمیان ہیں۔[3]

یہ سب معمولی جھڑپیں یا مہمات تھیں جن کے کوئی دور رس نتائج مرتب نہیں ہوئے۔ مسلمانوں کی اصل یلغار ولید بن عبدالملک کے زمانۂ خلافت میں محمد بن قاسم ثقفی کی زیرِ قیادت سندھ پر ہوئی جس کے نتیجہ میں بلوچستان اور سندھ کا علاقہ ملتان تک مسلمانوں کے زیرِ نگیں آگیا اور اس وقت سے برابر اسلامی پرچم کے زیرِ سایہ چلا آرہا ہے۔ فتح سندھ کے وقت جو مسلمان

---

1. فتوح البلدان جلد دوم (اردو ترجمہ) ص ۱۷۷۔
2. ایضاً۔ ص ۱۷۷
3. ایضاً ص ۱۷۸

برصغیر میں آئے وہ سب اسلام کے جذبے سے سرشار تھے۔ علوم شرعیہ پر ان کی پوری توجہ مرکوز تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد اس علاقہ میں علمی سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ چنانچہ شروع دور میں جو جہاز راں اور سیاح، جیسے بزرگ بن شہریار، اصطخری، ابن حوقل، مسعودی اور مقدسی بشاری اس علاقہ میں آئے۔ انھوں نے یہاں کی علمی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں مقدسی بشاری سندھ میں وارد ہوا۔ اس وقت زیریں سندھ کا دارالحکومت منصورہ تھا۔ مقدسی وہاں کے علماء اور کئی درس گاہوں کا نہایت شاندار الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ پر کیا کچھ نہیں لکھا گیا ہوگا۔ لیکن امتدادِ زمانہ سے وہ سب سرمایہ ضائع ہوگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب قرامطہ، خلیفہ بغداد کی فوج سے شکست کھا کر بلوچستان اور سندھ میں وارد ہوئے اور یہاں منصورہ اور ملتان کی مسلمان حکومتوں کو نیست و نابود کر چکے تو اپنے اقتدار کے قیام کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسلامی علوم کے تمام ذخیرہ دِین کو بھی ضائع کر دیا۔ اس کے بعد نہایت طویل عرصہ تک تمام علوم پر ایک جمود کی کیفیت طاری رہی۔ پھر جب ٹھٹھہ مرکز سلطنت بن کر ابھرا تو وہ علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔ وہاں بے شمار علماء و فضلا پیدا ہوئے جنھوں نے دینی علوم پر کافی لکھا۔ لیکن وہ زیادہ تر عربی اور فارسی میں تھا۔ اس وقت تک دہلی میں بھی اردو میں تصنیفی کام شروع نہیں ہوا تھا۔ ایسی صورت میں ان علاقوں میں اس کی کیا توقع کی جاسکتی تھی۔

گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں غزلوی خاندان کے فرماں رواؤں سبکتگین اور محمود غزنوی کے کئی حملوں کے بعد پنجاب مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ اور تقریباً ڈیڑھ صدی تک غزنوی خاندان اس علاقہ میں حکمراں رہا۔ جب غوری خاندان ابھرا اور علاؤالدین جہاں سوز نے غزنین پر قبضہ کر کے اس کو

نذرِ آتش کر دیا تو خاندانِ غزنویہ کا پایۂ تخت لاہور بن گیا اور یہاں علمی سرگرمیاں جاری رہیں۔ علماء اور شعراء کا یہاں کافی اجتماع تھا۔ ساتھ ہی حکمرانوں کی سرپرستی تھی۔ لیکن چونکہ یہ لوگ نسلاً عجمی تھے اس لیے ان کی زیادہ توجہ تصوّف، اخلاقیات، شعر و شاعری، فلسفہ وغیرہ کی جانب تھی۔ حکومت کے کام چلانے کے لیے فقہ کی طرف بھی رجحان تھا۔ ہیئت سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ ہیئت کی گرانقدر تصنیف قانون مسعودی غزنویوں ہی کی زیرِ سرپرستی لکھی گئی۔ تصوّف کی پہلی کتاب کشف المحجوب بھی اسی دور میں منصۂ شہود پر آئی۔ لیکن یہ سب کام عربی اور فارسی میں ہوا۔ اردو یا ہندی میں اگر کچھ تحریری کام ہوا بھی تو وہ شعر و شاعری کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔ اس میں بھی مسعود، سعد سلمان کے ہندی کلام کا صرف حوالہ ملتا ہے۔ کلام ناپید ہے۔

خواجہ مسعود سعد سلمان کے بارے میں ہمارے مایہ ناز محقق پروفیسر حافظ محمود شیرانی رقم طراز ہیں،

"لیکن یہ خواجہ مسعود سعد سلمان ہیں جن کے متعلق متقدمین و متاخرین متفقاً کہتے ہیں کہ وہ ہندی میں بھی صاحبِ دیوان تھے۔ مجھ کو ان کی ہندی شعر گوئی کے متعلق شبہ تھا۔ کیونکہ جہاں وہ اپنی فارسی و عربی زبان دانی پر اپنے قصائد میں فخر کرتے ہیں، وہاں ہندی کا ذکر نہیں کرتے۔ مثلاً

مرا بداں تو کہ در پارسی و در تازی
بہ نظم و نثر ندارد چو من کس استقلال

دوسرے موقع پر گویا ہیں:

کس ار بپارسی و تازی امتحاں زدمے
مرا بہ بارز میداں امتحاں شدمے

لیکن جہاں محمد عوفی کہتا ہے:

"و اورا سہ دیوان است۔ یکے بہ تازی و یکے بپارسی و یکے بہندی"

(لباب الالباب محمد عوفی ص ۲۴۶ جلد دوم)

عوفی کے ساتھ امیر خسرو بھی فرماتے ہیں:

"بیش ازیں از شاہان سخن کسے را سہ دیوان نبود مگر مرا کہ خسرو ممالک کلامم۔ مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست اماں آں سہ دیوان در عبارت عربی و فارسی و ہندوی است و پارسی مجرد کسے سخن را سہ قسم نہ کردہ جز من کہ دریں کار اقسام و عادلم"

(دیباچہ غرۃ الکمال ص ۶۹)

اس لیے ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ خواجہ ہندی میں شعر کہتے تھے۔

غزنویوں کا زوال شروع ہوا تو غوری خاندان کو عروج نصیب ہوا۔ پہلے اس خاندان نے غزنوی فرماں رواؤں کو پنجاب سے بے دخل کیا۔ پھر شہاب الدین غوری نے ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج کو شکست دے کر دہلی اور اجمیر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۱۹۴ء میں قنوج پر اور ۱۱۹۶ء میں بہار اور بنگال پر قبضہ ہوا۔ پھر سندھ، راجپوتانہ اور مالوے کی فتوحات مکمل ہوئیں اور ۱۲۳۶ء تک جو التمش کے دورِ حکومت کا آخری سال تھا۔ تقریباً تمام شمالی ہندوستان مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اس وسیع سلطنت کا دارالحکومت دہلی بنا۔ اسی نسبت سے ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک پورا دور سلطنت دہلی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس عرصہ میں علمی سرگرمیاں کافی رہیں مگر علمی زبان کا درجہ عربی کو اور دفتری زبان کا درجہ فارسی کو حاصل رہا۔ لہٰذا تحریری کام تمام تر عربی اور فارسی میں ہوا۔ البتہ روزمرہ کے کاموں میں مسلمانوں نے مقامی زبان کو اپنانا شروع کر دیا اور اس طرح غیر شعوری طور پر اردو زبان کا ہیولیٰ زیادہ تیزی سے تیار ہونے لگا۔

یہ مشترک زبان جس کو بعد میں ہندی، ہندوی یا اردو کا نام دیا گیا۔ اسی وقت سے معرضِ وجود میں آنی شروع ہو گئی تھی۔ جب پنجاب میں مسلمانوں کی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کو یہاں کے مقامی باشندوں سے میل جول اور لین دین میں ایک ایسی زبان کی سخت ضرورت تھی جس کو دونوں فریق سمجھ سکیں۔ اس مشترک زبان کی تشکیل کی۔ داستان ڈاکٹر محمد عزیز کی زبانِ قلم سے سنیے۔ وہ اپنی گراں قدر تالیف "اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ" میں تحریر کرتے ہیں۔

"اس مشترک زبان کی تشکیل میں مسلمان درویشوں اور صوفیوں نے بڑا حصہ لیا۔ وہ مسلمان تاجروں اور سپاہیوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور ان کی روحانی فتوحات کا دائرہ سلاطین کی ملکی فتوحات سے کم وسیع نہ تھا۔"[1]

جیسا کہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

"اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کے ملک کو غزنین اور غور کے بادشاہوں نے فتح کیا تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندوستان کی روح کو خانوادۂ چشت کے روحانی سلاطین نے فتح کیا۔"[2]

جہاں تک تصنیف و تالیف کا تعلق ہے، اس میں زمانہ کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کا پلّہ بھاری ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ کچھ مدت گزرنے کے بعد خالص دینی علوم کی کتابیں عربی میں لکھی جاتی رہیں۔ باقی علوم کے لیے عام طور پر فارسی زبان کو کام میں لایا جانے لگا۔ پھر دینی علوم میں بھی بیشتر توجہ فقہ پر مرکوز ہو گئی۔

۱۔ اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ" از ڈاکٹر محمد عزیز۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ص ۲۶

۲۔ نقوشِ سلیمانی از مولانا سید سلیمان ندوی۔ مطبع اعظم گڑھ، ص ۳۰

اس لیے کہ انتظامِ سلطنت اور عدالتی کاموں کے لیے فقہ کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس لیے اس کا سیکھنا ضروری تھا اور چونکہ اس کے لیے عربی زبان کو مخصوص کر لیا گیا تھا۔ اس لیے عربی کے قواعد بھی اسی زبان میں سکھائے جاتے تھے۔ منطق اور فلسفہ کے لیے بھی عربی زبان کو ترجیح دی جاتی تھی۔ دیگر علوم جن کے لیے فارسی کو مختص کر لیا گیا تھا ان میں زیادہ زور تاریخ اور تصوّف پر تھا۔ اور چونکہ تصوّف کا دامن اخلاقیات سے بندھا تھا اس لیے مصنفین کی توجہ اس طرف بھی بہت زیادہ تھی۔ پھر چونکہ دل کی انگیٹھی کو گرم رکھنے کے لیے شاعری کی ضرورت تھی۔ اس لیے فارسی شعراء کی بھی زیادہ توجہ مسائلِ تصوّف بیان کرنے پر مرکوز رہی۔ حضرت امیر خسرو کی مثنویوں میں سے بعض کا موضوع تاریخی واقعات ہیں۔ جیسے تغلق نامہ۔ اس کے علاوہ عصامی کی طویل مثنوی فتوح السلاطین بھی فی الحقیقت منظوم تاریخ ہے۔ چونکہ سوائے محمد تغلق کے تقریباً تمام حکمرانوں کا بھی رجحان تصوّف کی جانب تھا۔ لہٰذا فارسی میں بھی زیادہ کام تصوّف اور اس کے متعلقات میں ہوا۔ خالص دینی علوم یعنی تفسیر، علومِ تفسیر، حدیث اور اصولِ حدیث میں نہ عربی میں کوئی وقیع کام ہو سکا اور نہ فارسی میں۔ سلاطینِ شرقیہ کے زمانہ میں جونپور میں اس طرف توجہ ہوئی لیکن یہ دور بہت مختصر رہا۔ اس لیے یہ کام زیادہ نہ پھیل سکا۔

سلطنتِ دہلی کے بعد مغلیہ دور شروع ہوا تو بعض علماء کی توجہ حدیث و تفسیر کی جانب ہوئی۔ ان علماء میں سرِ فہرست نام شیخ عبد الحق محدث دہلوی کا ہے۔ پھر اورنگ زیب کے زمانہ میں حکمراں کی ذاتی توجہ سے اس میں زیادہ تیزی پیدا ہوئی اور متعدد علماء منظرِ عام پر آئے لیکن شاہ عبد الرحیم کا نام اور کام زیادہ نمایاں رہا۔ ان علماء نے مل کر فتاویٰ عالمگیری جیسی ضخیم کتاب مرتب کی۔ پھر اسی مغلیہ دور میں شاہ عبد الرحیم کے صاحبزادے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کی اولاد و احفاد نے نہایت منظم طریقہ پر دینی علوم کی اشاعت کی۔ شروع میں تو

ذریعہ تعلیم اور تصنیف و تالیف کا کام عربی اور فارسی میں ہوا۔ بعد میں اردو
زبان کو بھی کام میں لایا جانے لگا۔ آجکل برصغیر میں دینی علوم سے متعلق جو کچھ ہو رہا
ہے وہ زیادہ تر خانوادۂ ولی اللہی کا فیضان ہے۔

سلطنت دہلی کے زمانے میں شمالی ہندوستان میں اردو زبان میں کوئی تحریری
کام نہیں ہوا۔ صوفیا کے ملفوظات میں چند فقرے ملتے ہیں یا حضرت امیر خسرو کی اپنی
یا ان سے منسوب کچھ پہیلیاں، مکہ مکرنیاں، ڈھکوسلے اور انمل مشہور ہیں۔ ان کے
علاوہ خالق باری کو بھی ان ہی کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔ اگرچہ حافظ محمود شیرانی
نے اس کی تردید کی ہے۔[1] تاہم اگر ان سب کو امیر خسرو کا کلام تسلیم بھی کر لیا جائے
تب بھی ان میں سے کسی چیز پر دینی علم کا اطلاق نہیں ہوتا۔

صوفیا چونکہ انسان کے باطن سے سروکار رکھتے ہیں اور تزکیہ نفس ہی
ان کی سرگرمیوں کا مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے دروازے کافر و مومن
دونوں کے لیے یکساں طور پر کھلے رہتے ہیں۔ انسانی ہمدردی، خلوص اور محبت
ان کے اصلی جوہر ہیں اور یہی چیزیں ان کی روحانی فتوحات کی ضامن ہوتی ہیں۔
ہندوستان میں جو درویش آئے ان کا حلقۂ اثر بھی انہیں چیزوں کی وجہ سے روز
بروز زیادہ وسیع ہوتا گیا۔ ان کا سابقہ چونکہ بیشتر عوام سے تھا اس لیے دلوں کو
ہاتھ میں لینے کیلیے ہم زبانی ضروری تھی۔ چونکہ اپنے خیالات کی تلقین کے لیے وہ ملک
کے جس حصے میں پہنچے وہاں کی زبان اختیار کر لی اور عوام کو ان ہی کی زبان میں تعلیم
دی۔ لیکن چونکہ بعض مذہبی اصطلاحوں کا استعمال ناگزیر تھا۔ اور یہ عربی یا فارسی
میں ہوتی تھیں اس لیے عربی اور فارسی الفاظ بھی ان بولیوں میں قدرتی طور پر شامل
ہو گئے۔

1۔ "پنجاب میں اردو" از حافظ محمود شیرانی۔ مرتب ڈاکٹر وحید قریشی۔ ناشر کتاب نما
لاہور طبع چہارم ۱۹۷۳ء۔ ص ۱۴۸۔ ۱۶۱۔

اب تک اس مخلوط زبان کے جتنے قدیم فقرے ملے ہیں یا جو قدیم کتابیں
دستیاب ہوئی ہیں، خواہ دکھنی زبان میں ہوں یا گجراتی میں، سب حضرات صوفیاء
کے ملفوظات یا ان ہی کی تصنیفات ہیں۔

صوفیاء کی تعلیم کے موضوع اسلام اور اخلاقیات تھے۔ لہٰذا وہ جہاں گئے انھوں نے
عوام کو نہایت محبت اور نرمی کے ساتھ ان ہی دو چیزوں کی دعوت دی اور زندگی
بھر ان ہی کی اشاعت میں لگے رہے۔ ویسے تو تمام صوفیہ کا یہی طریقہ اور عمل رہا
لیکن بعض حضرات ان میں بہت نمایاں ہیں۔ حضرت داتا صاحب کی تو پوری
تعلیمات "کشف المحجوب" کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ
فارسی میں ہے لیکن اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہی تعلیمات جب وہ عوام
تک پہنچاتے ہوں گے تو وہ یقیناً اسی مخلوط زبان میں ہوتی ہونگی۔

"حضرت شیخ بہاء الدین ذکریا سہروردی ملتانی کے بارے میں سید
صباح الدین عبدالرحمٰن اپنی تالیف "تذکرہ اولیائے کرام" میں لکھتے ہیں:

"فرماتے ہیں کہ بندہ پر واجب ہے کہ سچائی اور اخلاص سے اللہ تعالیٰ
کی عبادت کرے اور اس کی عبادات و اذکار میں غیر اللہ کی نفی ہو
اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ احوال کو درست اور اقوال و افعال میں اپنے
نفس کا محاسبہ کرے۔ ضرورت کے سوا نہ کوئی بات کہے اور نہ کوئی
کام انجام دے۔ ہر قول و فعل سے پہلے اللہ تبارک و تعالیٰ سے التجا
کرے اور اس سے نیک عمل کی توفیق کی مدد چاہے۔"[1]

اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام لکھ کر بابائے اردو مولوی
عبدالحق نے ابتدائی اردو سے لے کر بھگتی تحریک کے زمانے تک کے بہت سے صوفیا کے

1۔ "تذکرہ اولیائے کرام" سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ ناشر ادبستان لاہور، طبع اول
دسمبر ۱۹۷۲ء۔ ص ۷۷۔

بعض اردو فقرے اور اشعار جمع کر دیے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے شیخ فریدالدین شکر گنج رح سے ابتدا کی ہے۔ ان کے سلسلہ میں بابائے اردو نے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب مادر مومناں نے مولانا برہان الدین بن شیخ جمال الدین ہانسوی کو حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے مولانا برہان الدین کو کافی نوازا۔ مادر مومناں نے مولانا برہان الدین کی صغرسنی کو دیکھتے ہوئے عرض کیا "خوجا بالا ہے۔" اس پر حضرت نے فرمایا کہ "پونوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے۔"

ان دو فقروں کے علاوہ بابائے اردو نے حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج کے کئی شعر بھی نقل کیے ہیں۔ ان میں ایک شعر یہ ہے:

اسا کری یہی سو ریت　　　　جاوں نا گے کہ جاوں میت

ایک نظم کا پہلا شعر ہے

تن دھوتے سے دل جو ہوتا پوک　　　　پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک

اس کے علاوہ اور بھی کئی نظمیں، ایک جھولنا اور ایک دوہرہ بھی بابا صاحب کا نقل کیا ہے۔ سب کا زیادہ تر یہی رنگ ہے۔ تاہم وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی نسبت بابا صاحب سے صحیح ہے۔

اس کے بعد بابائے اردو نے شیخ حمیدالدین ناگوری کے متعلق لکھا ہے کہ جب انھوں نے فقر و فاقہ سے تنگ آکر اپنے والد سے اپنے لیے فراخیٔ معاش کی دعا کرنے کو کہا تو انھوں نے جواب میں اردو کا یہ فقرہ کہا "ہاں بابا کچھ کچھ۔"

ایک واقعہ شیخ شرف الدین بوعلی قلندر اور امیر خسرو کا بیان کیا ہے۔ لکھا ہے کہ جب علاؤالدین نے امیر خسرو کو قلندر صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کی خدمت میں بھیجا۔ قلندر صاحب نے امیر خسرو کے گانے سے متاثر ہو کر انھیں اپنا کلام سنایا تو امیر خسرو آبدیدہ ہوئے۔ اس پر قلندر صاحب نے فرمایا "لڑکا کچھ سمجھ دار ہے۔"

بابائے اردو نے صاحب فرہنگ کے حوالے سے اس شعر کو بھی قلندر صاحب سے ہی نسبت دی ہے۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کو بھور کدھی نہ ہوئے

پھر شیخ سراج الدین عثمان کے سلسلہ میں خواجہ نصیرالدین چراغ دہلی کا یہ فقرہ نقل کیا ہے "تم اوپر وہ تل۔" اس کے بعد شرف الدین یحییٰ منیری کے ایک کج مندرہ نقل کیا ہے۔ بعدہٗ شاہ برہان الدین غریب کے ذکر میں بابا فریدالدین شکر گنج کی زاہدہ و عابدہ بی بی عائشہ کا یہ جملہ دہرایا ہے۔ "اے برہان الدین ساڈی دہیہ کہ کہیا نیدا ہے"؟ چونکہ بی بی عائشہ کا تعلق پنجاب سے تھا اس لیے اس فقرہ میں پنجابی اثر غالب ہے۔ کھینچ تان کر دو الفاظ اردو کے کہے جا سکتے ہیں "اے" اور "ہے۔"

سب سے زیادہ وقیع کام بابا گیسو دراز بندہ نواز کا ہے۔ وہ شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کے خلیفہ تھے اور دہلی سے گجرات ہوتے ہوئے دکن پہنچے تھے۔ وہاں انھوں نے گلبرگہ میں قیام کیا جو اس وقت بہمنی سلطنت کا صدر مقام تھا۔ وہیں فوت ہوئے اور وہیں مدفون ہیں۔ "معراج العاشقین" اگر واقعی ان کی تصنیف ہے تو اس کو اشاعت دین کے سلسلہ میں سب سے پہلی اردو نثر کی تحریر قرار دیا جانا چاہیے۔ بابائے اردو نے اس کا کچھ نمونہ "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ان کا ایک رسالہ "معراج العاشقین" میں مرتب کر کے شائع کر چکا ہوں۔ اس کا سنہ کتابت ۹۰۶ ہجری (مطابق ۱۵۰۰ء) ہے۔ اس کی زبان کا نمونہ یہ ہے اگرچہ بعض حضرات کو اس کو تسلیم کرنے میں تامل ہے۔

"اے عزیز! اللہ بندہ بنا یہاں پہچان کو حاتا۔ میں تو شرع جانا ہے

اول اپنی پہچانت بعد از خدا کی پہچانت کرنا۔ انسان کے پہچنے کوں
پانچ تن۔ ہر ایک تن کو پانچ دروازے ہیں۔ ہور پانچ دربان ہیں۔
پہلا تن واجب الوجود، مقام اس کا شیطانی۔ نفس اس کا امارہ
یعنی واجب کی انکھ سوں غیر نہ دیکھنا سو، حرص کے کان سوں غیر نہ
سننا سو، خوش رنگ سوں بدبوئی نا لینا سو۔ بغض کی زبان سوں
بدگوئی نہ کرنا سو، کنیا کی شہوت کوں غیر جاگا نہ خرچنا سو۔ پیر
طبیب کامل ہونا، نبض پہچان کر دوا دینا۔[1]

گویا دکنی اردو کا پہلا ادبی نمونہ ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمن فرماتے ہیں:

"حضرت سید گیسو دراز نے اپنی تعلیمات کو عام لوگوں کے سمجھانے
کے لیے بعض رسالے دکنی اردو میں بھی تصنیف کیے۔ ان میں سے ایک
رسالہ "معراج العاشقین" کو مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو نے
۱۳۴۲ھ، ۱۹۲۵ء میں اورنگ آباد سے شائع کیا تھا۔"[2]

غالباً باباکیسو دراز کے اثر سے ان کے سلسلہ کے کئی بزرگوں نے اردو نظم
میں دین کی اشاعت کی۔ بابائے اردو نے اس سلسلہ میں شمس العشاق شاہ
میراں جی، شاہ برہان الدین جانم، شاہ امین الدین اعلیٰ، امین الدین گنج العلم
اور سید میراں حسینی شاہ کے کسی قدر تفصیلی حالات اور کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔
اس کے بعد شمالی ہند اور گجرات کے بہت سے بزرگوں کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔
ان میں ترتیب وار شیخ احمد کھٹو، حضرت قطب عالم، حضرت شاہ عالم، حضرت

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ چھٹی جلد (اردو ادب اول)۔ پنجاب
یونیورسٹی، لاہور۔ ص ۹۴

۲۔ تذکرہ اولیائے کرام۔ ص ۲۸۸

سید محمد جونپوری، شیخ بہاء الدین باجن، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، حضرت شاہ محمد
غوث گوالیاری، شیخ علی متقی، شیخ رزق اللہ، شیخ وجیہ الدین احمد علوی، شیخ
بہاء الدین برناوی، سید شاہ ہاشم حسنی العلوی کے نام آتے ہیں۔ آخر میں بھگت کبیر
کی بعض خصوصیات بیان کر کے ان کے کچھ دوہے دیئے ہیں۔[1]

ان سب بزرگوں کے کلام کے نمونوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو ہر ایک
کی تحریر میں مقامی رنگ نمایاں طور پر نظر آئے گا

تاہم ان سب پر اردو زبان کا اطلاق ہو گا۔ کیونکہ زبان کے بعض بنیادی اجزا
سب کے یہاں مشترک ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک نمونہ اس زمانہ کی دہلوی زبان کا بھی ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر
ابواللیث صدیقی اپنی گرانقدر تصنیف "اقبال اور مسلک تصوف" میں تحریر فرماتے ہیں:

"سیر الاولیاء میں ہے کہ "حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیا نے
جب مولانا حسام الدین ملتانی کو خلافت عطا فرمائی تو شہادت
کی انگلی اٹھا کر دو مرتبہ فرمایا "دنیا ترک کرد دنیا ترک کرد"[2]

دکن میں بہمنی سلطنت اور گولکنڈے اور بیجاپور کی حکومتوں کے زمانہ میں
دفتری کام اور شعر و شاعری میں اردو زبان کو کافی عروج ملا اور بڑے پیمانہ پر
کام میں لایا جاتا رہا۔ لیکن دینی علوم کی طرف توجہ بہت کم ہوئی اور اگر کچھ کام
ہوا بھی تو اس میں تصوف کا اثر غالب رہا۔ چنانچہ ڈاکٹر حمید شطاری اپنی تصنیف
"قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک" میں بجا طور پر

۱۔ اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام (بابائے اردو مولوی عبدالحق)
مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔ پاکستان ۱۹۷۷ء

۲۔ اقبال اور مسلک تصوف۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، طبع اول ۱۹۷۷ء ص ۴۳۲

فرماتے ہیں:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے مقابلہ میں دین کے شرعی پہلو پر کم لکھا گیا ہے۔ چنانچہ تصوف کے مقابلہ میں تفسیر، حدیث اور فقہ پہ کام کم ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ صوفیا دنے اس کو اپنا موضوع مقدم بنالیا تھا۔ اور وہ عوام کو سمجھانے کے لیے عوامی زبان میں تصوف کے موضوع ہی پر لکھتے تھے۔"[1]

آگے چل کر شطاری صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"فقہ پر نثر میں جو رسائل دستیاب ہوئے ہیں ان کا سلسلہ بارہویں صدی ہجری سے ملتا ہے۔ البتہ قرآن کا ترجمہ کرنے اور تھوڑی بہت تفسیری وضاحتیں قلم بند کرنے کا رجحان دسویں صدی ہجری میں ہوگیا تھا اور علماء کا ایک مختصر گروہ ہر زمانے میں قرآن کا ترجمہ کرنے اور تفسیر لکھنے میں مصروف رہا۔ اس طرح یہ کام محدود پیمانہ پر ہی سہی لیکن مسلسل ہوتا رہا۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔"[2]

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تحقیق کے بموجب قدیم اردو تراجم میں سورہ یوسف کا گجراتی اردو میں ترجمہ سب سے قدیم ہے۔ جس کتاب کی بنیاد پر انھوں نے یہ انکشاف کیا ہے اس کو اول و آخر سے ناقص قرار دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ اس سے مصنف اور سنہ تصنیف کا پتہ چلانا غیر ممکن ہے۔ پھر یوسف زلیخا کی زبان سے مقابلہ کرکے یہ بتایا ہے کہ زیر ترجمہ [illegible] معلوم ہوتا ہے اور چونکہ یوسف زلیخا

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک بہ اعانت ایچ۔ ای۔ ایچ۔ دی نظامس اردو ٹرسٹ۔ حمایت نگر روڈ حیدرآباد دکن ستمبر ۱۹۸۲ء۔ ص ۴۱

۲۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (ڈاکٹر حمید شطاری) ۴۱

۹ھ/۱۶۹۷ء میں لکھی گئی اس لیے یہ ترجمہ دسویں صدی کے اواخر یا گیارہویں صدی کی اوائل کی تالیف ہے۔

لیکن یہ قیاس درست معلوم نہیں ہوتا۔ بابائے اردو ہی کی تحقیق کی بنیاد پر اس کو زیادہ سے زیادہ گیارہویں صدی ہجری یا سترہویں صدی کے وسط کی تصنیف قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ شطاری صاحب کی رائے میں "تفسیر کی نوعیت کچھ خاص نہیں ہے بجز اس کے کہ ترجمہ میں کہیں کہیں الفاظ اضافہ کردیے گئے ہیں۔"[1] شطاری صاحب کا فرمانا درست و بجا ہے۔ انھوں نے خود مثال میں "وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ" کا ترجمہ "کھڑی کریں فرض نماز کو اس کے وقت میں" کرکے لکھا ہے کہ ترجمے میں تفسیر کی خاطر "فرض" اور "اس کے وقت میں" کے الفاظ بڑھا دیے گئے ہیں۔ اس کا لفظی ترجمہ صرف اتنا ہے۔ "اور لوگ نماز قائم کرتے ہیں" چونکہ قائم کرنے میں اشارہ فرض نمازوں کی جانب ہے اور نماز کا وقت پر ادا کرنا بھی ضروری ہے تاکہ ہر شخص وقت کی پابندی کرکے جماعت میں شرکت کرسکے اور اِقَامِ الصَّلٰوةِ کی تکمیل ہوسکے۔ اس لیے صاحب ترجمہ نے تفسیری حاشیہ دینے کی بجائے ترجمہ ہی میں ان الفاظ کا اضافہ کردیا ہے۔

بہرحال ترجمہ اور تفسیر کے اس ابتدائی نمونہ کی دریافت سے یہ بات تو کسی قدر وثوق سے معلوم ہوگئی کہ اردو میں قرآن کریم کی تفسیر لکھے جانے کا آغاز گیارہویں صدی ہجری کے اختتام سے ہوا۔ لیکن اسے اچھا یا اطمینان بخش نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم آئندہ چل کر ترجمہ اور تفسیر کا جو کام اردو زبان [illegible] ہوا وہ اتنا وقیع ہے کہ اب ترجمہ کے معاملہ میں تو دنیا کی تمام زبانوں پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔ جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے صرف عربی زبان ایسی ہے جو اس کے مقابل

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (ڈاکٹر حمید شطاری) ص ۴۹

لائی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے عربی کا پلّہ بھاری رہے لیکن یقین ہے کہ یہ فرق نہایت
خفیف ہوگا۔ اردو زبان کو یہ فوقیت اس کی برصغیر کی تمام زبانوں میں سب سے
زیادہ مقبولیت کی وجہ سے ہے۔ برصغیر کی دوسری زبانوں کا تعلق محدود علاقوں
سے ہے جبکہ اردو زبان ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں سے تعلق رکھتی
ہے۔ اس لیے ہر طرح کے علمی و ادبی کام کی طرح اردو میں قرآن کریم کے ترجمے کرنے
اور تفسیریں لکھنے کا کام بھی دونوں ملکوں میں ہوتا رہا ہے۔ اور اب بھی ہو رہا
ہے۔ رہا برصغیر سے باہر ممالک کا معاملہ تو عرب ممالک کو چھوڑ کر دیگر ممالک میں
مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بہت کم ہے اس لیے وہاں کی زبانوں میں یہ
کام زیادہ بڑے پیمانہ پر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ معاشیات کا "طلب اور رسد"
کا قانون تو زندگی کے ہر شعبہ میں کارفرما ہے۔

سچ پوچھیے تو علوم اسلامی کی بنیاد قرآن حکیم پر رکھی گئی ہے اور چونکہ
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ قرآن کی عملی تفسیر تھی نیز احادیث
نبوی آپ کے احوال و افعال کا آئینہ ہیں۔ لہٰذا احادیث کو قرآن حکیم کی تفسیر کی
حیثیت حاصل ہے۔ اس وضاحت کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قرآن
حکیم اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم جملہ علوم اسلامی کا سرچشمہ ہیں اور
دیگر علوم یعنی صرف و نحو، بیان و بدیع، قرأت و تجوید اور لغت و معانی سب
ان ہی دونوں سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے اسلام اور اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کی
غرض سے ضروری ہوا کہ قرآن کی تفہیم اور احادیث نبوی کے مطالعہ پر سب سے
زیادہ زور دیا جائے۔ اور قرآن حکیم کے مفہوم کو براہ راست یا ترجمہ اور تفسیر
کے ذریعہ سمجھا جائے اور جن احادیث سے ان کی تفہیم میں مدد ملے ان کی پوری
چھان بین کر کے ان کی مدد سے یہ معلوم کیا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے قرآن حکیم کو امت کے سامنے کیسے پیش فرمایا ہے جب یہ بنیاد پختہ ہو جائے

تو پھر دوسرے علوم کی جانب اعتنا کیا جائے اور دیگر علوم کے اصولوں کو
ان ہی دو ماخذوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے یعنی یہ دیکھا جائے کہ
قرآن اور حدیث کا اس سلسلہ میں کیا موقف ہے۔ مثلاً علوم "صرف" کے ایک
معمولی سے اصول کو لے لیجیے۔ عربی میں ماضی مثبت سے ماضی منفی بنانے کے لیے
اس کے شروع میں "ما" کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے "فَعَلَ" سے "مَا فَعَلَ" اور
"ضَرَبَ" سے "مَا ضَرَبَ" اور مضارع مثبت کو مضارع منفی میں تبدیل کرنے
کے لیے "لا" کو کام میں لایا جاتا ہے۔ جیسے "یَفْعَلُ" سے "لَا یَفْعَلُ" اور
"یَضْرِبُ" سے "لَا یَضْرِبُ" لیکن کہیں کہیں کسی بات پر زور دینے کے لیے
ماضی مثبت کو ماضی منفی میں تبدیل کرنے کے لیے "لا" کبھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔
جس کی مثال قرآن حکیم میں موجود ہے۔ "فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی" یہاں دونوں
جگہ "مَا" کی جگہ "لا" کو کام میں لایا گیا ہے۔ اس لیے علم الصرف کا یہ اصول مستحکم
ہو گیا کہ بعض موقعوں پر ماضی مثبت کو ماضی منفی میں تبدیل کرنے کے لیے "مَا"
کی جگہ "لا" کا استعمال جائز ہے۔ یہی حال دوسرے علوم اسلامی کا ہے۔

چونکہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا اور احادیث نبوی بھی عربی زبان
میں ہیں اس لیے تمام دینی علوم کی ابتدائی کتابیں پہلے عربی میں لکھی گئیں پھر ضرورت
پڑنے پر فارسی اور دوسری زبانیں بھی کام میں لائی جانے لگیں۔ اور چونکہ آج کل
بھی کئی اسلامی ملکوں کی قومی زبان عربی اور بعض ملکوں کی قومی زبان فارسی ہے
اس لیے اب بھی اسلامی علوم کی کتابیں ان ہی دونوں زبانوں میں لکھی جا رہی ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ علوم اسلامی کا سب سے زیادہ سرمایہ عربی اور فارسی زبانوں میں
ہے۔ ان کے بعد اردو کا نمبر آتا ہے۔ یعنی عربی و فارسی کو چھوڑ کر دنیا کی تمام
زبانوں کے مقابلہ میں اردو میں اسلامی علوم کا ذخیرہ سب سے زیادہ ہے۔ بلکہ
بعض علوم میں تو اردو کو فارسی پر بھی برتری حاصل ہے۔ مثلاً قرآن حکیم کے جتنے ترجمے

اردو زبان میں ہوئے ہیں، فارسی تراجم کی تعداد ان کی چوتھائی سے بھی کم ہے۔
جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے چونکہ فارسی زبان میں یہ کام کافی عرصہ پہلے سے ہو رہا ہے اس لیے پچھلی صدی تک اردو کے مقابلہ میں فارسی میں تفسیری ادب زیادہ تھا۔ لیکن چودھویں صدی ہجری یا بیسویں صدی عیسوی میں اردو میں بہت کام ہوا ہے۔ اور دیگر اسلامی علوم کی طرح تفسیر میں بھی اس زبان میں اتنا سرمایہ جمع ہو گیا ہے کہ عربی کے بعد سب سے زیادہ سرمایہ اردو زبان ہی میں ہے۔

ویسے تو جزوی طور پر اردو میں قرآن حکیم کی تفسیریں گیارہویں صدی سے ہی بیان کی جانے لگی تھیں۔ لیکن شاعری کی طرح اردو میں مکمل تفسیریں لکھنے کا سلسلہ بھی محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے عہد سے دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ نصیرالدین ہاشمی نے اپنی مشہور تالیف "دکن میں اردو" میں لکھا ہے:

تفسیر سورۃ اِذَا جَاءَ: افسوس ہے کہ اس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا ڈاکٹر زور صاحب کی صراحت کے بموجب ۱۱۵۰ھ (مطابق ۱۷۳۷ء) کے قبل اس کی تصنیف ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو صراحت فرمائی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

> "رسالہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بجائے خود ایک کتاب ہے اور اس کا مصنف کوئی دکنی عالم ہے جس نے قرآن اور حدیث کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور جس کو لکھنے کی بھی اچھی مہارت حاصل ہے۔ مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا لیکن یہ رسالہ دکنی کتابوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ دکنی مفسروں نے قرآن شریف کی تفسیریں کس شرح و بسط کے ساتھ لکھی تھیں۔"
>
> (تذکرہ اردو مخطوطات نمبر ۲۲۶)

نمونہ عبارت:

"پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وصحبہ وسلم کے بھیجنے میں خدائے تعالیٰ کی یہ

حکمت تھی کہ مکارم اخلاق کو تمام کرنا اور خلائق کی ہدایت کرنا۔ جس وقت کہ یہ امور بوجہ احسن تمام ہوئے تو خدائے تعالیٰ نے اپنے رسول صلعم پر یہ آیت نازل کیا:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝

"جس وقت کہ یہ سورہ نازل ہوا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ سن کر روئے۔ حضرت صلی اللہ علیہ والہ وصحبہ وسلم نے پوچھا کہ اے عباس تم کس واسطے روئے ہو۔ حضرت عباسؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ اس کے نازل ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے تئیں دنیا سے سفر کرنے کا حکم ہوا ہے۔"

"اور جو شخص کہ سورت کے تئیں خواب میں پڑھا تو خدائے تعالیٰ اس کو دشمنوں پر فتح دے گا اور تمام مشکلات اس کے حل ہوئیں گے۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ یہ خواب دلالت کرتا ہے موت کے نزدیک ہوتے پر۔"[1]

جہاں تک ترجمہ قرآن کا تعلق ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے، شمالی ہند میں سب سے پہلا اردو ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے کیا تھا لیکن مولانا محمد عبداللہ چھپراوی نے "البیان التراجم القرآن" (مطبوعہ اردو پریس کلکتہ ۱۳۲۷ھ) نے حضرت مولانا فضل الرحمن مراد آبادی کا ایک قول نقل کیا ہے۔

"جس زمانے میں ہندوستان میں بھاشا زبان جاری تھی اس وقت

---

[1] دکن میں اردو۔ نصیرالدین ہاشمی۔ چوتھی بار۔ پاکستان (لاہور) ۱۹۵۲ء (مطابق ۱۳۷۲ھ) ص ۲۹۵-۲۹۶

بھاشا میں بھی قرآن شریف کا ترجمہ ہوا تھا۔ مولوی محمد علی صاحب
کانپوری حال مقامی مونگیر مولف رسالہ "ارشاد رحمانی و فضل
یزدانی" تذکرہ مولانا فضل الرحمن صاحب مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ
میں لکھتے ہیں کہ ایک روز عصر کے وقت کمترین کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ مولوی
عبدالقادر صاحب کے ترجمے سے دو سو برس پیشتر بھاکا میں بہت
عمدہ ترجمہ قرآن شریف کا ہوا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے۔"[1]

دیگر علوم اسلامی کو دکنی اور اردو زبان کے ذریعہ برصغیر میں پھیلانے کے
سلسلہ میں صوفیائے کرام نے جو کام انجام دیا ہے وہ بھی ان کا بڑا کارنامہ ہے چنانچہ
تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کے مقالہ نگار ڈاکٹر ایف۔ د۔ نسیم کا
یہ کہنا غلط نہیں:

"عربی اور فارسی کی بعض کتابوں کے دکنی نثر میں ترجمے اور شرحیں اور
مختلف رسائل نظم و نثر میں آیات و احادیث کے ترجمے اور تشریحیں
صوفیائے کرام کا ایک اور ایسا دینی اور لسانی کارنامہ ہے جو تاریخ
ادب اردو میں یاد رکھنے کے قابل ہے۔ صوفیہ نے اردو زبان کو اسکے
بچپن ہی میں اظہار کے لیے ایسے سانچے اور اسلوب مہیا کر دئے جو
اتنی تھوڑی سی عمر میں کسی زبان سے متوقع نہیں ہوتے۔ اس طرح
انھوں نے جہاں عربی اور فارسی نہ جاننے والے مسلمانوں اور غیر
مسلموں کے لیے عربی اور فارسی کتابوں میں موجود دینی، صوفیانہ
اور اخلاقی باتوں تک پہنچنا آسان کر دیا وہاں قرآن و حدیث کو بھی
ترجمہ کے آئینے میں دیکھنے کے قابل بنا دیا اور اس کے ساتھ ساتھ

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ چھٹی جلد (اردو ادب۔ اول) ص ۱۵۰

زبان قدیم کو بھی الفاظ و اسالیب اور معانی و مضامین کے لحاظ سے
مالا مال کر دیا۔"[1]

آخر میں یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ اردو زبان کو برصغیر پاک کی دوسری زبانوں پر
یہ فوقیت و برتری حاصل ہے کہ وہ عصر جدید میں روح اسلام کے اظہار کا اہم ترین ذریعہ
ہے۔ ہمارے اس ادعا کی تائید تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کے مقالہ نگار
خورشید احمد صاحب کے بیان سے ہوتی ہے۔ وہ اپنے بصیرت افروز مقالے "دینی ادب
دسویں صدی" میں لکھتے ہیں:

"اردو اگر ایک طرف برصغیر پاک و ہند کے لسانی اور ثقافتی ذخیرہ پر مسلمانوں
کے فکر اور ان کی تہذیب و تمدن کے عمل اور ردعمل کی پیداوار ہے تو دوسری طرف
یہ زبان اور اس کا ادب عصر جدید میں روح اسلام کے اظہار کا اہم ترین ذریعہ
ہے۔ عربی کے بعد اسلام کے دینی ادب کا سب سے بڑا خزانہ اسی زبان میں ہے۔
انیسویں صدی کے وسط سے مسلمانان پاکستان و ہند کے افکار و نظریات کا
اصل اظہار اردو ہی کے ذریعہ ہوا ہے۔ گو اس زمانہ میں فارسی اور انگریزی
کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ اول الذکر کو آہستہ آہستہ سرکاری
اور ثقافتی دائروں میں متروک ہونے والی زبان کی حیثیت سے
اور انگریزی کو نئی ابھرتی ہوئی لسانی قوت کے طور پر۔ لیکن اسلامی ذہن
کی حقیقی عکاسی اردو ادب ہی میں ہوئی ہے۔"[2]

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ چھٹی جلد (اردو ادب اول) ص ۱۵۰

۲۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ دسویں جلد (اردو ادب پنجم) ص ۲۶۱ ــ ۲۶۲

باب سوم

قرآن حکیم کے اردو تراجم اور ان کے حواشی

شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے دورِ حاضر تک حواشی کا جائزہ

چونکہ قرآن حکیم کے مخاطب اول عرب تھے اس لیے اس کا عربی زبان میں نازل ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ پھر چونکہ عربوں کو اپنی زبان دانی پر ناز تھا، وہ اپنے سوا سب کو عجمی یا گونگا قرار دیتے تھے۔ وہ اظہار خیال کے لیے نئے انداز اختیار کرتے اور فصاحت و بلاغت اور لفظی اور معنوی خوبیوں پر پورا زور دیتے تھے۔ اور اسی میدان میں ان کے مابین مقابلے ہوتے تھے۔ اور جو جتنا فصیح و بلیغ کلام پیش کرتا تھا اس کی اتنی ہی عزت ہوتی تھی۔ بلکہ اس خوبی کی بناء پر خاندانوں کی عزت بڑھ جاتی تھی۔ اس چیز کو اللہ تعالیٰ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ لہٰذا جب اس نے اس قوم کو مخاطب کیا تو اپنے کلام میں ان سب باتوں کو داخل کیا اور نہ صرف فصاحت و بلاغت اور لفظی و معنوی خوبیوں کو اپنے کلام کا طرۂ امتیاز بنایا بلکہ ابلاغ کے لیے وہ وہ طرز اختیار کیے کہ عرب بھی جن کو اپنی زبان دانی پر ناز تھا، دم بخود رہ گئے۔ جو لوگ اس کو خدا کا کلام ماننے کے لیے تیار نہیں تھے وہ بھی اس کے سامنے اپنے عجز کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ جب قرآن حکیم کا یہ چیلنج ان کے سامنے آیا۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ

مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ۔ (البقرہ ۲۳ تا ۲۴) ع ۳

(ترجمہ) اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے یہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ۔ اپنے سارے ہمنواؤں کو بلا لاؤ۔ اللہ کے سوا جس جس کی چاہو مدد لے لو۔ اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر (یعنی وہ بت جن کو تم پوجتے ہو) جو مہیا کی گئی ہیں منکرینِ حق کے لیے۔

اس وقت بھی انہوں نے اور باتیں بھی بنائیں مگر اس کے مقابلہ میں کوئی چیز پیش نہ کر سکے۔

بہرحال قرآن حکیم کی زبان عربوں کی تو مادری زبان تھی لہٰذا ان کو اس کے مطلب و معانی سمجھانے کے لیے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ البتہ بعض تفسیری نکات عہد رسالت ہی سے بتا دیے گئے تھے۔ جب اسلام عرب کی حدود سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پھیلا تو غیر قوموں نے بھی قرآن اور اسلام کو ان کی اصلی روح کے ساتھ سمجھنے کے لیے پوری لگن اور دلچسپی کے ساتھ عربی زبان سیکھی اور نہ صرف ان علاقوں میں جہاں اسلام پھیلا عربی کو سیکھنا ضروری سمجھا گیا۔ بلکہ بعض انصاف پسند یورپی مورخین کے بقول پانچ سو، چھ سو سال تک یورپ کے اکثر ممالک کی علمی زبان عربی رہی۔ اس لیے عرصۂ دراز تک کسی کو بھی قرآن حکیم کو براہِ راست عربی زبان سے سمجھنے میں چنداں دقت پیش نہیں آئی۔ ایسی صورت میں کسی دوسری زبان میں اس کا

ترجمہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ صرف ایک ترجمہ کا حوالہ ملتا ہے جو سندھ کے قدیم شہر الور کے راجہ کی فرمائش پر ۲۷۰ھ/۸۸۴ء میں مقامی زبان میں کیا گیا۔[1] لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ ترجمہ پورے قرآن کا تھا یا اس کے کسی جزو کا۔ اسکے تین سو سال بعد دوسرا ترجمہ پیٹرس طرابلسی نے ۵۷۵ھ/۱۱۴۳ء میں لاطینی زبان میں کیا۔[2] اس ترجمہ کے سو سال بعد ۶۷۷ھ/۱۲۷۹ء میں ایک ترجمہ بربری زبان میں کیا گیا۔[3]

یہ تین ترجمے قدیم ترین ہیں جن کا ابھی تک سراغ ملا ہے۔ ایک چوتھے ترجمے کے بارے میں جو فارسی زبان میں ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ شیخ سعدی نے کیا تھا لیکن سعدی سے اس کی نسبت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے کہ ان کے حالات میں کہیں بھی اس کا سراغ نہیں ملتا۔ لہٰذا اس چوتھے ترجمے کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب ہوا اور مترجم کون تھا۔

چونکہ پندرھویں صدی کے آغاز سے لاطینی زبان پورے یورپ کی علمی زبان بن گئی اس لیے وہاں رفتہ رفتہ سائنسی علوم کی طرح مذہبی علوم بھی تیزی سے لاطینی میں منتقل ہونے لگے۔ چنانچہ قرآن کریم کے بھی متعدد تراجم لاطینی زبان میں ہو لیے۔ ایک ترجمہ ۱۶۴۸ء میں ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈم سے شائع ہوا پھر ۱۶۹۸ء میں دوسرا ترجمہ فادر لیوس مراکشی نے اٹلی کے شہر پدوا سے شائع کیا۔ اسی صدی اور اس کے بعد والی صدیوں میں فرانسیسی، جرمن، انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی یہ کام بڑی تیزی سے ہونے لگا۔[4] لیکن اس سب کی تفصیل یہاں

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم (جمیل نقوی) ص ۳۷

[2] ایضاً ص ۳۷

[3] ایضاً ص ۳۷

[4] قرآن مجید کے اردو تراجم مع مختصر تاریخ القرآن و تراجم القرآن۔ تالیف جمیل نقوی۔ ناشر ادب نما ص ۳۸

بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جہاں تک کہ برصغیر کا تعلق ہے اس سلسلہ میں مختلف آرا پیش کی جاتی ہیں۔ اور بعض محققین تو نہایت مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے اردو تراجم مؤلفہ جمیل نقوی میں ایک روایت نقل کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

مولانا محمد عبداللہ چھپراوی نے "البیان التراجم القرآن" (مطبوعہ اردو پریس کلکتہ) ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب (گنج) مراد آبادی کا ایک قول نقل کیا ہے:

"جس زمانے میں ہندوستان میں بھاشا زبان جاری تھی اس وقت بھاشا میں بھی قرآن شریف کا ترجمہ ہوا تھا۔ مولوی محمد علی صاحب کانپوری حال مقامی مونگیر مؤلف رسالہ ارشاد رحمانی و فضل یزدانی تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ میں لکھتے ہیں کہ ایک روز عصر کے وقت کمترین کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ مولوی عبدالقادر صاحب کے ترجمہ سے دو سو برس پیشتر بھاشا میں بہت عمدہ ترجمہ قرآن شریف کا ہوا ہے۔"[1]

اسی کتاب یعنی قرآن مجید کے اردو تراجم میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے حوالہ سے یہ بھی مرقوم ہے:

"اردو زبان میں عام طور پر قرآن شریف کا ترجمہ مولانا رفیع الدین کا اور دوسرا شاہ عبدالقادر کا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں ترجمے تیرہویں صدی ہجری کے ہیں۔ لیکن اس بات کی بہت کم لوگوں

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم مع مختصر تاریخ القرآن و تراجم القرآن تالیف جمیل نقوی ناشر ادب نما۔ ص ۴۱

کو خبر ہے کہ اس زمانے میں نیز اس سے قبل ہندوستان کے مختلف مقامات میں متعدد تفسیریں اور ترجمہ لکھے گئے۔ ان میں زیادہ تر تفسیریں ہیں لیکن یہ برائے نام تفسیریں ہیں۔ درحقیقت قرآن کے لفظی ترجمے ہیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ لفظ یا ایک آدھ سطر صراحت کے لیے بڑھا دی گئی ہے ...... بالخصوص دسویں صدی ہجری کے ایک دکنی ترجمہ قرآن مجید کا بھی ذکر کیا ہے"[1]

لیکن ان میں سے اکثر تراجم یا تفسیریں جو بھی ہیں جزوی ہیں۔ مکمل ترجمہ ان میں کوئی نہیں۔

پہلے اقتباس میں مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے حوالہ سے بھاکا زبان کے جس ترجمہ کا ذکر کیا گیا وہ اگر شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے ترجمہ سے دو سو سال پہلے کا تھا تو گیارہویں صدی ہجری کے بالکل اوائل کا ہوا۔ اس لیے کہ شاہ صاحب کے ترجمہ کی تکمیل ۱۲۰۵ھ / ۱۷۸۲ء میں ہوئی تھی لیکن چونکہ حضرت مولانا گنج مرادآبادی کے قول سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی یہ ترجمہ مفقود تھا۔ لہٰذا اس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ جن ترجموں کا بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ذکر کیا ہے وہ ان ہی کے قول کے مطابق تفسیری ترجمے ہیں۔ لہٰذا ان کو تفسیری ادب میں شامل کرنا زیادہ مناسب ہے۔

پورے یقین و سے کے ساتھ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سرزمین میں سب سے پہلا اور مکمل ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بارہویں صدی ہجری کے وسط میں فارسی زبان میں کیا تھا جس کے بارے میں "حیات ولی" کے مصنف مولانا محمد رحیم بخش دہلوی رقم طراز ہیں:

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم مع مختصر تاریخ القرآن و تراجم القرآن۔ تالیف جمیل نقوی ناشر ادب نما ص ۴۲

"یہ قرآن مجید کا ایک نہایت مختصر ترجمہ ہے جو ایک عجیب دلچسپ پیرائے میں لکھا گیا ہے ...... بڑے بڑے معرکتہ الآرا مضامین اور نہایت اہم اور دقیق مطالب چند مختصر اور گنتی کے الفاظ میں اس خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ ادا کیے ہیں۔ انہیں ایسا صاف اور پانی کر دیا ہے جس سے نہ صرف تعجب بلکہ سخت حیرت ہوتی ہے"[1]

شاہ صاحب نے تصنیف و تالیف کا کام مکہ معظمہ سے ۱۱۴۵ھ / ۱۷۳۳ء میں واپس آنے کے بعد شروع کیا۔ اس سے پہلے آپ کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ خود آپ کا بیان ہے کہ "فارغ التحصیل ہونے کے بعد میں نے بارہ سال درس و تدریس میں صرف کیے۔ اس کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ علم نبوی کی تحصیل و تکمیل میں ترقی کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی حرمین محترمین کی زیارت کا بھی شوق دامنگیر ہوا چنانچہ میں نے سامانِ سفر مہیا کیا اور مکہ معظمہ کی جانب روانہ ہوگیا"

ان حقائق کے باوجود بعض قصہ گوؤں نے مولویوں کو بدنام کرنے کے لیے یہ داستان وضع کی کہ۔

"جب دہلی کے مولویوں کو جناب شاہ ولی اللہ صاحب سے رنجش بڑھ گئی۔ اور وہ آپ کے خون کے پیاسے ہو گئے تو آپ نے ان کی اس رنج و غصہ کی آگ کو فرو کر لے اور اس رنجش کو دبانے کی غرض سے سفر عرب اختیار کیا"[2]

حیات ولی کے مصنف مولانا محمد رحیم بخش دہلوی اس رنجش کا سبب ایک فاضل ہمعصر کے الفاظ میں یہ بتاتے ہیں:

---

[1] حیات ولی۔ مولانا محمد رحیم بخش دہلوی۔ ناشر المکتبۃ السلفیۃ لاہور ۱۹۵۵، ص ۵۸۵

[2] حیات ولی۔ از مولانا محمد رحیم بخش دہلوی۔ ص ۴۱۹

"ایک فاضل ہمعصر جناب شاہ صاحب کے سفر عرب کا یہ سبب بیان کرتے ہیں کہ جب شاہ صاحب نے فارسی میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور اس کی اشاعت ہوئی تو ایک تہلکہ عظیم کٹ ملاؤں کے گروہ میں برپا ہو گیا۔ اور یہ سمجھ گئے کہ ہماری روزی کی عمارت ڈھا دی گئی...... اس خیال نے ان کے دل میں ایک آگ بھڑکا دی۔ اور علاوہ کفر کے فتوے دینے کے شاہ ولی اللہ صاحب کی جان کے دشمن ہو گئے...... قصہ مختصر یہ کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے سفر عرب اختیار کیا اور منافقان اسلام کو دانت پیستا ہوا اور ہاتھ سے ہاتھ ملتے ہوئے چھوڑا۔"[1]

ظاہر ہے کہ جب سفر عرب سے پہلے قرآن شریف کا ترجمہ ہوا ہی نہیں تھا تو اس پوری داستان کی حیثیت افسانہ و افسوں سے زیادہ کچھ نہیں رہتی حقیقت یہ ہے کہ دیار عرب سے واپسی کے بعد مسلمانوں کی اکثریت کو مضامین قرآن سے آگاہ کرنے کے لیے شاہ صاحب نے ۱۱۵۰ھ ۳۸-۱۷۳۷ء میں فارسی زبان میں جو اس وقت عام طور پر سمجھی جاتی تھی قرآن شریف کا ترجمہ کیا۔[2] چونکہ یہ ایک نئی بات تھی اسلیے ممکن ہے بعض علماء کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ "اللہ کے کلام کو پوری روح کے ساتھ کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ناممکن ہے اس لیے فارسی کے اس ترجمہ کو پڑھنے والوں کے دلوں میں وہ اثر پیدا نہیں ہو گا جو ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ

---

1. حیات ولی از مولانا محمد رحیم بخش دہلوی۔ ص ۴۲۸ تا ۴۲۳

2. رود کوثر۔ شیخ محمد اکرام (اشاعت سوم ــ ۱۹۵۸ء) ناشر و طابع فیروز سنز، لاہور ص ۱۹ ۵۔

کہ جب انہیں فارسی میں ترجمہ مل جائے گا تو قرآن کے اصل متن کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ جائے گی"۔ اپنے اس خدشہ کو انہوں نے شاہ صاحب کے سامنے پیش کیا ہو مگر جب شاہ صاحب نے اپنا مدعا ان کے گوش گزار کر دیا ہو تو وہ خاموش ہو گئے ہوں۔

بہر حال شاہ ولی اللہ صاحب کے دیگر کارناموں میں سے قرآن شریف کا اس وقت کی مروجہ زبان فارسی میں ترجمہ بھی ایک بڑا کارنامہ ہے اور اس کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نمونہ اس کا یہ ہے۔ سورہ فاتحہ ★

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
بنام خدا بخشندہ مہربان

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ
ستائش خدا راست پروردگار عالمہا ۔ بخشایندۂ مہربان ۔ خداوند روز جزا
اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ
ترا می پرستیم واز تو مدد می طلبیم ، بنما ما را راہ راست
صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ
راہ آناں کہ انعام کردہ بر ایشاں بجز آنکہ خشم گرفتہ شد بر آنہا و بجز گمراہان

شاہ ولی اللہ کا یہ اقدام نہایت مبارک ثابت ہوا اور اس کے بعد قرآن حکیم کے ترجموں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو آج تک جاری ہے۔ لیکن چونکہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں جس میں شاہ صاحب پیدا ہوئے۔ پلے، بڑھے اور

★ قرآن مجید مع الترجمتین والتفسیر لعبد بن عباس قد طبع محمد ہاشم علی فی المطبع الہاشمی ۱۲۸۵ھ ترجمہ فارسی موسوم بفتح الرحمن ترجمۃ القرآن از تصنیفات صاحب الوجدان العرفان مقبول بارگاہ الہی مدعو بشیخ احمد مشہور بہ شاہ ولی اللہ و ترجمہ اردو دافتی الموضح القرآن

نوت ہوئے، اردو زبان نہایت تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ بلکہ یہ دور اردو شاعری کا عہد زریں کہلانے کا مستحق تھا۔ اس لیے اس صدی ہی میں قرآن کریم کے اردو زبان میں بھی ترجمے ہونے شروع ہو گئے۔ اس معاملہ میں بھی اولیت کا شرف ولی اللّٰہی خاندان ہی کو حاصل ہے۔ سب سے پہلا بامحاورہ اردو ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب کے فرزند شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے ۱۷۹۱ء/۱۲۰۶ھ میں کیا۔ اسی کے لگ بھگ شاہ صاحب کے دوسرے فرزند شاہ رفیع الدین نے ایک لفظی ترجمہ کیا۔ یہ دونوں ترجمے آج بھی نہایت مقبول ہیں اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ جیسا کہ مقدمہ میں بتایا جا چکا ہے۔ جمیل نقوی نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے حوالہ سے بتایا ہے کہ انہوں نے بھاکا زبان کا ایک ترجمہ دیکھا تھا جو شاہ عبدالقادر کے ترجمہ سے دو سو سال پہلے ہوا تھا۔ اسی طرح بابائے اردو کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے ترجموں سے قبل اردو میں بہت سے ترجمے لکھے گئے تھے لیکن چونکہ یہ ترجمے اب کہیں دکھائی نہیں دیتے اس لیے ان کی نوعیت کی وضاحت ممکن نہیں۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو زبان میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر صاحبان کے تراجم کو تقدم کا فخر حاصل ہے۔

اسی صدی میں ایک ترجمہ شاہ عالم ثانی کے حکم سے حکیم شریف خان نے کیا۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے اوائل میں ایک ترجمہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں کیا گیا۔ اس ترجمہ کا کام کاظم علی جوان، میر بہادر علی حسینی اور مولوی امانت اللہ نے مل کر شروع کیا تھا۔ بعد میں مولوی امانت اللہ کی جگہ حافظ غوث علی کو رکھ لیا گیا تھا۔ اسی کے لگ بھگ مولوی فضل اللہ کو بھی شریک کر لیا گیا۔ زبان کی اصلاح کا کام شروع سے کاظم علی جوان کے سپرد تھا۔ یہ ترجمہ ۹ رمضان المبارک ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء کو جمعرات کے دن مکمل ہوا۔[1]

۱ تاریخ شاہ عالم ضمیمہ نوشتہ مترجم ص ۲۵۳

شروع میں اردو زبان میں یہ چار ترجمے ہوئے۔ اس کے بعد جیسے جیسے اردو پھیلتی اور مقبولیت حاصل کرتی گئی۔ دیگر علوم کی طرح قرآن حکیم کے اردو تراجم کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن انیسویں صدی کے مقابلہ میں بیسویں صدی عیسوی میں یہ کام بہت تیزی سے ہوا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تعداد کے لحاظ سے اردو زبان کو دنیا کی تمام زبانوں میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ جمیل نقوی نے اس وقت تک کے اردو تراجم کی تعداد ۲۲۷ بتائی ہے۔[1] پروفیسر عبدالرؤف نوشہروی نے اپنی تالیف "اسلام مستقبل کا مذہب" میں ایک محقق کے حوالے سے اردو تفسیروں اور ترجموں کی تعداد: مکمل ۲۵ اور نامکمل ۳۶۶ بتائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ایک محقق نے ۱۹۲۹ء کے ایک مضمون میں صرف پاک و ہند میں چھپی ہوئی اردو تفسیروں اور ترجموں کی تعداد مکمل ۲۵ اور نامکمل ۳۶۶ بتائی ہے۔ خدا رحمت کنند ایں عاشقان پاک طینت را۔"[2]

اس کثیر تعداد میں سے اکثریت ان علماء کی ہے جن کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کا کہنا ہے کہ:

> "آسمانی صحیفوں کے ترجمے کی مخالفت تقریباً ہر ملک اور ہر قوم میں کی گئی ہے۔ اور یہ مخالفت ہمیشہ علمائے دین کی طرف سے ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے کو علوم دینیہ کا خاص ماہر اور اسرار الٰہی کا وارث خیال کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ یہ باتیں عام ہو جائیں۔ بعض اوقات اس لیے بھی مخالفت کی گئی کہ ترجمے اور تفسیریں ان کے

۱ قرآن مجید کے اردو مترجم ص ۸۰

۲ اسلام مستقبل کا مذہب اور دوسرے مضامین۔ پروفیسر عبدالرؤف نوشہروی ناشر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی طبع اول ۱۹۵۹ء ص ۹۷

منشاء کے خلاف تھیں۔[1]

چونکہ اہل یورپ پادریوں اور اپنے مذہبی پیشواؤں کے بارے میں ایسی باتیں کہتے تھے اس لیے ان کی تقلید میں انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں نے بھی اپنے علماء کے متعلق وہی باتیں دہرانی شروع کر دیں۔ لیکن یہ علماء پر سراسر اتہام ہے۔ انہوں نے کبھی بھی قرآن کے ترجمے کی مخالفت اس لیے نہیں کی کہ وہ اپنے کو علوم دینیہ کا خاص ماہر اور اسرار الٰہی کا وارث خیال کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ یہ باتیں عام ہو جائیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو شاہ عبد القادر صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب اس کام کی ابتدا کیوں کرتے۔ آخر یہ دونوں حضرات تو بھی عالم دین تھے اور اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جس نے برصغیر میں علوم دین کی روشنی پھیلائی۔ اور آج بھی اس سرزمین میں علوم شرعیہ کا جو چرچا ہے وہ اسی خانوادے کا فیضان ہے۔ اصل میں اگر کسی عالم نے قرآن کریم کے ترجمے کی مخالفت کی بھی ہوگی تو وہ اس خیال سے کہ کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ویسے ہی مشکل ہے۔ چہ جائیکہ قرآن حکیم کا ترجمہ جو اللہ کا کلام ہے اس کا ترجمہ تو انسان کے لیے ناممکن ہے۔ چنانچہ آج بھی اکثر علماء قرآن کے کسی ترجمہ کو ترجمہ نہیں مانتے بلکہ اس کو ترجمانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ان کا یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے۔

بہر حال اردو میں قرآن حکیم کے جو تراجم ہوئے ہیں ان میں بڑی رنگا رنگی اور بے حد تنوع ہے۔ بعض تحت اللفظ ہیں اور بعض بامحاورہ۔ بعض میں سادگی ہے اور بعض میں ادبیت کی چاشنی ہے۔ اکثر نثر میں ہیں لیکن کئی منظوم ترجمے ہوئے ہیں۔ اور اس معاملہ میں اردو زبان کو دوسری تمام زبانوں پر برتری اور

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک ص ۲۵

فوقیت حاصل ہے۔ ایک ترجمہ ایسا بھی ہوا ہے جو خالص دہلی کی مستورات کی زبان ہے۔

ذیل میں مکمل قرآن مجید کے چند تراجم کا کسی قدر تفصیلی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی وہ ترجمے شامل نہیں ہیں جو جامع تفاسیر کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔ جیسے تفہیم القرآن، بیان القرآن، معارف القرآن وغیرہ۔ البتہ اس باب میں صرف ان ترجموں کو لیا گیا ہے جن کے ساتھ مختصر تفسیری حواشی دیے گئے ہیں۔ چونکہ مقالہ کا اصل موضوع "اردو میں تفسیری ادب" ہے اس لیے ان ترجموں کا جو جامع تفاسیر کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ ذکر آئندہ باب میں ہوگا۔ آغاز شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی کے ترجمہ سے کیا جاتا ہے۔

(۱) شاہ رفیع الدین محدث دہلوی

آپ حضرت شاہ ولی اللہ کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ زیادہ وقت عبادات اور درس و تدریس میں صرف ہوتا تھا۔ اس لیے تصنیف و تالیف کی جانب کم توجہ دے سکے۔ چند تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ ان میں ترجمہ قرآن حکیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ اس وقت اردو زبان کے جو ترجمے موجود ہیں ان میں اس ترجمہ کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔ یہ ترجمہ ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۸ء میں کیا گیا تھا اور ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں پہلی بار کلکتہ اسلام پریس سے شائع ہوا تھا۔ یہ ترجمہ لفظی ہے تاہم قابل فہم ہے اور قرآن حکیم کے متن کے ساتھ کبھی تنہا اور کبھی کسی دوسرے ترجمہ کے ساتھ چھپتا رہتا ہے۔ نمونہ درج ذیل ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ (الفاتحہ ۶ تا ۷)

(ترجمہ) دکھا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان لوگوں کی کہ نعمت کی ہے تو نے اوپر

ان کے۔ سوا ان کے جو غصہ کیا گیا ہے اوپر ان کے اور نہ گمراہوں کی۔ [١]

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (سورۃ النباء ٦ تا ١١)

(ترجمہ) کیا نہیں کیا ہم نے زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں، اور پیدا کیا ہم نے جوڑے تم کو اور کیا ہم نے نیند تمہاری کو سبب آرام کا اور کیا ہم نے رات کو پردہ اور کیا ہم نے دن کو وقت معاش۔ [٢]

(٢) شاہ عبدالقادر محدث دہلوی — ١١٦٧ھ / ١٧٥٣ء تا ١٢٣٠ھ / ١٨١٥ء

حضرت شاہ صاحب بھی حضرت شاہ ولی اللہ کے لائق صاحبزادے تھے۔ عمر میں حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت شاہ رفیع الدین سے چھوٹے تھے۔ جب شاہ ولی اللہ کا انتقال ہوا اس وقت شاہ عبدالقادر صاحب کی عمر صرف ۹ سال تھی۔ لہٰذا آپ ان سے استفادہ علمی نہ کر سکے بلکہ جو کچھ حاصل کیا وہ اپنے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز سے کیا۔ فقہ، حدیث اور تفسیر میں بڑا نام پیدا کیا۔ علم کے ساتھ ساتھ زہد و تقویٰ میں بھی بلند درجہ پر فائز تھے طبیعت کا رجحان گوشہ نشینی کی جانب تھا اس لیے تحصیل علم کے بعد زندگی بھر اکبری مسجد میں قیام رہا اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا تصنیف و تالیف کی جانب زیادہ توجہ نہیں کر سکے۔ تاہم قرآن مجید کا اردو ترجمہ آپ کا

١ عکسی قرآن حکیم مع ترجمہ شاہ رفیع الدین دہلوی و مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور و کراچی (١٩٩٢ء) ص ٢

٢ عکسی قرآن الحکیم مع ترجمہ شاہ رفیع الدین دہلوی۔ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔ کراچی ص ١٠٢٩

عظیم کارنامہ ہے۔ یہ ترجمہ بامحاورہ ہے اور زبان و بیان کے لحاظ سے اتنا اچھا ہے کہ ہر زمانہ میں متداول و مقبول رہا۔ اور بڑے بڑے مترجمین بطور نمونہ اس کو استعمال کرتے رہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے بعض حصوں کی تفسیر بھی کی ہے۔ جو موضح القرآن کے نام سے مشہور اور قدر کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ لیکن یہ اتنی مختصر ہے کہ اس کو تفسیری حاشیہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ بطور نمونے کے لیے دو اقتباسات شامل ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ (الفاتحہ ١ تا ٧)

(ترجمہ) سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہان کا۔ بہت مہربان اور نہایت رحم والا۔ مالک انصاف کے دن کا۔ تجھی کو ہم بندگی کریں اور تجھی کو ہم مدد چاہیں۔ چلا ہم کو راہ سیدھی، راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل کیا۔ نہ وہ جن پر غصہ ہوا۔ اور نہ بہکنے والے۔ [١]

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝

(الفتح آیۃ ١ تا ٣)

(ترجمہ) ہم نے فیصلہ کر دیا تیرے واسطے صریح فیصلہ تا معاف کرے تجھ کو اللہ جو

١ عکسی قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر موضح القرآن از شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی۔ تاج کمپنی قرآن منزل، لاہور۔ ص ٢

آگے ہوئے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے۔ اور پورا کرے تجھ پر اپنا احسان اور چلاوے تجھ کو سیدھی راہ اور مدد کرے تجھ کو اللہ زبردست مدد۔

سورہ فاتحہ پر تفسیری حاشیہ یہ ہے۔ "یہ سورت اللہ صاحب نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ اس طرح کہا کریں۔"

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ کے شانِ نزول کے سلسلہ میں یہ حاشیہ دیا گیا ہے۔

"ہجرت سے چھ برس پر حضرتؐ نے خواب دیکھا کہ مکہ میں گئے ہیں۔ عمرے کو فراغت سے حلق کرتے ہیں۔ ارادہ کیا عمرے کا۔ اگرچہ قریش سے دشمنی تھی لیکن دستور تھا کہ دشمن کو بھی حج اور عمرے سے مانع نہ ہوتے تھے اور حرم میں بیر نہ لیتے۔ پندرہ سو آدمی کے ساتھ چلے۔ قریش نے لوگ جمع کیے۔ شہر سے باہر جا پڑے لڑنے کو۔ جب حضرتؐ پہنچے قریب جہاں سے مکہ نظر آیا۔ سواری کی اونٹنی بیٹھ گئی۔ ہرگز نہ اٹھی۔ جب حضرتؐ نے قسم کھائی کہ میں ادب کعبہ کا رکھوں گا اگرچہ یہ لوگ چڑھ چڑھ بولیں۔ تب اٹھی۔ حضرتؐ مقابلہ چھوڑ کر حدیبیہ کے میدان میں اترے۔ پیغام دیا کہ اگر چاہو مجھ سے صلح کر لو۔ ایک مدت دم لو اتنے ہم اوروں کو مسلمان کریں پھر چاہو گے مسلمان ہوجیو اور چاہو گے لڑیو۔ آخر صلح ہوئی لیکن اس برس عمرہ نہ کرنے دیا۔ اگلے سال قضا کیا۔ اس صلح کے بعد یہ سورت اتری۔"[1]

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۝ لِّیَغْفِرَ لَکَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ وَیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْکَ وَیَهْدِیَکَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ۝ وَّیَنْصُرَکَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِیْزًا ۝

(الفتح آیۃ ۱ تا ۳)

---

[1] عکسی "قرآن مجید" ص ۸۴۵ - ۸۴۶

(۳) فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا ترجمہ

یہ ترجمہ جان بارتھ وک گلکرسٹ کی نگرانی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے میر منشی میر بہادر علی حسینی اور منشی امانت اللہ شیدا نے ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء میں شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد مولوی فضل اللہ منشی بھی اس کام میں شریک ہو گئے۔ پھر جب مولوی امانت اللہ کسی نامعلوم وجہ سے سبکدوش ہوئے تو حافظ محمد غوث کا تقرر ان کی جگہ ہو گیا۔ ان سب نے مل کر یہ ترجمہ ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۴ء میں مکمل کیا۔ اس تمام عرصہ میں مرزا کاظم علی جوان ترجمہ کی زبان درست کرنے پر متعین رہے۔ چونکہ یہ سب حضرات ہی اردو نثر لکھنے پر پوری قدرت رکھتے تھے اس لیے اس زمانہ کے لحاظ سے ترجمہ کی زبان نہایت صاف، سادہ، سلیس اور بامحاورہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

الٓمّٓ ۝ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَۃِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(البقرہ آیۃ ۱ تا ۵)

(ترجمہ) یہ وہ کتاب ہے کہ اس میں کچھ شک نہیں۔ راہ دکھانے والی ان پرہیزگاروں کی ہے جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں اور نماز کیا کرتے ہیں۔ اور جو کچھ روزی ہم نے ان کو دی اس میں سے خیرات کرتے ہیں اور جو کچھ ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تجھے بھیجی گئی اور اس پر جو تجھ سے آگے نازل کی گئی۔ اور قیامت پر وے ہی یقین لاتے ہیں

دے اپنے پروردگار کے فضل سے سیدھی راہ پر ہیں اور وہ ہی مطلب کو پہنچیں گے۔"[1]

(۴) حکیم محمد شریف خاں دہلوی (ف ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء تا ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۵ء)

حکیم صاحب شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں دلی کے نامور طبیب تھے۔ ان کے والد حکیم محمد اکمل خاں بھی اپنے زمانہ کے نامی گرامی طبیب تھے لیکن حکیم محمد شریف خاں علم وفضل اور شہرت میں باپ سے سبقت لے گئے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں شاہی طبیب رہے۔ انہیں بادشاہ کی طرف سے اشرف الحکماء کا خطاب ملا تھا۔ ان کی کئی اعلیٰ پایہ کی تصانیف ہیں۔ شاہ عالم کے حکم سے انہوں نے قرآن حکیم کا ترجمہ کیا تھا۔ لیکن یہ ترجمہ کبھی شائع نہیں ہوا۔ اور مخطوط کی شکل میں حکیم محمد احمد خاں صاحب کے کتب خانہ میں موجود رہا۔ وہیں بابائے اردو نے اس کو دیکھا اور چونکہ حکیم محمد احمد خاں کے قول کے مطابق حکیم محمد شریف خاں کا سنہ وفات ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء قرار پاتا ہے۔ اس لیے بابائے اردو نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر سے پہلے لکھا گیا ہوگا۔ انہوں نے ترجمہ کو دیکھ کر یہ بھی کہا کہ اس ترجمہ کی زبان شاہ عبدالقادر مرحوم کے ترجمے کے مقابلے میں زیادہ صاف ہے۔ سورہ فاتحہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"جو تعریف کے اوّل سے آخر تک موجود ہے۔ لائق ہے واسطے اللہ کے کہ پالنے والا ہے تمام عالموں کا۔ بخشنے والا وجود کا آخرت میں، مہربان داخل کرنے بہشت کے ہے۔ مالک

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک (ڈاکٹر حمید شطاری) ص ۱۴۴

دن قیامت کے کا، تعریف کرتے والا اس دن جو چاہے گا کرے گا۔ خاص تجھی کو بندگی کرتے ہیں ہم اور خاص تجھی سے مدد مانگتے ہیں اور بندگی تیری کے ......"[1]

(۵) شمس العلماء مولوی نذیر احمد ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء تا ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء

نذیر احمد موضع "ریہڑ" ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے مولد و وطن میں حاصل کی۔ پھر ان کے والد مولوی سعادت علی نے دہلی لے جا کر اپنے ایک استاد عبدالخالق کی درس گاہ واقع اورنگ آبادی مسجد میں داخل کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد دلی کالج میں داخل ہو گئے۔ اس کالج میں نو برس تعلیم حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملازمت کر لی۔ مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد حیدرآباد دکن سے وظیفہ لے کر دہلی چلے آئے سرسید کی تحریک سے وابستہ ہو گئے اور علی گڑھ کالج کی خدمت کی۔ ساتھ ہی تصنیف وتالیف کا کام بھی جاری رکھا۔ قرآن حکیم کا بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا۔ جمیل نقوی کی تحقیق کے مطابق یہ ترجمہ پہلی بار ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۲ء میں مع حواشی شائع ہوا تھا۔ بار دوم ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۲ء مطبع انصاری۔ دہلی میں چھپا[2] لیکن ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب لکھتے ہیں کہ مولوی نذیر احمد نے ۱۹۰۲ء میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ مولوی نذیر احمد اردو زبان کے ایک صاحب طرز ادیب ہوئے اس لیے ان کا یہ ترجمہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ زبان کے اعتبار سے نہایت شگفتہ اور بامحاورہ ہے۔ لیکن چونکہ دیگر کتابوں کی طرح ترجمہ قرآن میں محاوروں کی

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر کا تنقیدی مطالعہ از ڈاکٹر سید حمید شطاری

۲۔ قرآن مجید کے اردو تراجم ص ۶۹

کثرت ہے۔ اس لیے بقول جمیل نقوی "علماء نے اس کی زبان کو ترجمہ قرآن زبان کے معیار نفاست سے گرا ہوا پایا اور اس پر تنقید کی۔[1] اس کے باوجود یہ ترجمہ کافی مقبول ہوا۔ اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

اس ترجمہ کے بارے میں " ادعیۃ القرآن" کے مؤلف اور مقدمہ نگار ڈاکٹر اسلم فرخی کی رائے پیش کر دینا مناسب ہوگا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

" ۱۹۰۲ء میں مولوی نذیر احمد نے قرآن مجید کا سلیس اور بامحاورہ زبان میں ترجمہ کیا۔ ان کے ترجمے سے پہلے شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ترجمے شائع ہو چکے تھے۔ یہ دونوں تراجم قرآن فہمی کے اعتبار سے عدیم النظیر ہیں۔ لیکن چونکہ ان دونوں بزرگوں کے عہد میں اردو نثر تشکیلی دور سے گزر رہی تھی۔ لہٰذا ان ترجموں میں زبان و بیان کا پیرایہ مشکل تھا۔ مولوی نذیر احمد کو عربی اور اردو دونوں پر یکساں کمال حاصل تھا۔ پھر یہ کہ ان کے عہد میں اردو نثر میں ہر قسم کے خیالات بخوبی ادا کرنے کی وسعت پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ ان کا ترجمہ حسن بیان توضیح و تشریح اور دلنشیں انداز سے مالامال نظر آتا ہے۔ اس ترجمے پر انہوں نے غیر معمولی محنت کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے اپنی سب کتابیں دوسروں کے لیے لکھی ہیں۔ لیکن یہ ترجمہ اپنے لیے کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی زبان و بیان کی سلاست اور سادگی کے اعتبار سے مولوی صاحب کا ترجمہ مثالی حیثیت رکھتا ہے۔"[2]

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم ص ۶۹

[2] ادعیۃ القرآن۔ ناشر ڈاکٹر محمد اسلم فرخی۔ مینیجنگ ٹرسٹی ڈپٹی نذیر احمد تعلیمی ٹرسٹ۔ کراچی، سال اشاعت ۱۹۸۷ء ص "ھ"

نمونے کے لیے قرآن حکیم کی ایک آیت اور اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا ص وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ سَیُجْزَوْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (الاعراف ۷، آیت ۱۸۰)

(ترجمہ) "اور اللہ کے (سب ہی) نام اچھے ہیں تو (لوگو) اس کے نام لے کر اس کو (جس نام سے چاہو) پکارو۔ اور جو لوگ اس کے ناموں میں کفر کرتے ہیں ان کو (ان ہی کے حال پر) چھوڑ دو۔ کوئی دن جاتا ہے کہ وہ اپنے کیے کا بدلہ پالیں گے۔"[1]

اس پر تفسیری حاشیہ دیا ہے۔ " ناموں میں کفر کے بہت پیرائے ہیں۔ ازاں جملہ جو بدنصیبی سے مسلمانوں میں بھی بکثرت شائع ہے۔ یہ کہ خدا کے سوا کسی اور کو ان صفتوں سے پکارا جائے جو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جیسے مشکل کشا، دستگیر، ان داتا، شہنشاہ وغیرہ اور شاید غریب پرور بھی۔

(۶) مولوی فتح محمد جالندھری (ولادت ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء)

ان کا مولد و وطن ٹانڈہ ضلع ہوشیارپور تھا۔ جالندھر میں سکونت اختیار کرلی تھی اس لیے جالندھری مشہور ہوئے۔ تکمیل علوم دین کے بعد تصنیف و تالیف کے جانب متوجہ ہوئے۔ علوم شرعیہ پر کئی کتابیں لکھیں لیکن ان کی شہرت مترجم قرآن کی حیثیت سے ہوئی۔ ان کا ترجمہ قرآن مجید بامحاورہ ہونے کے ساتھ ساتھ مستند اور معتبر سمجھا جاتا ہے۔ اور امت مسلمہ کے تمام فرقوں کے لیے قابلِ قبول ہے۔ زاہد ملک صاحب اپنی گرانقدر مرتبہ کتاب "مضامین قرآن حکیم" میں اس ترجمہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

[1] ادعیۃ القرآن ص ۲۵

"مولانا فتح محمد جالندھری کا ترجمہ "فتح الحمید" کے نام سے مشہور ہے اور سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں امرتسر میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں "نورِ ہدایت" کے نام سے جالندھر سے بھی شائع ہوا۔ پاکستان میں اس کی اشاعت کے حقوق تاج کمپنی کے پاس ہیں جس نے اس ترجمے کو بڑے خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔ ممکن ہے زبان اور محاورے کے تغیّر کے سبب مولانا فتح محمد جالندھری کے ترجمے میں بعض الفاظ اور ترکیبات موجودہ زمانے میں قدرے نامانوس محسوس ہوں اور اس طرح ترجمے کی روانی متاثر ہوتی نظر آئے۔ لیکن میں نے اس ترجمے کو ترجیح دو وجوہات سے دی ہے۔ پہلی یہ کہ یہ ترجمہ مستند اور معتبر ہے اور دوسری یہ کہ یہ ترجمہ اور اس کے مترجم مرنجان و مرنج مترجم امتِ مسلمہ کے تمام فرقوں اور طبقوں کے نزدیک ایک غیر متنازعہ شخصیت ہیں۔ مولانا فتح محمد جالندھری ایک شریف النفس انسان تھے۔ وہ ایک سیدھے سادے مسلمان تھے۔ جس طرح کہ ہم سب کو ہونا چاہیے۔ ان پر کوئی خاص چھاپ لگائی نہیں جا سکتی۔"[1]

نمونہ ملاحظہ ہو:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ (الفاتحہ ۱ تا ۷)

---

[1] مضامین قرآن مجید ـ زاہد ملک

(ترجمہ) سب طرح کی تعریف خدا ہی کو (سزاوار) ہے جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔ بڑا مہربان نہایت رحم والا۔ انصاف کے دن کا حاکم۔ (اے پروردگار) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہم کو سیدھے رستے چلا۔ ان لوگوں کے رستے جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا ہے۔ نہ ان کے جن پر غصے ہوتا رہا ہے۔ اور نہ گمراہوں کے۔[1]

ف ۲ پر تفسیری حاشیہ مندرجہ ذیل ہے۔

(حاشیہ) یہ سورت خدا نے بندوں کی زبان میں نازل فرمائی ہے مقصود اس بات کا سکھانا ہے کہ وہ اس طرح خدا سے دعا کیا کریں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سب سے افضل ذکر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور سب سے افضل دعا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الخ۔

(۷) مولانا احمد رضا خاں بریلوی (۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۵ء تا ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء)

مولانا احمد رضا خاں صاحب یوپی کے ایک بڑے شہر بریلی میں پیدا ہوئے۔ قدرت نے ذہن رسا عطا فرمایا تھا۔ لہٰذا تھوڑی عمر میں تکمیلِ علوم کر کے مسند رشد و ہدایت پر فائز ہو گئے۔ تصنیف و تالیف کا ملکہ بھی قدرتی تھا اس لیے مدت العمر قلم چلتا رہا۔ مختلف علوم میں بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔ شاعرانہ ذوق بھی نہایت ستھرا تھا لیکن زیادہ توجہ نعت گوئی کی جانب تھی۔ اس لیے بے شمار نعتیں لکھیں جو نہایت مقبول ہوئیں۔ ۱۳۳۰ھ میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ "کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن" اس کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۳۰ھ

---

[1] قرآن الحکیم مع ترجمہ فتح الحمید تاج کمپنی لمیٹڈ ص ۲

آمد ہوتے ہیں۔ یہ ترجمہ اردو کے اچھے تراجم میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر تو اس کے مطلب کو دوسرے ترجموں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ پہلی مرتبہ یہ ترجمہ مراد آباد مطبع نعیمی۔ اہلِ سنت سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد مکمل یا جزوی طور پر بارہا شائع ہو چکا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ
الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ
وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى
فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

(البقرہ ۲۷۴ - ۲۷۵)

(ترجمہ) وہ جو سود کھاتے ہیں قیامت کے دن نہ کھڑے ہوں گے مگر جیسے کھڑا ہوتا ہے وہ جسے آسیب نے چھو کر مخبوط بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا بیع بھی تو سود ہی کے مانند ہے۔ اور اللہ نے حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سود۔ تو جسے اس کے رب کے پاس سے نصیحت آئی اور وہ باز رہا تو اسے حلال ہے جو پہلے لے چکا اور اس کا کام خدا کے سپرد ہے" اور اب جو ایسی حرکت کرے گا تو وہ دوزخی ہے۔ وہ اس میں مدتوں رہیں گے۔"

ترجمہ کی جو عبارت ذاوین میں دی گئی ہے اس پر مفتی احمد یار خان نے تفسیری حاشیہ میں بتایا ہے کہ:

اگر سود کو حلال جان کر لیا تو کافر ہوا اور وہ دوزخ میں ہمیشہ رہے گا۔ اور اگر حرام جان کر لیا تو فاسق ہے بہت مدت دوزخ میں رہے گا۔[1]

۱۔ ترجمہ، کنزالایمان مع تفسیر نورالعرفان۔ ص ۶۴

(۸) شیخ الہند مولانا محمود الحسن (۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء تا ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء)

مولانا محمود الحسن کا جدی وطن دیوبند تھا۔ آپ کے والد بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے رفیق کار اور دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے مستقل رکن مولانا ذوالفقار علی تھے۔ مولانا محمود الحسن کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ آپ دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم اور بانی دارالعلوم مولانا قاسم نانوتوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ قاسمی علوم کا عالم اسلام میں سب سے زیادہ فیضان آپ کے ذریعہ پہنچا۔ آپ کے درس سے بے شمار طلبہ فیضیاب ہوئے۔ آپ کے ارشاد و تلقین نے بہت سے لوگوں کو راہِ ہدایت دکھائی۔ آپ نے اپنے جذبۂ جہاد کے ذریعہ امتِ مسلمہ کی جو خدمت انجام دی وہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گی۔ آپ کی تصانیف کی تعداد اگرچہ کم ہے لیکن جملہ تصانیف زر و جواہر میں تولنے کے قابل ہیں۔ ان ہی میں آپ کا ترجمہ قرآن کریم ہے۔ یہ ترجمہ مولانا نے لوگوں کے بے حد اصرار پر کیا ہے۔ پہلے تو اکثر مستند تراجم کا مطالعہ کیا پھر اس مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ تحت اللفظ اور بامحاورہ ترجموں میں عوام کے لیے بامحاورہ ترجمہ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ خود فرماتے: "ہر چند ترجمہ تحت لفظی میں بعض خاص فائدے ہیں مگر ترجمہ سے جو اصلی فائدہ اور بڑی غرض ہے وہ یہ کہ ہندوستانیوں کا سمجھنا آسان ہو جائے۔ یہ غرض جس قدر بامحاورہ ترجمہ سے حاصل ہو سکتی ہے تحت لفظی ترجمہ سے کسی طرح ممکن نہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ جو بامحاورہ ترجمہ کے بانی اور امام ہیں انہوں نے بامحاورہ ترجمہ کو اختیار فرمانے کی یہی وجہ بیان کی ہے"[1]

۱۔ مقدمہ ترجمہ قرآن مجید۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن۔ دارالتصنیف لمیٹڈ شاہراہ لیاقت۔ صدر کراچی۔ ص ۱

یہ فیصلہ کرنے کے بعد مولانا نے بامحاورہ ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا اور حضرت شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کو معیار بنا کر اس کی روشنی میں ترجمہ کیا۔ لیکن حضرت شاہ صاحب کے زمانہ کے جو الفاظ متروک ہو چکے تھے ان کی جگہ الفاظ مستعملہ لے لیے اور جہاں حضرت شاہ صاحب نے اختصار و اجمال سے کام لیا تھا وہاں کسی قدر صراحت فرما دی۔ اس طرح ترجمہ نہایت عام فہم ہو گیا۔ اور نہ صرف مولانا کے زمانہ میں پسند کیا گیا بلکہ آج بھی مقبول عام ہے۔ مولانا محمود الحسن صاحب کا یہ ترجمہ پہلی بار ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں مدینہ پریس بجنور سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد متعدد ایڈیشن نکلے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر" دار التصنیف لمیٹڈ۔ شاہراہ لیاقت۔ صدر کراچی کا شائع کیا ہوا نسخہ ہے۔ جو بڑے اہتمام اور احتیاط سے شائع کیا گیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۚ (البقرہ ۲۷۴)

(ترجمہ) جو لوگ کھاتے ہیں سود، نہیں اٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اٹھتا ہے وہ شخص کہ جس کے حواس کھو دیے ہوں جن نے لپٹ کر۔ یہ حالت ان کی اس واسطے ہو گی کہ انھوں نے کہا کہ سوداگری بھی تو ایسی ہی ہے جیسے سود لینا حالانکہ اللہ نے حلال کیا ہے سوداگری کو اور حرام کیا ہے سود کو۔[1]

[1] بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ مترجم، ناشر دار التصنیف لمیٹڈ شاہراہ لیاقت۔ صدر کراچی ص ۵۹

ف ۲۔ اس پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے حسب ذیل تفسیری حاشیہ دیا ہے۔

"یعنی ربو کھانے والے قیامت کو قبروں سے اٹھیں گے جیسے آسیب زدہ و مجنون۔ اور یہ حالت اس واسطے ہو گی کہ انھوں نے حلال و حرام کو یکساں کر دیا ہے۔ اور صرف اس وجہ سے کہ دونوں میں نفع مقصود ہوتا ہے دونوں کو حلال کیا۔ حالانکہ بیع اور ربو میں بڑا فرق ہے کہ بیع کو حق تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام (فائدہ) بیع میں جو نفع ہوتا ہے وہ مال کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ جیسے کسی نے ایک درہم کی قیمت کا کپڑا دو درہم کو فروخت کیا، اور سود وہ ہوتا ہے جس میں نفع بلا عوض ہوتا ہے۔ جیسے ایک درہم خرید لیا ہے۔ وغیرہ"

(۹) مولانا اشرف علی تھانوی ($\frac{\text{۱۲۸۰ھ}}{\text{۱۸۶۳ء}}$ تا $\frac{\text{۱۳۶۲ھ}}{\text{۱۹۴۳ء}}$)

قصبہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے مشہور فاروقی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۰۱ھ میں فارغ التحصیل ہوئے اور اپنے والد اور اساتذہ سے اجازت لے کر اسی سال بعہدۂ صدر مدرسی مدرسہ فیض عام کانپور چلے گئے کچھ عرصہ اس میں کام کیا لیکن اراکین مدرسہ سے اختلاف کی وجہ سے مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد ایک نئے قائم شدہ مدرسہ جامع العلوم میں صدر مدرس مقرر کیے گئے۔ اس طرح چودہ سال کانپور میں گزار کر $\frac{\text{۱۳۱۵ھ}}{\text{۱۸۹۷ء}}$ میں اپنے مرشد حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے حکم سے ملازمت ترک کر کے وطن واپس آ گئے اور باقی زندگی خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں قیام فرما کر رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ ملت مسلمہ ہند کو فیض پہنچاتے رہے۔ آپ مسلمانوں کی پوری تاریخ کے کثیر التصانیف بزرگوں میں سے تھے۔ اپنی تصانیف کے ذریعہ دینی علوم کو گھر گھر پہنچا دیا۔ مردوں،

عورتوں، بوڑھوں اور بچوں سب نے فیض حاصل کیا اور اب بھی یہ فیض پاکستان اور ہندوستان میں جاری ہے۔ آپ کا ترجمہ قرآن مجید بھی بہت مقبول ہوا۔ اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ لفظی نہ ہونے کے باوجود نہایت مختصر ہے۔ زبان نہایت صاف، شستہ اور رواں ہے۔ جہاں کہیں جملوں میں ربط پیدا کرنے کے لیے کوئی زائد لفظ استعمال کیا ہے اس کو قوسین میں لکھ دیا ہے۔ اس طرح نہ قرآن کی عبارت سے تجاوز ہوتا ہے اور نہ قارئین کو قرآن فہمی میں کوئی دقت پیش آتی ہے۔ عام تلاوت کے لیے "بیان القرآن" سے علیٰحدہ جو متن شائع کیا جاتا ہے اس کے ساتھ مختصر تفسیری حواشی دے دیے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے کم استعداد لوگوں کو بھی قرآن کریم کے منشاء و مفہوم کو سمجھنے میں کافی سہولت ہو جاتی ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نے بھی اس ترجمہ کی تعریف کی ہے۔ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے یہ ترجمہ برصغیر میں بے حد مقبول ہوا۔ اور اب تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا
وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ
فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ٥

(بنی اسرائیل ۲ تا ۴)

(ترجمہ) اے ان لوگوں کی نسل جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ سوار کیا تھا۔ وہ نوح بڑے شکر گزار بندہ تھے۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یہ بات بطور پیشین گوئی بتلا دی تھی کہ تم سرزمین شام میں دو بار خرابی کرو گے۔ ف ۵ اور بڑا زور چلانے لگو گے ف ۶۔

(حاشیہ) ف ۵۔ ایک بار شریعت موسوی کی مخالفت۔ دوسری بار شریعت عیسوی کی مخالفت۔
ف ۶۔ یعنی زیادتیاں کرو گے۔ پس لَتُفْسِدُنَّ میں حقوق اللہ کے اور لَتَعْلُنَّ میں حقوق العباد کے ضائع کرنے کی طرف اشارہ ہے[1]

(۱۰) مولانا احمد علی لاہوری (متوفی ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء)

مولانا احمد علی لاہوری عالم دین، مفسر قرآن اور عالم باعمل تھے۔ وہ ملت مسلمہ کے اس دور انحطاط میں سلف صالحین کا ایک اچھا نمونہ اور سادگی کا پیکر تھے۔ انہوں نے کافی عرصہ تک مولانا عبیداللہ سندھی کے درس قرآن میں شرکت کی اور وہاں سے علم آیات و سور کے باہم ربط و تعلق کا دقیق اور نازک علم سیکھا اور اس علم میں اتنی مہارت حاصل کی کہ کچھ عرصہ بعد فیض پہنچانے لگے۔ ۱۳۴۰ھ میں انجمن خدام الدین کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا احمد علی اس کے امیر مقرر ہوئے۔ ان کے بقول انجمن کا مقصد اشاعت کتاب و سنت رہا ہے اور اشاعت کے کئی شعبے تھے۔

(۱) درس عام جو ہر روز صبح کو ہوتا تھا۔
(۲) نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کا درس جو ہر روز بعد از نماز مغرب ہوتا تھا۔
(۳) فارغ التحصیل علماء کو قرآن حکیم کی تفسیر ایک خاص انداز سے پڑھائی جاتی تھی۔
(۴) دورۂ تفسیر رمضان، شوال اور ذی قعدہ کے تین مہینوں میں ختم کیا جاتا تھا۔

---

1. علمی قرآن الحکیم (تاج کمپنی) ۱۹۵۲ء۔ ص ۳۱۷

اس نظام کے تحت مولانا احمد علی عرصہ دراز تک نہایت باقاعدگی سے خلق خدا کو فیض پہنچاتے رہے اور دور دراز سے آکر تشنگانِ علم آپ کے درس میں شریک ہوتے تھے اور علوم قرآنی کی بے بہا دولت سمیٹ کر اپنے گھروں کو واپس ہوتے تھے۔

انجمن خدام الدین نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ مولانا احمد علی نے جو اہم مضامین اپنے درسوں میں بیان کیے کتابی شکل میں یکجا کر کے اس کی اشاعت عام کی جائے۔ انہوں نے کلام پاک کے مضامین کو حسب ذیل طریقہ پر مرتب کیا:

(۱) ہر سورۃ کا عنوان

(۲) ہر رکوع کا خلاصہ

(۳) اس خلاصہ کا ماخذ

(۴) ہر سورہ کی تمام آیات کا ربط

(۵) مناسب موقعوں پر واقعات جزئیہ سے قواعد کلیہ کا استنباط

ترتیب دینے کے بعد مولانا نے یہ مسودہ ہندوستان بھر کے چوٹی کے علماء کے سامنے پیش کیا تاکہ وہ اسے کتاب و سنت کی روشنی میں جانچ کر دیکھیں کہ کوئی چیز خلافِ مسلکِ اسلام تو نہیں۔ ان علماء میں مولانا انور شاہ صاحب کشمیری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا سید سلیمان ندوی جیسے جید علماء کے اسماء گرامی بھی شامل ہیں۔ ان سب علماء نے قرآن حکیم کے مطالب و مضامین کی اس نظم و ترتیب کو بے حد پسند کیا۔ اور نہایت اچھی تقریظیں لکھ کر بھیجیں۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد قرآن کریم کو شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے ترجمہ کے ساتھ چھاپنے کا اہتمام کیا گیا۔ اور مولانا احمد علی کے مرتبہ مطالب و مضامین اور فوائد موضح القرآن کو حاشیہ میں رکھا گیا۔ کلام مجید کے اس نسخے کی اشاعت اوّل ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء

میں ہوئی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ چھپا اس کی ترتیب یہ رکھی گئی۔

(۱) علما کی تقاریظ

(۲) فہرست مضامین قرآنیہ

(۳) قصص القرآن

(۴) حقوق العباد

(۵) قرآن کا متن، ترجمہ

حاشیہ موضح القرآن، خود مولانا احمد علی کے حواشی اور ربط آیات اور آخر میں لقایا حواشی موضح القرآن۔[1]

قرآن کریم کے اس نسخے کو ہر طرح مفید اور قابل فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یقین ہے کہ اس نسخے کو بغور مطالعہ کرنے سے عوام بھی بغیر کسی کی مدد کے قرآن حکیم کی تعلیمات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

چونکہ ترجمہ اور بیشتر حواشی شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے دیے گئے ہیں اس لیے ان کے نمونے دینے کی ضرورت نہیں۔ اس کی جگہ ایک صفحہ پر درج آیات کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک نئی چیز بھی ہے اور بے حد مفید بھی ملاحظہ ہو۔ سورۃ احزاب پارہ وَمَنْ يَّقْنُتْ کی آیات ۳۱ تا ۳۴ میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ " (۳۱) اگر تم نیکی کرو گی تو اس کا اجر بھی تمہیں دگنا ملے گا۔ (۳۲) اے ازواج مطہرات تمہارا درجہ دوسری عورتوں کا سا نہیں ہے۔ اگر کوئی حجاب کے اندر سے بھی بات پوچھے تو ذرا درشتی سے بات کرو تاکہ کسی کے دل میں وسواس شیطانی نہ آنے پائے (۳۳) اطمینان سے گھر میں بیٹھی رہو۔ زمانہ جاہلیت کی طرح باہر مت پھرا کرو اور یاد الٰہی میں مصروف

---

۱ ترجمۃ القرآن کریم مع مترجم و محشی ۱۳۵۳ھ (ایک مندوبی گزارش) ص ۱

رہو۔ (۳۴) قرآن حکیم کی تلاوت گھروں میں بیٹھ کر کیا کرو۔[1]

(۱۱) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء — ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی عصرِ حاضر کے بلند پایہ مفکر تھے۔

ان کا وطن دہلی تھا اور مولد اورنگ آباد دکن جہاں وہ ۲۵ دسمبر ۱۹۰۳ء کو پیدا ہوئے۔ دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ مولانا عبدالسلام نیازی سے فیض حاصل کیا۔ خداداد ذہانت کی بدولت بہت تھوڑی عمر میں مختلف علوم میں تبحر حاصل کر لیا۔ ان کی قابلیت و صلاحیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ۱۵ سال کی عمر میں صحافت کا آغاز کیا مختلف اخبارات سے وابستہ رہے۔ ان میں مدینہ بجنور، تاج جبلپور، ہمدرد اور الجمعیۃ دہلی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ کچھ دن بھوپال میں رہ کر نیاز فتحپوری کے ساتھ بھی کام کیا۔ پھر حیدر آباد دکن سے ترجمان القرآن جاری کیا۔ جس کو کچھ عرصہ بعد علامہ اقبال کے مشورہ سے پنجاب لے آئے اور پنجاب میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۱ء میں لاہور میں جماعت اسلامی کی تشکیل کی اور ۱۹۴۲ء میں اس کا مرکز لاہور سے پٹھان کوٹ منتقل کیا گیا۔ جماعت اسلامی کا اثر بہت جلد ملک کے طول و عرض میں قائم ہو گیا۔ پاکستان بننے کے بعد جماعت اسلامی اور ترجمان القرآن کو پھر لاہور منتقل کرنا پڑا اور اچھرہ مستقل طور پر ان دونوں کا مرکز بن گیا۔ پاکستان بننے کے چند سال بعد جماعت اسلامی نے سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کیا جس کی وجہ سے مولانا مودودی کو قید و بند کی صعوبات برداشت کرنا پڑیں۔ یہاں تک کہ

---

[1] اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ ص ۶۸۸

ایک مرتبہ سزائے موت بھی سنا دی گئی لیکن ان کے قدم میں کسی وقت بھی لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ وہ دمِ آخر تک نہایت تندہی اور خلوص سے کام کرتے رہے۔ تقریریں بھی کرتے، کتابیں بھی لکھتے اور سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ اتنی محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحت خراب ہو گئی۔ دن بدن حالت گرتی چلی گئی۔ علاج کے لیے امریکہ گئے لیکن ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو وہیں داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کے جسدِ خاکی کو لا کر اچھرہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔

مولانا مودودی کے خیالات و نظریات سے بہت سوں کو اختلاف رہا اور اب بھی ہے لیکن ان کی اعلیٰ صلاحیت و قابلیت اور ان کے خلوص و لگن سے سوائے ہٹ دھرم انسانوں کے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ وہ اسلام کا صحیح تصور رکھتے تھے۔ اور ایک اعلیٰ پایہ کے مصنف، مفکر اور مقرر تھے ان کی تحریر و تقریر میں بڑی یکسانیت تھی۔ دونوں میں کوئی الجھاؤ اور ژولیدگی نہیں پائی جاتی۔ جیسا بولتے تھے ویسا ہی لکھتے تھے۔ وہ اپنی تحریر و تقریر سے سامعین اور قارئین کو پوری طرح مطمئن کر دیتے تھے۔ ان کی تصانیف نہایت گراں قدر ہیں۔ لیکن جس چیز سے ان کو شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل ہوئی وہ ان کی تفسیرِ قرآن ہے جو تفہیم القرآن کے نام سے چھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اسی تفسیر کے لیے جو ترجمہ تفہیم القرآن میں شائع کیا گیا ہے اس کو مولانا نے ۱۹۶۴ء میں علیحدہ متنِ قرآن کے ساتھ ایک جلد میں شائع کر دیا۔ اور ساتھ میں مختصر حواشی دیے جو ایسے لوگوں کے لیے نہایت مفید ہے جو تفہیم القرآن کا مطالعہ کرنے کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔ اس نسخے میں ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ دائیں صفحہ پر قرآن کا متن ہے اور بائیں صفحہ پر ترجمہ اور حواشی۔ چونکہ مولانا کی تحریر نہایت سلجھی ہوئی، شگفتہ اور دلنشین ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم کے ترجمہ میں بھی وہی انداز اختیار کیا گیا ہے

اس لیے اس ترجمہ کو پڑھ کر قرآن فہمی کے ساتھ ساتھ انسان کے دل و دماغ پر نہایت اچھا تاثر بھی قائم ہوتا ہے۔ نمونے کے لیے دو تین آیات قرآنی مع ترجمہ اور حواشی پیش ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا
مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ
اِلَّا بِسُلْطٰنٍ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ٥ یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا
شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ٥ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ
رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ٥ (الرحمٰن ۲۳ تا ۲۶)

(ترجمہ) اے گروہ جن و انس اگر تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔ نہیں بھاگ سکتے۔ اس کے لیے بڑا زور چاہیے۔ اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے (بھاگنے کی کوشش کرو گے تو) تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا جس کا تم مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ اے جن و انس تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کا انکار کرو گے[1]

(حاشیہ) زمین اور آسمان سے مراد ہے کائنات یا بالفاظ دیگر خدا کی خدائی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی گرفت سے بچ نکلنا تمہارے بس میں نہیں ہے جس بازپرس کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے اس کا وقت آنے پر تم خواہ کسی جگہ بھی ہو بہرحال پکڑ لائے جاؤ گے۔ اس سے بچنے کے لیے تمہیں خدا کی خدائی سے بھاگ نکلنا ہوگا۔ اور اس کا بل بوتا تم میں نہیں ہے۔ اگر ایسا گھمنڈ تم اپنے دل میں رکھتے ہو

1 ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی ادارہ ترجمان القرآن لاہور، ص ۱۳۵۶، ۱۳۵۷

تو اپنا زور لگا کر دیکھ لو۔[1]

(۱۲) خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی (۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء تا ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء)

دہلی کے رہنے والے اور خواجہ میر دردؔ کی اولاد میں تھے۔ اسی لیے ان کو میر دردؔ کی یادگار کہا جاتا ہے۔ ان کا قیام میر دردؔ کی بارہ دری میں تھا۔ لیکن اس بارہ دری کے بارے میں شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں "خواجہ میر دردؔ کی بارہ دری کسی زمانے میں بارہ دری ہو تو ہو، ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے اس بارہ دری میں چند پرانے گھروندے ہی دیکھے۔ ان ہی گھروندوں میں سے ایک میں خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی رہتے تھے۔" بہرحال اسی گھروندے میں ۱۸۶۵ء میں خواجہ ناصر نذیر فراقؔ پیدا ہوئے اور زندگی کی ۶۸ بہاریں دیکھ کر ۱۹۳۳ء میں رہگرائے عالم بقا ہو گئے۔ وہ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے۔ انہیں دہلی کی عورتوں کی زبان اور محاورے پر بڑا عبور تھا۔ بڑی پیاری زبان لکھتے تھے۔ مخزن کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں تھے۔ جب مخزن بند ہو گیا تو انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ پھر جب شاہد احمد دہلوی نے ۱۹۳۰ء میں ماہنامہ ساقی جاری کیا تو اس کے لیے لکھنے لگے۔ اور دم آخر تک لکھتے رہے۔

انہوں نے خاندان کی کچھ عورتوں کے اصرار پر شہر دہلی کی بیگموں اور شریف زادیوں کی اچھوتی بولی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا اور اس کا نام عروس القرآن رکھا۔ فراق صاحب نے ترجمہ کرنے کی وجہ خود بتائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۴۲ھ میں ان کا چھوٹا نواسا ڈھائی سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اس روز

1 ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی ادارہ ترجمان القرآن لاہور ص ۱۳۵۹

خاندان، برادری اور غیر برادری کی بہت سی عورتیں جمع کے پڑھنے کے لیے آئیں۔ تدفین دن کے ایک بجے ہو چکی تھی لیکن اکثر عورتیں رات گئے تک رہیں انہوں نے فراق صاحب کے صاحبزادے ناشر خلیق نگار کے ذریعہ ان کو بڑی حویلی میں بلا کر بڑے اصرار سے کہا کہ "آپ ہماری زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کر دیں تاکہ ہم بھی احکام خداوندی سے واقف ہو سکیں"۔ بڑی ردوکد کے بعد فراق صاحب نے آمادگی ظاہر کی۔ اس کے بعد انہوں نے مختلف تراجم کا مطالعہ کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ "واقعی ایک ایسے ترجمہ کی بے حد ضرورت ہے جو عورتوں کے لیے قابلِ فہم ہو۔ انہوں نے ترجمہ کا کام شروع کیا اور ۸ جمادی الاول ۱۳۴۴ھ مطابق ۲۶ نومبر ۱۹۲۵ء کو جمعرات کے دن یہ ترجمہ مکمل کر دیا۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اس ترجمہ میں میں نے عربی فارسی کے الفاظ ترک کر کے وہ الفاظ اور محاورے استعمال کیے ہیں جو دلی کی شریف زادیاں بولتی ہیں۔ مثلاً "کرب" کی جگہ "بیکلی" "نازک اندام" کی جگہ "دھان پان"، "بے ہک" کی جگہ "نڈر" وغیرہ۔

غرض یہ ترجمہ اپنی نوعیت کا منفرد ہے اس لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔[۱]

(۱۳) سیماب اکبر آبادی (۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء تا ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء)

ان کا اصلی نام عاشق حسین اور تخلص سیماب ہے۔ وطن و مولد آگرہ تھا۔ وہیں وہ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ کسی مقامی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن ابھی ایف اے (انٹرمیڈیٹ) میں تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے سلسلۂ تعلیم ختم کر کے ملازمت کرنی پڑی۔ ۱۸۹۹ء میں داغ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے اور شعر و شاعری کی جانب انہماک بڑھا۔

۱۔ عروس القرآن مطبوعہ محبوب المطابع الیکٹرک پریس دہلی ص ۲ تا ۷

اور تصنیف و تالیف کی جانب بھی بچپن ہی سے رجحان تھا۔ لہٰذا نثر و نظم کی کتابیں بڑے پیمانے پر لکھنے کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر صدہا کتابیں لکھیں۔ شاعری میں اگرچہ ان کا میلانِ طبیعت نظم کی جانب تھا۔ لیکن دوسری اصناف میں بھی انہوں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ سعادت بھی عطا فرمائی کہ اردو میں پورے قرآن کا منظوم ترجمہ "وحی منظوم" کے نام سے کیا۔ اس کو ان کے لائق صاحبزادے مظہر صدیقی نے سیماب اکیڈمی کی جانب سے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ اس ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ زبان نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم ہے اور مفہوم بھی قرآن کریم کے منشاء کے مطابق ہے۔ سورہ فاتحہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ — الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (بیاں) — جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ — رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
ہیں سزاوارِ خدائے (پاک) ساری خوبیاں — (جو ہے) رب سارے جہانوں کا رحیم و مہرباں

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ
ہے وہی انصاف کے دن کا مالک (بے گماں)

اِيَّاكَ نَعْبُدُ — وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ
(یا الٰہی) ہم فقط کرتے ہیں تیری بندگی — اور ہوتے ہیں تجھی سے طالبِ امداد بھی
اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ — صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
یا الٰہی ہم کو سیدھے راستے پر تو چلا — ان کا رستہ جن پر انعام و کرم تیرا ہوا
غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ — وَلَا الضَّآلِّيْنَ
راہ ان کا نہیں جن پر غضب کی ہے (نگاہ) — اور نہ ان کا راستہ جو ہو گئے گم کردہ راہ (لاالفاکو اِتِّیْ)[۱]

۱۔ وحی منظوم سیماب اکاڈمی۔ کراچی۔ ص ۴۵۵ –

(۱۴) مجید الدین احمد اثر زبیری لکھنوی

اثر زبیری صاحب کا جدی وطن لکھنؤ تھا۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی چلے آئے اور ملیر کینٹ میں رہائش اختیار کر لی۔ شعر گوئی کا آغاز ہندوستان میں ہی ہو گیا تھا۔ اگرچہ شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی لیکن اثر صاحب کا میلانِ طبع شروع ہی سے نظم کی جانب تھا۔ انہیں کبھی خصوصی توجہ حمد، نعت اور مناقبِ سلف صالحین کی طرف تھی۔ اسی سلسلہ میں ایک طویل نظم "شہیدِ ستم" حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مظلومانہ شہادت پر لکھی۔ اس نظم کے حصہ "حمد" کو سورہ رحمٰن کے مفہوم سے مربوط کیا گیا تھا۔ اسی چیز نے اثر صاحب کے ذہن کو اس جانب منتقل کیا کہ پورے قرآن کریم کا ترجمہ نظم میں کیا جائے۔ ان کے ایک دوست مولانا محمد ادریس نے ان کے اس خیال کی تائید کی۔ یہ واقعہ جنوری ۱۹۴۲ء کا ہے جب اثر صاحب کا عارضی قیام کانپور میں تھا۔ مولانا ادریس صاحب کے اصرار پر انہوں نے اسی شب سے اس نیک کام کا آغاز کر دیا لیکن جلد ہی یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور کراچی پہنچنے کے بعد مارچ ۱۹۴۸ء میں پھر شروع ہوا۔ مگر دیگر مصروفیات کے باعث کام کی رفتار سست رہی۔ اور آخر کار ۲۳ فروری ۱۹۶۲ء کو اس کے مکمل ہونے کی نوبت آئی۔ طباعت و اشاعت کا مرحلہ اس کے بھی ۱۲ سال بعد ۱۹۷۴ء میں طے ہوا۔ اس وقت یہ منظوم ترجمہ "سحر البیان" کے نام سے منظرِ عام پر آیا اور بے حد پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ متعدد علماء نے ترجمہ کی بے حد توصیف و تعریف کی۔ قاری محمد طیب مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"اثر زبیری صاحب نے ترجمہ قرآن کی نظم میں یہی کمال دکھایا ہے۔ وہ جامع اضداد یعنی سہل ممتنع ہے...... قرآن پاک کی ترجمانی انتہائی تقید اور پابندی چاہتی ہے کہ الفاظ بھی محدود

اور محتاط ہوں اور مفہوم بھی ذرہ برابر اِدھر اُدھر نہ ہونے پائے۔ ...... زبیری صاحب نے ان دونوں متضاد چیزوں کو ملانے میں غیر معمولی طباعی اور موزونیت و ذکاوت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے منظوم ترجمہ میں پابندی تو یہ ہے کہ ترجمہ تقریباً تحت اللفظ اور شاعرانہ آزادی یہ کہ محاورہ اور کلام کی بندش کا زور اپنی جگہ پر قائم ہے"۔

مفتی محمد شفیع مرحوم فرماتے ہیں:

...... ان کی قادر الکلامی کی داد دینی پڑتی ہے کہ جس احتیاط کو آپ نے استعمال کیا وہ درحقیقت آپ ہی کا حصہ ہے۔ نظر کردہ مقامات میں کہیں مجھے ایسی صورت نظر نہیں آئی کہ مصنوعی حیثیت سے ارشاداتِ قرآنی میں کوئی ادنیٰ فرق بھی پڑا ہو"۔

مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

سب سے بڑی بات جو مجھے اس ترجمہ میں نظر آئی ہے وہ یہ ہے کہ قرآنی منشاءِ کلام اور مضمرات و مکنونات کو پورے طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جو ذوق قرآن فہمی کی بین دلیل ہے"۔

یہ چند آراء پیش کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نمونہ کے لیے قاری محمد طیب مرحوم کے تحریر کردہ "تعارف" سے ایک اقتباس دے دیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

بیان توحید کے سلسلہ میں اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا ترجمہ دیکھیے کہ نظم بظاہر سہل ہے اور بحقیقت ممتنع۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ

یقیناً آسمانوں میں اور زمینوں کے بنانے میں: یا دہر پر شام و سحر کے آنے جانے میں

وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا

سفینوں میں جو بہتے رہتے ہیں دریا کے سینے پر برائے نوع انسان ساز و برگ منفعت لیکر

اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا

اور اس پانی میں جس کو آسمان سے رب نے برسایا زمین کو اس نے بخشی جس کے باعث ہستی تازہ

وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ ص (البقرہ ۱۶۳)

اور اس پر اس نے سب اقسام کے حیوان کیے پیدا [1]

(۱۵) آغا شاعر قزلباش دہلوی (۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء تا ۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۱ء)

ان کا اصل نام مرزا ظفر علی بیگ خاں تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاعری میں داغ دہلوی سے تلمذ تھا۔ استاد سے والہانہ شیفتگی تھی۔ وہ بیک وقت شاعر، ناثر، مجلہ نگار اور افسانہ نویس تھے۔ انہوں نے افصح الکلام کے نام سے قرآن مجید کے چند سیپاروں کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔

(۱) پارہ سیقول کا منظوم ترجمہ طبع اول دہلی رزاقی مشین پریس سے ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔

(۲) اردو ترجمہ منظوم پارہ اوّل۔ لاہور۔ راجپوت پرنٹنگ پریس ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں چھپا (جزوی)

(۳) منظوم اردو ترجمہ، پارہ دوم۔ حیدر آباد دکن۔ رزاقی پریس

---

1. منظوم ترجمہ قرآن مجید "سحر البیان" ۲ اثر: بیری لکھنوی)

تاریخ طبع ندارد (جزوی) [1]

ان جدید ترجموں کے علاوہ بعض منظوم ترجموں کا ذکر نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" میں کیا ہے۔ بابائے اردو نے قدیم اردو (ص ۱۲۶) میں سورہ رحمٰن کی چند آیتوں کا منظوم ترجمہ پیش کیا ہے۔ جس نسخے سے یہ ترجمہ نقل کیا گیا ہے وہ ناقص الطرفین تھا اس لیے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب اس کے سنہ کا تعین تو نہیں کر سکے البتہ انہوں نے اس کو گیارہویں صدی ہجری کے تراجم میں شامل کیا ہے۔ یہ ترجمہ دکنی اردو میں ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ — خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ

ترجمہ:- اے لوگو! تم کو دیکھاں جن — جس کا میٹھا نام رحمٰن

سکھایا ہے قرآن — جن سرجا ہے انسان

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ — وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَانِ

سکھایا تم کو سب ہی بیان — چاند سورج سوں حساب پچھان

جھاڑ بیڑ بھی نہیں سبحان — سجدہ کریں ہیں اس کو تان

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ — الْمِیْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ

ترجمہ: اونچا کیتا ان اسمان — راکھے ہے گی ان میزان

اپنے دل سوں حق پچھان — کم نہ زیادہ منہ کو جان

وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ — وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ (الرحمٰن ۱ تا ۹)

ترجمہ: جو تول سو پورا تول — جو مول سو پورا مول

ڈنڈی ول نہ دیکھو جھول — دغل نہ کیجو تول ابول [2]

---

1. قرآن کریم کے اردو تراجم (کتابیات) ص ۲۳
2. قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک (ڈاکٹر سید حمید شطاری) ص ۱۷۱ اور ص ۷۲

اب تک چند تراجم اور ان پر دیے گئے حواشی پر کسی قدر تفصیل سے اظہارِ رائے کیا گیا ہے۔ آئندہ چند ترجموں پر مختصر نوٹس دیے جا رہے ہیں۔ چونکہ اردو میں بہت بڑی تعداد میں ترجمے ہوئے ہیں اس لیے سب پر رائے زنی کرنا مشکل ہے۔ تاہم اتنا کہا جا سکتا ہے کہ سب ایک معیار کے نہیں ہیں کسی میں متن کے زیادہ قریب رہنے کی کوشش کی گئی ہے اور کسی میں اردو محاورہ کا خیال رکھتے ہوئے کسی قدر صراحت سے کام لیا گیا ہے تاکہ کم پڑھے لکھے لوگوں کو قرآن کا مفہوم سمجھنے میں سہولت رہے۔ مزید جن ترجموں کا حسب ذیل میں ذکر کیا جا رہا ہے ان میں تیرہویں اور چودھویں صدی ہجری کے ترجمے شامل ہیں۔

(۱) محمد عبدالسلام عباسی بدایونی ـــ ان کے ترجمہ کا نام "زاد الآخرت" ہے۔ اس نام سے ۱۲۴۴ھ برآمد ہوتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اس ترجمہ کا تاریخی نام ہے۔ پہلے ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں ـــ یہ ترجمہ منظوم ہے۔ ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ اور دوسری روایت کے بموجب ۲ لاکھ اشعار ہیں۔[1]

(۲) مولانا عبدالمقتدر بدایونی (م ۱۹۱۵ء) اردو ترجمہ، حاشیہ پر مختصر تفسیر ہے۔ اس کے ساتھ شیخ سعدی سے منسوب ترجمہ اور شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کا ترجمہ شامل ہے۔ یہ ترجمہ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں طبع انوری آگرہ

۱ قرآن کریم کے اردو تراجم (کتابیات) مرتبہ ڈاکٹر احمد خان۔ شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد ۱۹۸۷ء۔ ص ۲۳۳

سے شائع ہوا تھا۔[1]

(۳) مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء تا ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) اردو ترجمہ خیر المطابع لکھنؤ میں ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء میں چھپا تھا۔ اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔[2]

(۴) حکیم نورالدین احمدی۔ (۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء تا ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) ترجمہ حامل متن ہے۔ یہ ترجمہ خیر خواہ اسلام پریس میں ۱۹۱۰ء میں چھپا تھا۔ مترجم نہ صرف قادیانی مذہب سے تعلق رکھتے تھے بلکہ بانی فرقہ کے خلیفہ اول تھا اس لیے ترجمہ میں قادیانی نقطۂ نظر کا ہونا ضروری ہے۔

(۵) نعیم الدین مرادآبادی (م ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) خزائن الفرقان فی ترجمان القرآن۔ برقی پریس مرادآباد سے ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا۔ حاشیہ پر کنز الایمان فی ترجمان القرآن از مولانا احمد رضا خاں چھپی ہے۔

(۶) خواجہ حسن نظامی (۱۲۹۷ھ/۱۸۷۸ء تا ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء) ترتیلی ترجمہ قرآن مجید۔ طبع اول۔ (عنایت حسین نجمی) درگاہ نظام الدین اولیاء۔ دہلی ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء۔ ۲ جلدیں۔

ـــــــ دوسری مرتبہ ترجمہ ہمراہ قرآن کریم۔ اس میں حسن نظامی کی عام فہم تفسیر شامل نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ ترجمہ کئی بار چھپا۔[3]

۱ ایضاً ص ۱۵۷: قرآن مجید کے اردو تراجم (جمیل نقوی) ص ۶۳

۲ ایضاً ص ۱۱۱، ایضاً ص ۶۱

۳ قرآن کریم کے اردو تراجم (مقتدرہ قومی زبان) ص ۷۲، ۷۳

(۷) عبدالماجد دریابادی (۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۱ء تا ۱۳۹۷ھ / ۱۹۷۷ء)
ترجمہ قرآن مجید۔ مفصل تفسیر کے ساتھ کئی مرتبہ شائع ہوا۔ ایک اشاعت میں جو ۱۹۳۰ء میں ہوئی شاہ رفیع الدین مولانا اشرف علی تھانوی اور عبدالماجد دریابادی کے ترجموں اور تفسیری حواشی کے ساتھ مطبع رسالہ پیشوا دہلی سے شائع ہوا۔ اس پر حسن نظامی کا مقدمہ ہے۔[۱]

(۸) سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی (ولادت ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء) ترجمہ قرآن مسمی بہ کشف الرحمٰن دہلی۔ دینی بک ڈپو ۱۹۵۷ء۔ کراچی مکتبہ رشیدیہ ۱۹۷۸ء دو جلد (پندرہ پندرہ پاروں کی دو جلدوں میں سلیس اور عام فہم اردو، حاشیہ پر مختصر تفسیری فوائد۔ تیسیر القرآن اور مفصل تفسیری فوائد تسہیل القرآن ۱۹۵۷ء اور ترجمہ کشف الرحمٰن ۱۳۷۵ھ۔[۲]

(۹) مرزا بشیر الدین محمود (ولادت ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء) مرزا غلام احمد قادیانی کے صاحبزادے اور ان کے دوسرے خلیفہ تھے۔ انہوں نے قادیانی نقطہ نظر سے قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور تفسیری حاشیہ لکھا۔ یہ ترجمہ ربوہ سے ۱۹۶۵ء میں اور نقوش پریس لاہور سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ نہایت اہتمام سے آرٹ پیپر پر چھپا ہے۔ اور شروع میں مضامین قرآن کی طویل فہرست شامل ہے۔[۳]

- قرآن مجید کے اردو تراجم ص ۵۵

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم (جمیل نقوی) ص ۵۱ قرآن کریم کے اردو تراجم
۲۔ (مقتدرہ قومی زبان) ص ۴۳، اور ۴۴
۳۔ ایضاً ص ۵۵

(۱۰) ادریس محمد ــ ترجمہ قرآن منظوم جو کراچی سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔

(۱۱) مولانا حنیف ندوی ــ ندوہ کے فارغ التحصیل تھے۔ لاہور میں قیام تھا۔ متعدد معیاری کتابیں لکھیں۔ ۱۹۶۶ء میں قرآن مجید کا بامحاورہ ترجمہ کیا۔ حاشیہ پر تفسیر سراج البیان کا اضافہ کر کے ملک سراج الدین۔ پبلشر لاہور سے ترجمہ بالقرآن حکیم کے نام سے شائع کیا۔

(۱۲) سلیم الدین شمسی ــــ ترجمہ قرآن مع متن ــــ ہر صفحہ پہ دو کالم بنا کر پہلے کالم میں قرآنی متن اور دوسرے پہ ترجمہ دیا گیا ہے۔ مختصر حواشی ہیں۔

ــــ ترجمہ قرآن مجید (مع تفسیر و تشریح) مطبوعہ روزنامہ جنگ کراچی۔ ہفتہ وار ایڈیشن، مسلسل (مولانا احتشام الحق تھانوی کی وفات کے بعد اس سلسلہ کو جاری رکھا ہے۔[۱]

کئی ترجمے شیعہ علماء نے بھی کیے ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) سید حسن لکھنوی مجتہد ــــ ترجمہ قرآن مجید لکھنؤ۔
(۲) نواب محمد حسین قلی خان ابن نواب مہدی قلی خان۔ ترجمہ قرآن شریف (مع تفسیر) لکھنؤ مطبع اثنا عشری ۱۸۸۶ء
(۳) سید علی مجتہد بن سید دلدار علی ــــ ترجمہ مع تفسیر توضیح مجید فی تنقیح کلام المجید۔ کلام مجید کا پہلا ترجمہ شیعی نقطہ نظر سے۔[۲]

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۶۰
۲۔ قرآن مجید کے اردو تراجم (جمیل نقوی) ص ۵۵، ۵۶، ۶۴

(۴) مقبول احمد دہلوی ——— تفسیر مطابق روایات آئمہ اہل بیت کرام مع ترجمہ۔ دہلی۔ مقبول پریس۔ ۱۹۲۱ء ہمراہ قرآن کریم۔ یہ ترجمہ نواب حامد علی خاں رامپوری کے ایما پر ۱۳۳۵ھ میں کیا گیا۔ اس کے بعد دہلی اور لاہور سے بھی کئی بار چھپ چکا ہے۔[۱]

اردو تراجم پر مختصر تشریحی حواشی کا جائزہ

قرآن مجید کے جن اردو تراجم کا اس باب میں جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں بعض وہ ترجمے شامل ہیں جن پر مختصر حواشی دیے گئے ہیں۔ ان مترجمین میں سے کئی ایسے علماء بھی ہیں جنہوں نے متن قرآن کے ساتھ یا علیحدہ مفصل تفسیریں بھی لکھی ہیں لیکن عوام کے لیے صرف تحت اللفظ یا بامحاورہ ترجمہ کر دیا ہے۔ دراصل قرآن کریم کا ایجاز یا اسلوب بیان اس امر کا متقاضی تھا کہ جو لوگ عربی زبان سے ناواقف ہیں یا اس زبان میں ان کی استعداد کم ہے ان کو بعض جگہ ربط آیات بتانے کے لیے، بعض موقعوں پر اجمال کو تفصیل میں بدلنے کے لیے، بعض اوقات کسی تشریح طلب امر کی توضیح و تفریح کے لیے اور بعض مقامات پر بعض ادق نکات کو سمجھانے کے لیے مختصر الفاظ میں حاشیہ پر چند الفاظ یا جملے دے دیے جائیں تاکہ عوام کے لیے قرآن کریم کی بظاہر بے ربطی یا اس کا ایجاز و اختصار یا تلمیحات و استعارات ربط و تسلسل اور وضاحت و صراحت اختیار کر لیں۔ ہمارے علماء و فضلا اور مترجمین و مفسرین اسی روش پر چلے ہیں اور حضرت شاہ عبدالقادر

۲۔ قرآن کریم کے اردو تراجم (کتابیات۔ مرتبہ ڈاکٹر احمد خان) ص ۲۵۳، ۲۵۴

محدث دہلوی کے زمانے سے موجودہ دور تک انہوں نے عوام کی سہولت کے لیے ان کی عقل و فہم کے لیے تفسیری حواشی اور تفسیری فوائد دیے ہیں جو عام قارئین قرآن کے لیے یقیناً بے حد مفید اور معلوماتی ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہ حواشی یا فوائد محض عوام کے لیے ہیں اور خواص ان سے کسی طرح کا فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ فائدہ تو یقیناً سب کو ہوگا۔ لیکن چونکہ عوام کو زیادہ گہرائی میں جانے کی نہ اہلیت ہوتی ہے نہ ضرورت۔ اس لیے وہ تو ان مختصر حواشی سے ہی فیضیاب ہو جاتے ہیں۔ مگر خواص کو بعض اوقات نہایت باریک بینی سے کام لینا پڑتا ہے اور ان کے پیشِ نظر بہت سے پہلو ہوتے ہیں اس لیے ان کو زیادہ تفصیلات درکار ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مفصل تفسیر پڑھیں۔ ان کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جامع تفسیریں لکھی گئی ہیں جیسے ترجمان القرآن، بیان القرآن، تفہیم القرآن وغیرہ۔

جہاں تک تفسیری یا تشریحی حواشی کا تعلق ہے اس میں بھی ہمیشہ سے مختلف مترجمین کے درمیان فرق رہا ہے۔ چنانچہ ابتداء مختصر حواشی سے ہوئی۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے جس طرح ترجمہ میں اختصار سے کام لیا ہے اسی طرح حواشی بھی بہت کم تعداد میں اور نہایت مختصر دیے ہیں۔ سورہ فاتحہ پر صرف ایک حاشیہ ہے جو پوری سورت کا تعارف پیش کرتا ہے۔ اس میں بھی گنے چنے چند الفاظ ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

(حاشیہ) "یہ سورت اللہ صاحب نے بندوں کی زبان سے فرمائی ہے کہ اس طرح کہا کریں"۔[۱]

۱۔ قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر موضح القرآن ص ۲

جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا حواشی کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔
اور تفصیلات بھی بڑھتی گئیں۔ یہ عمل بعض اوقات تو قارئین کی ضروریات
اور رجحانات کو سامنے رکھ کر کیا گیا اور بعض اوقات مترجم نے خود اپنے
موعود ذہنی اور عقیدہ کی روشنی میں۔ چنانچہ سورہ فاتحہ پر ہی مولانا اشرف
علی تھانوی نے چار حواشی دیے ہیں۔ پہلا حاشیہ تو وہی ہے جو حضرت شاہ
عبدالقادر نے دیا تھا۔ صرف الفاظ بدلے ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"یہ سورت رب العالمین نے اپنے بندوں کی زبان سے فرمائی
ہے کہ ان الفاظ میں اپنے خالق اور رازق کے سامنے عرض مدعا
کیا کریں۔" گویا:

مانگنے کو بھی ہمیں فرما دیا　　مانگنے کا ڈھنگ بھی بتلا دیا

دوسرا حاشیہ لفظ عالمین کی وضاحت کے لیے دیا گیا۔ لوگ اس لفظ
کی تشریحات اپنی اپنی سمجھ کے مطابق کرتے رہے ہیں۔ بعض کہتے ہیں اس میں
عالم آب و گل، عالم برزخ اور عالم آخرت شامل ہیں۔ بعض کے نزدیک
یہ اٹھارہ ہزار عالموں پر مشتمل ہے۔ اور بعض موجودہ سائنسدانوں کے
اس ادعا سے متاثر ہو کر ہماری دنیا کی طرح نظام شمسی کے دوسرے
سیاروں میں بھی حیات موجود ہے۔ لہٰذا عالمین سے مراد یہی سب دنیائیں
ہیں۔ مولانا تھانوی نے اس الجھن کو دور کرنے کے لیے اس کی تشریح اسطرح
فرمائی ہے کہ "مخلوق کی الگ الگ جنس ایک ایک عالم کہلاتا ہے۔ مثلاً عالم
ملائکہ، عالم انسان، عالم پرند، عالم حیوانات عالم جن۔

تیسرا حاشیہ "اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ" کے ترجمہ "جن پر آپ نے
انعام فرمایا" پر ہے۔ اس معاملہ میں بھی عوام مختلف الرائے تھے۔ اور اس کو
دنیاوی ترقی، دولت و ثروت، سلطنت و حکومت پر محمول کرتے تھے۔

اس کو حضرت مولانا نے دینی انعام قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"انعام سے دینی انعام مراد ہے۔ انعام والے چار گروہ ہیں۔
انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔"

چوتھا حاشیہ سورہ فاتحہ کی آخری آیت کے دو الفاظ "مَغْضُوْبِ"
اور "ضَآلِّیْنَ" کی وضاحت پر ہے۔ چونکہ ان دونوں الفاظ کے فرق کو
عوام بخوبی سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس لیے اس کی تشریح و تصریح کرنا ضروری تھا۔
اس سلسلہ میں مولانا فرماتے ہیں:

"غضب کے مستحق وہ لوگ ہیں جو تحقیقات کے باوجود راہِ
ہدایت کو چھوڑ دیں اور گمراہ وہ ہیں جو صراط مستقیم کی تحقیقات
نہ کرنا چاہیں۔ ان میں مغضوب زیادہ ناراضی کے مستحق ہیں جو
دیدہ و دانستہ حق کی مخالفت میں سرگرم ہیں۔"[1]

اس کے بعد شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور اعلیحضرت مولانا احمد
رضا خاں کے تراجم آتے ہیں۔ اوّل الذکر پر مولانا شبیر احمد عثمانی کا، اور
موخر الذکر پر مفتی احمد یار خاں کا حاشیہ ہے۔ ان دونوں حضرات کے حاشیے
تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور تفصیل میں بھی۔ لہٰذا ان کو حواشی اور مفصل
تفسیر کی درمیانی شے قرار دینا مناسب ہوگا۔ سورہ فاتحہ پر مولانا شبیر
احمد عثمانی نے سات حواشی دیے ہیں اور مفتی صاحب نے نو۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے پہلے حاشیہ میں رَحْمٰنُ و رَحِیْمِ کی تشریح
بیان کی ہے۔ دوسرے میں "اَلْحَمْدُ" کی وسعت پر روشنی ڈالی ہے —
تیسرے میں عالمین کو مجموعہ مخلوقات سے تعبیر کیا ہے اور آخری یعنی ساتویں

---

1 عکسی قرآن الحکیم مع ترجمہ مولینا اشرف علی تھانوی ص ۲

حاشیے میں سورہ فاتحہ کے متعلق بتایا ہے کہ:

"یہ سورت اللہ تعالیٰ نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ جب ہمارے دربار میں حاضر ہو تو ہم سے یوں سوال کیا کرو۔ اس لیے اس سورت کا ایک نام تعلیم مسئلہ بھی ہے۔ اس سورت کے ختم پر لفظ آمین کہنا مسنون ہے اور یہ لفظ قرآن شریف سے خارج ہے۔ معنی اس لفظ کے یہ ہیں کہ الٰہی ایسا ہی ہو یعنی مقبول بندوں کی پیروی اور نافرمانوں سے علیحدگی میسر ہو۔ اسی سورت کے اول نصف میں اللہ تعالیٰ کی ثنا و صفت اور دوسرے حصے میں بندہ کے لیے دعا ہے۔"[1]

مفتی احمد یار خاں صاحب نے تفسیری حواشی "نور العرفان" کے نام سے تحریر کیے ہیں۔ پہلے حاشیے میں سورہ فاتحہ کے متعلق چند نکات بیان کیے ہیں۔ جیسے یہ سورت "مکی" ہے۔ اس میں سات آیتیں اور ایک سو چالیس حروف ہیں۔ دوسرے اور تیسرے حاشیے میں "بسم اللہ" کے بارے میں بتایا ہے کہ جو "بسم اللہ" ہر سورہ کے شروع میں ہے وہ پوری آیت ہے اور جو سورہ "نحل" میں ہے وہ آیت کا جزو ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بتادی ہے کہ "بسم اللہ" ہر سورت کے شروع میں نازل نہیں ہوئی بلکہ صرف ایک جگہ یعنی سورہ نحل کے درمیان میں نازل ہوئی۔ اس کو برکت کے لیے ہر سورہ کے شروع میں مکرر کر دیا گیا ہے۔ تیسرے حاشیے میں بتایا ہے کہ "بسم اللہ" کی "ب" استعانت کی ہے۔ اور اس سے پہلے فعل پوشیدہ ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ "شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام کی مدد سے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ

1۔ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ص ۲

اللہ کے سوا سے بھی مدد لینا جائز ہے تو اللہ کے رسول اور اس کے نیک بندوں سے بھی جائز ہے کہ وہ بھی "بسم اللہ" کی طرح اللہ کی ذات پر دلالت اور رہبری کرتے ہیں۔ اس لیے قرآن نے حضورؐ کو ذکر اللہ فرمایا۔"

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ اسی سورت میں بڑی تاکید کے ساتھ یہ بھی فرمادیا گیا ہے کہ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" اس کا ترجمہ مفتی صاحب نے یہ کیا ہے۔ "ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں"۔ اس آیت سے اس ادعا کی صریحاً تردید ہوتی ہے کہ "اللہ کے سوا سے بھی مدد لینا جائز ہے"۔ اسلیے مفتی صاحب نے اس آیت پر دو حاشیے دیے ہیں۔

(۱) "نَعْبُدُ" کے جمع فرمانے سے معلوم ہوا کہ نماز جماعت سے پڑھنی چاہیے۔ اگر ایک کی قبول ہو سب کی قبول ہو۔

(۲) اس سے معلوم ہوا کہ حقیقتاً مدد اللہ تعالیٰ کی جیسے حقیقتاً حمد رب کی ہے خواہ واسطے سے ہو یا بلاواسطہ۔ خیال یہ ہے کہ "عبادت" اور مدد لینے میں فرق یہ ہے کہ مدد تو مجازی طور پر غیر خدا سے بھی حاصل کی جاتی ہے۔"[1]

اس کے مقابلہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے "اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کے حاشیہ میں بتایا ہے کہ:

"اس آیت شریف سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات پاک کے سوا کسی حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے۔ ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے۔ استعانت درحقیقت

1۔ تفسیر نور العرفان مفتی احمد یار خاں مع ترجمہ کنزالایمان ص ۲

حق تعالیٰ ہی کی استعانت ہے۔ اس تاکید کے باوجود جو اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) سے ظاہر ہو رہی ہے۔ مفتی صاحب اور مولانا شبیر صاحب کا استدلال قابلِ فہم نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن چونکہ یہ دونوں حضرات بڑے عالم ہیں اس لیے اس سلسلے میں کچھ کہنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔

جس طرح استعانت کے معاملہ میں ان دونوں بزرگوں نے گنجائش نکالی ہے۔ اسی طرح اس سلسلہ میں بھی وہ دونوں متفق ہیں کہ "اَلْمَغْضُوْبِ" سے یہود اور "ضَآلِّیْنَ" سے نصاریٰ مراد ہے۔[1]

مولانا مودودی نے قرآن کریم کے ترجمے کے ساتھ جو حواشی دیے ہیں ان کے متعلق وہ خود فرماتے ہیں:

"اس ترجمے کے ساتھ میں نے بہت مختصر حواشی صرف ان مقامات پر دیے ہیں جہاں یہ محسوس ہوا ہے کہ حاشیے کے بغیر بات پوری طرح سمجھ میں نہ آسکے گی۔ کیونکہ یہ ترجمہ دراصل ان لوگوں کے لیے شائع کیا جا رہا ہے جو محض ترجمہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ باقی رہے وہ حضرات جو تفصیل کے ساتھ قرآن مجید کو سمجھنے کے خواہشمند ہوں، ان کے لیے میری تفسیر "تفہیم القرآن" کا مطالعہ مفید ہوگا۔"

"عرضِ مترجم" کے تحت یہ وضاحت کرنے کے بعد سورہ فاتحہ کے ترجمہ کے ساتھ مولانا اشرف علی تھانوی کی طرح انہوں نے بھی چار حواشی دیے ہیں۔ پہلے حاشیے میں بتایا ہے کہ یہ سورہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو سکھائی ہے کہ وہ اللہ کے حضور اپنی عرضداشت اس طرح پیش کیا کریں۔ دوسرے

---

[1] قرآن مجید مترجم محشی ص ۲

حاشیہ میں لفظ "رب" کی تشریح کی ہے۔ تیسرے حاشیے میں لفظ عبادت کی تشریح ہے۔ اور چوتھے حاشیے میں یہ بتایا ہے کہ بندوں کی اس عرضداشت کے جواب میں اللہ تعالیٰ ان کو پورا قرآن عطا کرتا ہے۔

رَبّ، اِلٰہ، دِیْن اور عبادت جیسے الفاظ جو قرآن مجید میں متعدد بار استعمال ہوئے ہیں، نہایت وسیع مفہوم کے حامل ہیں لیکن چونکہ بہت کم لوگوں کو ان کے مفہوم کی وسعت سے آگاہی ہے اس لیے جو اثرات ان الفاظ کے پڑھنے سے قارئین کے دلوں پر ہونے چاہئیں وہ نہیں ہوتے۔ لہٰذا مولانا مودودی عوام کے لیے ان الفاظ کی تشریح و توضیح کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر انہوں نے "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اور اس میں ان چار اصطلاحوں کی پوری طرح وضاحت کر دی ہے۔ سورہ فاتحہ کے ترجمے کے ساتھ بھی ان کی اہمیت کو جتانے کے لیے "رَبّ" اور "عِبَادَتْ" پر دو حاشیے دیے ہیں اور ان میں مختصراً ان کے قرآنی مفہوم سے قارئین کو آگاہ کر دیا ہے۔[1]

مولانا فتح محمد جالندھری نے سورہ فاتحہ پر تین حاشیے دیے ہیں۔ پہلے حاشیہ میں بِسْمِ اللہ کے کنہ و حقیقت سے آگاہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ترجمے میں ہمیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایت کے طور پر ہر جگہ بِسْمِ اللّٰہِ کے مفہوم سے پہلے "کہو" کا لفظ لکھنا چاہیے تھا لیکن چونکہ اس میں وہ لطف نہ آتا جو "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" میں ہے۔ اس لیے ہم نے اسے مقدر رہنے دیا۔ دوسرے حاشیہ میں انہوں نے بھی اس سورت کو بارگاہِ رب العزت میں دعا قرار دیا ہے۔ حاشیہ میں

---

[1] ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی سید ابو الاعلیٰ مودودی ص ۱۹۔

یَوْمِ الدِّیْنِ کا ترجمہ انصاف کا دن کر کے بتایا ہے کہ اس سے مُراد روزِ قیامت ہے۔[1]

مفسّرِ قرآن مولانا احمد علی لاہوری نے اپنے ترجمہ قرآن میں حواشی تو وہی قائم رہنے دیے جو شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے دیے۔ البتہ "ربط آیات" بتا کر آیات کی ظاہری بے ربطی کو ختم کر دیا ہے۔ اس معاملہ میں مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا عبید اللہ سندھی کا تتبع کیا ہے۔ سچ پوچھیے تو عوام کے لیے یہ ایک نہایت مفید اقدام ہے۔ مولانا لاہوری نے آیاتِ قرآنی کو جس خوبصورتی سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے دکھایا ہے اس نے عوام کے لیے قرآن فہمی کو بہت آسان کر دیا ہے۔ ایک معمولی سوجھ بوجھ کا انسان بھی بغیر کسی کی مدد کے اس ترجمہ کے ذریعہ قرآن کریم کے مفہوم کو سمجھتا چلا جاتا ہے۔ سورہ فاتحہ میں حواشی زیادہ تفصیلی ہیں۔[2]

قادیانی علماء نے قرآن کریم کے جو تراجم پیش کیے ہیں ان میں کئی جگہ انہوں نے روشِ عام سے ہٹ کر ترجمے بھی مختلف دیے ہیں اور حواشی میں بھی اختلاف کیا ہے۔ مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی کے صاحبزادے اور دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے ترجمے میں خاتم النبیین سے یہ مُراد لی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعد آنے والے نبیوں کی نبوت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیں گے۔[3] پھر حاشیے میں اس کی ایک ناقابلِ فہم سی تفسیر پیش کی ہے۔ آخر میں "سُوْرَۃُ النَّاسِ" پر جو حواشی دیے ہیں ان میں

1۔ القرآن الحکیم مع ترجمہ فتح الحمید ص ۲

2۔ اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ مترجم و محشی ۱۳۵۲ھ ص ۲

3۔ تفسیر صغیر الحاج مرزا بشیر الدین محمود احمد ناشر ادارۃ المصنفین ربوہ۔ ضلع جھنگ بار پنجم ۱۹۶۶ء ص ۵۵۵

سے ایک حاشیہ میں بتایا ہے کہ "مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ" میں جنہ سے مُراد غیر ملکی لوگ ہیں اور اَلنَّاسَ سے ملکی یا مقامی آبادی مُراد ہے۔[1]

غرض شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے لے کر اس وقت تک قرآن کریم کے مترجمین اور حاشیہ نگاروں نے بے حد تنوع سے کام لیا ہے۔ بعض نے تو صرف چند الفاظ کے مفہوم ہی میں کسی قدر اختلاف کیا ہے لیکن بعض نے اپنے عقائد کی روشنی میں تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں ان حضرات کی علمیت اور نیتوں پر تو شبہ کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے لیکن بعض حضرات کی زیادہ آزادیٔ رائے سے ڈر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عام قاری جو زیادہ سوجھ بوجھ نہیں رکھتا ان حضرات سے عقیدت کی بنا پر قرآن کے حقیقی مفہوم سے زیادہ دور نہ جا پڑے اور حکم خداوندی کی خلاف ورزی کا مرتکب نہ ہو جائے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا

1۔ تفسیر صغیر الحاج مرزا بشیر الدین محمود احمد ناشر ادارۃ المصنفین ربوہ ضلع جھنگ بار ہفتم ۱۹۶۷ء ص ۸۵۲

باب چہارم

اردو کی مشہور تفاسیر، تاریخی جائزہ اور تجزیہ

فارسی تفاسیر

مثلاً

تفسیر بیضاوی، تفسیر حسینی، تفسیر کبیر وغیرہ کے اردو تراجم

ایک وضاحت:

تفسیری ادب کا بہت بڑا ذخیرہ مختلف زمانوں، ملکوں، زبانوں اور مکاتبِ فکر کی کاوشوں پر مشتمل ہے۔ قدرتی طور پر ہر مفسر نے محض سابقین یا معاصرین کی تقلید یا تنقید نہیں کی ہے بلکہ مختلف زاویوں سے تشریح اور تفسیر لکھی ہے۔ ان سب پر الگ الگ بحث یا مختلف نقطہ ہائے نظر کی تصدیق اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ اس میں مجموعی طور پر شاہ ولی اللہؒ کی "فوز الکبیر" کے نقطۂ نظر اور انداز کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

لفظ تفسیر کی تشریح، تفسیر نویسی کا آغاز و ارتقاء

اور اصولِ تفسیر

جیسا کہ باب اول کے شروع میں بتایا گیا ہے "لفظ تفسیر کا مادہ فسر ہے۔ جس کا مفہوم واضح کرنا یا ظاہر کرنا ہے۔ ادارۃ المعارف الاسلامیہ (عربی) میں شامل مقالہ "تفسیر" کے مصنف استاذ امین الخولی اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ف۔س۔ر اور س۔ف۔ر، دونوں مادوں میں کھولنے اور حجاب ہٹا دینے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ لیکن سفر ظاہری اور باطنی رموز کو کھول کر سامنے لانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ فَسَرٌ کا استعمال معنوی اور لفظی خوبیوں کو کھول کر بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے۔"[1]

تاریخ تفسیر و مفسرین کے مولف غلام احمد حریری "تعارف کتاب" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"لفظ تفسیر کا سہ حرفی مادہ فسر ہے۔ جس کے معنی ہیں ظاہر کرنا، کھول کر بیان کرنا اور بے حجاب کرنا۔ کسی لفظ کی تشریح و توضیح کو تفسیر کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ گویا اس کے مطلوب و

---

[1] دائرۃ المعارف الاسلامیہ (عربی) ص ۹۴

مقصود کو بے حجاب کر دیا جاتا ہے۔ یہ تفسیر کا لغوی مفہوم ہے۔
جہاں تک تفسیر کے اصطلاحی معنی کا تعلق ہے۔ امام زرکشی نے "البر…
میں تفسیر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"تفسیر ایک ایسا علم ہے جس کی مدد سے قرآن کریم کے مطالب و معانی معلوم کیے جاتے ہیں اور اس میں مندرج احکام و مسائل اور اسرار و حکم سے بحث کی جاتی ہے"[1]

آگے چل کر تفسیر کا ارتقاء کے عنوان کے تحت غلام احمد حریری تاریخ… کے مختلف ادوار میں قرآن کریم کی تفسیر کی ضرورت و اہمیت اور ہر دور کی… کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ "عہد رسالت" میں تفسیر کے زیر عنو… وہ لکھتے ہیں:

"قرآن عزیز عربی میں نازل ہوا تھا۔ اس وقت جو لوگ موجود تھے عربی ان کی مادری زبان تھی اس لیے قرآن کریم کے معانی و مطلوب معلوم کرنے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی تاہم بعض مقامات میں جہاں زیادہ اجمال ہوتا ہے صحابہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیا کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خداوند کریم نے جہاں دیگر مناصب جلیلہ پر فائز کیا تھا وہاں ایک منصب عالی قرآن عزیز کے مفسر و ترجمان ہونے کا بھی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ
النحل (۴۴)

۱۔ تاریخ تفسیر و مفسرین تالیف غلام احمد حریری ناشر ملک سنز پبلیشرز کارخانہ بازار۔ فیصل آباد پاکستان۔ مطبوعہ ۱۹۷۸ء ص ۳

اور ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ اسے لوگوں کے لیے واضح کر دیں"

چنانچہ تفسیر کا سب سے پہلا بیش قیمت سرمایہ تفسیری روایات ہیں جو مختلف کتب حدیث میں منقول ہیں۔[1]

عہد رسالت کے بعد صحابہ کا دور آیا۔ حالات میں تیزی سے تبدیلی ہونی شروع ہوئی جس سے تھوڑا بہت اختلاف تفسیری روایات میں بھی ہوا۔ تاہم صحابہ اپنے سابقہ مسلک سے نہیں ہٹے۔ انہوں نے جو تفسیر بالواسطہ یا بلاواسطہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی وہی بیان کرنے پر اکتفا کیا۔ بیان کی سادگی باقی رہی۔ کلامی بحثوں یا صرفی اور نحوی نکات میں صحابہ قطعاً نہیں الجھے۔ یہ ضروری ہے کہ تفسیر بیان کرنے میں تمام صحابہ کا درجہ برابر نہیں تھا۔ اتنی بڑی جماعت میں دس حضرات کو اس معاملہ میں امتیاز حاصل تھا۔ ان میں بھی سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منسوب ہیں۔ خلفائے راشدین میں حضرت علیؓ کی بیان کردہ روایات زیادہ ہیں۔

تابعین سے تفسیر کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ چونکہ تابعین نے حضرات صحابہؓ سے اکتساب فیض کیا تھا اس لیے ان میں بھی بڑے بڑے مفسرین پیدا ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ سر برآوردہ مجاہد، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن بصری، ابو العالیہ، ضحاک اور قتادہ ہیں۔

مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن عباس کے سلسلہ میں مجاہد (المتوفی ۱۰۴ھ) نے سب سے زیادہ فیض پہنچایا۔ چنانچہ ان کی بیان کردہ تفسیر پر اکثر

۱۔ تاریخ تفسیر و مفسرین تالیف غلام احمد حریری ص ۳ اور ۴

آئمہ نے اعتماد کیا ہے۔ ان میں سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد اور امام بخاری کا درجہ اہم ہے

مدینہ منورہ میں صحابیٔ رسولؐ حضرت ابی بن کعبؓ کے شاگردوں نے بکثرت تفسیری روایت کو محفوظ کر کے آئندہ نسل کو منتقل کیا۔ مفسر تابعین مدینہ میں زید بن اسلم، ابوالعالیہ اور محمد بن کعب القرظی کے اسماء قابلِ ذکر ہیں۔ تفسیر کا کوفہ کا مرکز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے قائم کیا۔ تابعین میں جن حضرات نے ان سے فیض حاصل کر کے دوسروں کو مستفید فرمایا ان میں علقمہ بن قیس، مسروق، اسود بن یزید اور امام شعبی کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔

بصرہ میں حضرت حسن بصری اور ان کے سلسلہ کے مفسرین نے فیض پہنچایا۔ تابعین کے دور میں تفسیر میں اسرائیلیات کا عنصر شامل ہونا شروع ہو گیا۔ جس نے رفتہ رفتہ کافی مقبولیت حاصل کر لی اور قرآن کریم کتاب ہدایت ہونے کے بجائے اسرائیلیات کا مجموعہ معلوم ہونے لگا۔[1]

---

[1] اسرائیلیات سے مراد وہ واقعات ہیں جو بنی اسرائیل نے وقتاً فوقتاً گھڑ کر بعض جلیل القدر نبیوں اور پیغمبروں سے منسوب کر دیے ہیں اور بعد میں وہ بائبل اور اس کی تفسیروں میں شامل کر لیے گئے۔ آغازِ اسلام کے وقت یہودیوں میں یہ واقعات مشہور تھے اور بائبل اور دیگر مقدس کتابوں میں درج ہونے کی وجہ سے وہ ان پر یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ جب بعض یہودی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیانت داری سے یہ واقعات مسلمانوں کے بھی ذہن نشین کر دیے۔ بعض مفسرین نے ان کو سچ سمجھ کر ان میں سے بعض اپنی تفسیروں میں بھی شامل کر لیے۔ جیسے داؤد علیہ السلام کے دربار میں ناقوس بجنے والوں کا قصہ مشہور ہونے کی روایت اور اس سے حضرت داؤد

عہد صحابہ اور تابعین کے دور کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس وقت تفسیر کی جداگانہ تدوین شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ تفسیری روایات احادیث

بسلسلہ زیریں صراحت *

علیہ السلام کو اس بات پر تنبیہہ کہ انہوں نے ننانوے بیویاں ہوتے ہوئے حتی اوریاہ کو دھوکے سے قتل کرا کر اس کی حسین بیوی "جب اس کے سوگ کے دن گزر گئے تو داؤد نے اسے بلوا کر اس کو اپنے محل میں رکھ لیا۔"

(کتاب ۲ سموئیل، باب ۱۱، آیات ۲ تا ۱۷)

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے قصص القرآن میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

یہ تو ایک واقعہ ہے، اس طرح کے بے شمار قصے بائبل میں بکھرے پڑے ہیں۔ جیسے حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ وغیرہ کے شراب پی کر غیر شرعی حرکتیں کرنے کے قصے، یا حضرت داؤدؑ ہی کا یہ واقعہ:

"جب داؤد لوٹا، تاکہ اپنے گھرانے کو برکت دے اور داؤد کی بیٹی میکل داؤد کے استقبال کو نکلی اور کہنے لگی کہ "اسرائیل کا بادشاہ آج کیا شاندار معلوم ہوتا تھا جس نے آج کے دن اپنے ملازموں کی لونڈیوں کے سامنے اپنے کو برہنہ کیا جیسا کوئی بانکا بے حیائی سے برہنہ ہو جاتا ہے۔ داؤد نے میکل سے کہا۔ "یہ تو خداوند کے حضور تھا جس نے تیرے باپ اور اس کے سارے گھرانے کو چھوڑ کر مجھے پسند کیا تاکہ وہ مجھے خداوند کی قوم اسرائیل کا پیشوا بنائے۔ سو میں خداوند کے آگے ناچوں گا۔ بلکہ میں اس سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گا اور اپنی ہی نظر میں ہیچ ہوں گا۔ اور جن لونڈیوں کا ذکر تو نے کیا ہے

نبویہ کے ساتھ محفوظ تھیں۔ آخر دور بنو امیہ اور اوائلی دورِ بنو عباس میں تفسیر کی تدوین شروع ہوئی اور اس نے ایک جداگانہ فن کی صورت اختیار کرلی

یسلسلہ زیریں صراحت ★★

دیہی میری عزت کریں گی۔" ماؤل کی بیٹی میکل مرتے دم تک بے اولاد رہی۔"

(۲ سموئیل، باب ۲، آیات ۱ تا ۱۳)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں بائبل کا بیان ملاحظہ ہو۔

"جب سلیمان بڈھا ہوگیا تو اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا جیسا کہ اس کے باپ داؤد کا تھا کیونکہ سلیمان صیدانیوں کی دیوی عسارات اور عمونیوں کی نفرتی ملکوم کی پیروی کرنے لگا اور سلیمان نے خداوند کے آگے بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی نہ کی....." (۱ سلاطین باب ۱۱ آیات ۴۔۸)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس حرکت پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوگیا (نعوذ باللہ) اور "خداوند نے سلیمان کو کہا۔" چونکہ تجھ سے یہ فعل ہوا اور تو نے میرے عہد اور میرے آئین کو جن کا میں نے تجھے حکم دیا نہیں مانا، اس لیے میں سلطنت کو ضرور تجھ سے چھین کر تیرے خادم کو دوں گا۔ تو بھی تیرے باپ داؤد کی خاطر میں تیرے ایام میں یہ نہیں کروں گا۔ بلکہ اسے تیری بیٹے کے ہاتھ سے چھینوں گا......" (۱۔ سلاطین ۱۱ تا ۱۱ - ۱۲)

اس روایت میں، دو باتیں غور طلب ہیں، ایک تو خداوند نے حضرت داؤد کو (جن سے اوریاہ کی بیوی کو ناجائز طریقہ پر اپنے محل میں رکھ لینے کی وجہ سے خداوند ناراض ہو گیا تھا) اپنا بندہ کہہ کر حضرت سلیمان کو ان کے جرم کی سزا نہیں دی۔ دوسرے یہ کہ حضرت سلیمان کے جرم کی سزا ان کے بے قصور بیٹے کو دی گئی کیا اسی کو عدل خداوندی کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ پوری کتاب ۱۔ سلاطین (جیسا کہ پروفیسر نواب علی نے تاریخ صحف سماوی میں لکھا ہے) حضرت سلیمانؑ کے باغی غلام یربعام نے انکے انتقال کے بعد اقتدار پر قبضہ کر کے ان کو بدنام کرنے کے بعد خود لکھوائی اور بائبل میں شامل کر دی۔

اب قرآن کی ترتیب کے مطابق ہر آیت اور ہر سورۃ کی تفسیر مرتب کی جانے لگی۔ تاہم اس دور کے تفاسیر میں بھی سنداً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین سے منقول ہیں۔ اس دور کے مفسرین میں کئی نام نہایت اہم ہیں لیکن سب سے زیادہ شہرت تفسیر ابن جریر طبری کو حاصل ہوئی۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ ابن جریر نے صرف تفسیری اقوال نقل کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی توجیہ کرتے ہوئے بعض کو راجح اور بعض کو مرجوح قرار دیا ہے۔ اسی کی بنیاد پر علامہ جلال الدین سیوطی نے تفسیر ابن جریر کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد بتایا ہے۔

عصر تدوین تک فنِ تفسیر جن مراحل سے گزرا ان سب میں تفسیر بالماثور کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد جو دور شروع ہوا اور جس کا پھیلاؤ عباسی دور سے عصر حاضر تک ہے بعض بیرونی اثرات کے تحت ادوار ماسبق سے بڑی حد تک مختلف ہوگیا ہے۔ اس میں عقل و نقل کا امتزاج دکھائی دینے لگتا ہے جو امتدادِ زمانہ سے وسعت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ اس طویل دور میں مختلف النوع عناصر شامل ہوئے۔ مثلاً صرف و نحو کی بحثیں اور عربی زبان کی بنیادی خصوصیات پر اظہارِ خیال۔ فقہی مسائل کا استنباط فلسفیانہ موشگافیاں اور کلامی بحثیں۔ ناسخ و منسوخ کا مسئلہ۔ اسبابِ نزول اور موجودہ دور میں آیات قرآنی سے سائنسی مسائل کا استخراج۔ جو مفسر جس علم اور جس مسلک و مسئلہ سے دلچسپی رکھتا تھا اس نے اپنی تفسیر کو اسی کے رنگ میں رنگ دیا۔ غرض کتابِ ہدایت میں اتنی موشگافیاں کیں کہ اس کا اصل مقصد یعنی ہدایت کا عنصر تقریباً آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

نحوی علماء نے جو تفسیریں لکھیں ان میں نحوی مسائل کی بھرمار ہے۔ اس طرح کی تفسیریں لکھنے والے مفسرین میں زجاج۔ واحدی اور ابو حیان کے اسماء کافی

اہم ہیں۔

علوم عقلیہ سے دلچسپی رکھنے والے علماء نے اپنی تفسیروں کو علماء و حکماء کے اقوال کے مجموعے بنا دیا ہے۔ امام فخر الدین رازی کی تفسیر جو تفسیر کبیر کے نام سے موسوم کی جاتی ہے، اس طرح کی تفاسیر میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

جن لوگوں نے بدعات کا جواز قرآن کریم میں تلاش کرنا چاہا انہوں نے بدعات کی تائید و حمایت پر مشتمل اقوال سے اپنی تفسیر کی کتابوں کو زینت دی۔ اس نوع کی تفسیروں میں جار اللہ زمخشری کی کتاب "کشاف" سب سے زیادہ شہرت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ رمانی، جبائی اور شیعہ اثناء عشریہ کے مفسرین طبرسی اور ملا محسن نے اسی طرح کی تفسیریں لکھی ہیں۔

فقہا نے اپنی تفسیروں کو بیشتر فقہی مسائل کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اس معاملہ میں جصاص اور قرطبی پیش پیش ہیں۔

مؤرخین نے اپنی تفسیروں میں تاریخی واقعات اور اسرائیلی خرافات کی اتنی بھرمار کی ہے کہ اس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ قرآن کے نزول کا مقصد واحد تاریخی واقعات اور اسرائیلیات کو ذہن نشین کرانا اور فروغ دینا تھا۔ اس طرح کے مفسرین کے سرخیل امام ابن جریر طبری ہیں جو بیک وقت مؤرخ بھی تھے اور مفسر قرآن بھی۔

صوفیہ نے قرآن کریم کی تفسیر صوفیانہ رنگ میں کی اور آیات قرآنی سے ایسے اشارات ڈھونڈ نکالے جن سے ان کے مسلک اور وجد ان کی واردات کی تائید ہوتی ہے۔ محی الدین ابن عربی چونکہ وحدت الوجود کے مسلک کے علمبردار تھے لہٰذا انھوں نے پورے قرآن کو وحدت الوجود کے نظریہ کی تفسیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ ابو عبد الرحمٰن السلمی نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے۔

موجودہ دور چونکہ سائنسی دور کہلاتا ہے لہٰذا دور حاضر کے بعض نام نہاد

مفسرین نے قرآن کریم کو اپنی تفسیروں کے ذریعہ سائنس کی کتاب بنا کر پیش کیا ہے اور موجودہ دور کی تمام ایجادات مثلاً ریل، ہوائی جہاز، راکٹ، جوہری توانائی وغیرہ کو قرآن کریم میں ڈھونڈ نکالا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ایجادات قدیم مفسرین کے زمانہ میں منصۂ شہود پر نہیں آئی تھیں اس لیے وہ اپنی سمجھ اور تجربہ کے مطابق غلط تفسیریں کرتے رہے۔ اگر یہ ایجادیں اس زمانہ میں ہو چکی ہوتیں تو وہ بھی وہی کچھ کہتے جو ہم آج کہہ رہے ہیں۔ اس رنگ کی تفاسیر میں علامہ شورانی کی انعام یافتہ کتاب "سائنٹفک قرآن" بہت اہم ہے۔ غرض کتاب ہدایت کو جس کے نازل کرنے والے نے واضح طور پر فرما دیا ہے۔

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (البقرہ ۱ تا ۲)

اس کی طرح طرح سے تفسیریں کر کے اس انداز سے پیش کیا گیا کہ اصل مقصد نظروں سے اوجھل ہو گیا اور قرآن کریم بعض اور مضامین کی کتاب معلوم ہونے لگا۔ مفسرین کی اس روش کو دیکھ کر بعض علماء نے تفسیر کے کچھ اصول و ضوابط مقرر کیے اور اس طرح اصول تفسیر کے نام سے ایک مستقل فن وجود میں آ گیا۔ اس فن پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں دو کتابوں نے بڑی مقبولیت و شہرت حاصل کی۔ ایک علامہ جلال الدین سیوطی کی "الاتقان" اور دوسری شاہ ولی اللہ صاحب کی "فوز الکبیر"۔ الاتقان میں چونکہ متعدد قرآنی علوم شامل ہیں اس لیے ایک ضخیم کتاب بن گئی ہے۔ اس کے مقابلہ میں فوز الکبیر صرف اصول تفسیر سے متعلق ہے اس لیے نہایت مختصر ہے۔ لیکن اس اختصار کے باوجود اس فن پر جامع کتاب ہے۔

"فوز الکبیر" میں تفسیر کے اصولوں کو سمجھانے کے لیے بعض بنیادی امور

پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں سب سے پہلی چیز ان علوم پنجگانہ کا بیان ہے جنہیں قرآن مجید میں بطور نص کے بیان فرمایا گیا ہے۔ "علوم پنجگانہ سے مراد (۱) علم احکام (۲) علم مخاصمہ (۳) علم تذکیر بآلاء اللہ (۴) علم تذکیر بایّام اللہ (۵) علم تذکیر بموت ہے۔

ان علوم پنجگانہ کی کسی قدر وضاحت ذیل میں درج ہے۔

(۱) علم احکام — اس علم میں واجب، مندوب، مباح، مکروہ اور حرام امور شامل ہیں۔ ان امور کا تعلق عبادات، معاملات، تدبیر منزل اور سیاست مدن سب سے ہے۔ ان کی تفصیل بیان کرنے اور تشریح کرنے والے کو فقیہہ کہا جاتا ہے۔

(۲) علم مخاصمہ — اس علم کا مقصد یہود و نصاریٰ اور مشرکین و منافقین سے بحث اور مخاصمہ ہے۔ ان کی تشریح کرنے والے متکلمین کہلاتے ہیں۔

(۳) علم تذکیر بآلاء اللہ — اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور نشانیوں کا علم ہے۔ اس میں زمین و آسمان کی تخلیق، ان امور کی ذریعہ الہام کی تعلیم جن کا انسان محتاج اور ضرورت مند ہے اور اللہ تعالیٰ کے صفات کاملہ کا ذکر شامل ہے۔

(۴) علم تذکیر بایّام اللہ — اس علم میں ان تمام واقعات کا بیان شامل ہے جو اطاعت شعار بندوں کے انعام و اکرام اور نافرمان بندوں کی سزا و عقوبت کے سلسلہ میں پیش آئے۔

(۵) علم تذکیر بموت — یہ علم، موت اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات یعنی حشر و نشر اور دوزخ اور جنت سے متعلق ہے۔ ان واقعات کو بیان کر کے عبرت دلانے والا شخص واعظ کہلاتا ہے۔[1]

---

[1] فوز الکبیر فی اصول التفسیر، فتح الخبیر ناشر قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی ۱۳۸۳ھ ص ۱۱، ۱۲

علوم پنجگانہ کا یہ مختصر سا خاکہ بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب نے بڑے پتے کی بات یہ بتائی ہے کہ ان علوم کو بیان کرنے کے لیے قرآن میں قدیم عربوں کا انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ متاخرین عرب کا انداز بیان کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اختصار کے ساتھ احکام بیان کر دیے گئے ہیں اور قواعد کے غیر ضروری اصولوں سے بحث کر کے بیان کو طول نہیں دیا گیا۔ اسی طرح آیات مخاصمہ میں بھی مشہور مسلمات اور خطابیات کے اسلوب سے کام لیا گیا ہے۔ منطقی استدلال اور فلسفیانہ موشگافیوں کو کہیں نہیں برتا گیا۔ یہ نکات بیان کرنے سے شاہ صاحب کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ مفسرین کو قرآن کریم کی تفسیر میں وہی سادگی اختیار کرنی چاہیے جو قرآن کریم میں اختیار کی گئی ہے۔ نہ اسباب نزول میں بلا ضرورت قصہ کہانیوں کا سہارا پکڑنا چاہیے۔ نہ آیات مخاصمہ میں منطقی اور فلسفیانہ بحثوں میں پڑنا چاہیے اور نہ اسرائیلیات کو کام میں لانا چاہیے۔ قرآن صرف لوگوں کے نفسوں کی تہذیب اور ان کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی اصلاح کے لیے نازل ہوا ہے۔ لہٰذا مختلف قسم کی آیات کے اسباب نزول بھی مختلف ہیں۔ مثلاً

آیات مخاصمہ کے نزول کا سبب لوگوں کے عقائد باطلہ ہیں۔

آیات احکام کے نزول کا سبب لوگوں کے فاسد اعمال اور ان کے درمیان مظالم کا رواج عام ہے۔

آیات تذکیر کے نزول کا سبب یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی طرف سے بے توجہی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے انعامات، تعذیبی سانحات، موت اور بعد موت کے حالات کی طرف سے لاپروائی برتتے تھے۔

ان نکات کے پیش نظر مفسرین کے لیے ضروری ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے قصوں کی جزئیات اور تفصیلات بیان نہ کریں۔ اس لیے کہ ان کا مطالب

قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ بعض ایسی آیات ہیں جن میں کسی خاص واقعہ
کی طرف اشارہ موجود ہے خواہ وہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
عہد مبارک میں پیش آیا ہو یا آپؐ سے پہلے۔ ان آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں
ان کے متعلقہ واقعات بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان آیات کے
سننے والے پر جو انتظار کی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ اس کے بغیر دور نہیں
ہو سکتی۔ پھر بھی ضرورت اس امر کی ہے کہ ان علوم کی شرح اس انداز سے
کی جائے کہ جزوی اور ضمنی حکایات بیان کرنے کی ضرورت نہ رہے۔[2]

جیسا کہ سطور بالا میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے
آیات مخاصمات کے نزول کا سبب لوگوں کے عقائد باطلہ کو قرار دیا ہے۔
اور بتایا ہے کہ ان عقائد باطلہ کے حامل چار فرقے ہیں۔ مشرکین، منافقین،
یہود اور نصاریٰ۔ پھر ان سے مخاصمہ کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) ایک تو صرف ان کے باطل عقائد کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر ان کی
برائیاں واضح کی گئی ہیں اور ان کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے۔

(۲) دوسرے ان کے شبہات کو بیان کیا گیا ہے اور منطقی اور خطابی
دلیلوں سے ان کو رد کیا گیا ہے۔

مخاصمہ کی ان دو قسموں میں سے پہلے قسم کے ذیل میں سب سے پہلے
مشرکین کے عقائد باطلہ بہ حسب ذیل عنوانات کے تحت تفصیلی بحث
کی ہے۔

شعار ملت ابراہیمی۔ دین ابراہیم کے بنیادی عقائد اور مشرکین،
شرک، تشبیہ، تحریف، عقیدۂ رسالت و قیامت اور مشرکین، رسول کی
بعثت، شرک کا جواب، تشبیہ کا جواب۔ تحریف کا جواب۔ حشر و نشر کو محال

۲۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ص ۱۳ تا ۱۴

سمجھنے کا جواب، رسالت کے متعلق شبہات کا جواب، جوابوں کی تکرار، دوسرے
نمبر پر یہودیوں کی حالت کو زیر بحث لایا گیا ہے اور ان کے عقائد پر درج
ذیل عنوانات کے تحت بحث کی گئی ہے۔ تورات میں تحریف۔ تحریف معنوی
کا انداز۔ قرآن کی وضاحت۔ کتمان آیات۔ افتراء کی حقیقت۔ مباہلہ کی
حقیقت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ کی رسالت میں ان کے شبہات اور ان کی حقیقت۔
رسول کے فرائض اور ان کی حدود۔ شریعتوں میں اختلاف اور ان کی
حقیقت۔ یہودی علماء کا نمونہ۔ تیسرے نمبر پر عیسائیوں کو لیا ہے۔ اور ان کے
عقائد کی تفصیل مندرجہ ذیل عقائد کے تحت بتائی ہے۔

عیسائی اور ان کے عقائد۔ پہلے اشکال کا جواب۔ دوسرے اشکال کا
جواب۔ قرآن کا فیصلہ۔ عیسائیوں کا نمونہ۔ ایک دوسری گمراہی اور اس کا
ازالہ۔ ایک اور غلط فہمی اور اس کا ازالہ۔

سب سے آخر میں منافقین کے گروہ کو لیا ہے اور حسب ذیل عنوانات
کے تحت ان کے عقائد کی تفصیلات بتائی ہیں۔

منافقین کا گروہ اور ان کے عقائد۔ منافقین کا پہلا گروہ۔ منافقین
کا دوسرا گروہ۔ منافقین کے شبہات اور ان کے اسباب۔ منافقین کے کچھ
اور ساتھی۔ نفاق کی قسمیں۔ منافقین کا نمونہ۔ منافقین کا ایک اور نمونہ۔

اس کے بعد علوم پنجگانہ کے بقیہ مباحث کے تحت تذکیر بآلاء اللہ،
تذکیر بایام اللہ اور تذکیر بموت پر نہایت مختصر الفاظ میں بحث کی ہے
اور بتایا کہ "چونکہ قرآن مجید تمام لوگوں کی تہذیب اور اصلاح نفوس کے لیے
نازل ہوا ہے۔ اس میں عربی و عجمی یا شہری و دیہاتی، کسی کا کوئی امتیاز نہیں
لہٰذا حکمت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی یاد دہانی کے سلسلہ
میں صرف انہیں امور کا تذکرہ کیا جائے جن سے عوام الناس کی اکثریت واقف

ہو۔ چنانچہ آلَآءِ اللہ کے سلسلہ میں بحث و جستجو کو قرآن میں صرف اسی حد تک اندر محدود رکھا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے بارے میں اسی انداز سے گفتگو کی گئی ہے جیسے معمولی قسم کی فطری فہم اور ذہانت سے سمجھ لیا جائے۔ اور اس سلسلہ میں علم کلام کی مہارت اور حکمتِ الٰہیہ کے مطالعہ کی عادت کی ضرورت پیش نہ آئے۔

یہ اصول بتانے کے بعد شاہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ جہاں تک وجود باری تعالیٰ کا تعلق ہے اس سے کسی بھی اعتدال پسند ملک کے باشندے کبھی انکاری نہیں رہے البتہ صفات باری تعالیٰ کے سلسلہ میں بہت سی قومیں گمراہی میں مبتلا رہیں اور اب بھی ہیں۔ ان میں سے جن صفات کو انسان آسانی سے سمجھ سکتا ہے ان کے بارے میں قرآن کریم نے عام فہم انداز میں سمجھا کر کسی دوسرے کو ان صفات میں شریک کرنے کی گمراہی سے بچنے کی ہدایت کی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسی کوئی چیز بھی موجودات میں نہیں ہے۔ "لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ" اس لیے اس کی ذات اور صفات کو کسی متنفس کے لیے دیکھنا یا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی تھوڑی بہت معرفت اسکی نشانیوں سے ہو سکتی ہے اور یہ نشانیاں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔ ان بے شمار نشانیوں میں بھی قرآن نے صرف ان چند نشانیوں کا حوالہ دیا ہے جن کا مشاہدہ عام آدمی کرتا ہے یا کر سکتا ہے۔ جیسے زمین اور آسمان کی وسعتوں کا۔ بادلوں سے پانی کے برسنے کا۔ نہروں اور دریاؤں کے زمین پر جاری ہونے کا۔ اور پانی سے طرح طرح کے پھلوں، پھولوں اور بیجوں کے پیدا ہونے کا۔

تذکیر بِاَیَّامِ اللہ کے سلسلہ میں بھی صرف ان قوموں، اشخاص اور تاریخی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے قرآن کے مخاطب اول یعنی عربوں کی واقفیت تھی۔ جیسے حضرت آدم کی تخلیق، حضرت ابراہیم اور انبیاء بنی اسرائیل

کے مشہور واقعات، ابلیس کی سرکشی، قوم نوحؑ، قوم عادؑ، قوم ثمودؑ کی گمراہیوں کے تذکرے۔ لیکن پورے پورے قصے بیان نہیں کیے گئے تاکہ سننے والے ان سے متاثر ہونے کی بجائے داستانوں کی دلچسپیوں میں گم ہو کر نہ رہ جائیں۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"ان قصص و حکایات کے بیان کا مقصد قصہ گوئی یا لوگوں کو اصل قصہ سے آگاہ کرنا نہیں ہے بلکہ ان قصوں کے ذکر کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی جائے کہ شرک اور نافرمانی کا کتنا دردناک انجام ہوتا ہے اور ان لوگوں پر کس طرح عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے اور انہیں اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخلص اور اطاعت گزار بندوں کی ہمیشہ نصرت اور حمایت کرتا ہے۔"

علم تذکیر بموت میں قرآن کریم موت اور موت کے بعد کے واقعات بیان کرتا ہے۔ جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی تکلیفوں کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن چونکہ انسان اپنی حیات دنیوی میں ان کی شدت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے قرآن دنیاوی چیزوں کی مثالیں دے کر اس کو سمجھاتا ہے۔ علامات قیامت میں نزول مسیح، دجال اور یاجوج ماجوج کا تھوڑا سا ذکر کر دیتا ہے۔

اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ احکام قرآنی کے بنیادی نکات بتاتے ہیں۔ اول یہ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دین ابراہیم کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوئے تھے اس لیے اسلام میں ابراہیمی شریعت کو باقی رکھا گیا۔ البتہ تعمیم کی جگہ تخصیص کر دی گئی اور حدود میں اضافہ کر دیا گیا۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اہل عرب کو ہدایت دی جائے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ اسلامی شریعت کی بنیاد

عربوں کے رسوم و رواج پر رکھی جائے۔ اور تمام گمراہیوں کو دور کرنے
اور اصلاح احوال کرنے کے لیے قرآن کو راہ نما بنایا جائے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن میں ارکان و احکام اسلام کو مجملاً بیان
کیا گیا ہے۔ آنحضرت نے ان کی تفصیلات بتائیں۔ مثلاً قرآن کریم میں متعدد
مقامات پر اور نہایت تاکید کے ساتھ حکم دیا ہے۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی روشنی میں مساجد کی تعمیر، نماز باجماعت
اور اوقات نماز کے احکام مرتب کیے۔ اور زکوٰۃ کے مسائل کی تفصیلات بیان
فرمائیں۔ قرآن کی مختلف سورتوں میں مختلف امور کے لیے الگ الگ احکام
آئے ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں روزے اور حج کے، سورۃ بقرہ، سورۃ انفال
اور بعض اور مقامات پر جہاد کا حکم، حدود کا ذکر۔ سورۃ مائدہ اور سورۃ
نور میں ہے، میراث کا ذکر سورۃ نساء میں اور نکاح اور طلاق کے مسائل سورۃ
بقرہ اور سورہ نساء اور سورہ طلاق میں ہیں۔

ان مسائل و احکام کے علاوہ وہ سوالات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے وقتاً فوقتاً کیے گئے اور قرآن کریم نے ان کے حل اور جواب پیش کیے۔
مثلاً یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّۃِ (البقرہ ۱۸۹) (اے نبی لوگ تم سے چاند کی
گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں) یا یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ
(البقرہ ۲۱۵) (لوگ پوچھتے ہیں، ہم کیا خرچ کریں) یا یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الشَّھْرِ
الْحَرَامِ (البقرہ ۲۱۷) (لوگ پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے) ان کے
علاوہ ایسے واقعات بھی ہیں جن سے مومنین کے ایثار و قربانی اور منافقین
کی خود بینی اور بخل کا پتہ چلتا ہے۔ اس طرح کے حالات بھی پیش آئے جب
مسلمانوں کو زجر و تنبیہ کی گئی یا تعریفاً و اشارتاً کچھ کہا گیا۔ بعض مواقع پر
امر یا نہی کی ضرورت لاحق ہوئی اور اس سلسلہ میں آیات نازل ہوئیں۔ نیز

غزوات النبیؐ، مسجد ضرار اور اسریٰ کے بارے میں بھی قرآن حکیم میں حوالہ جات
اور تذکرے موجود ہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک باب میں فہم قرآن میں
پیش آنے والی دشواریوں کے اسباب سے بحث کر کے ان کے حل بتائے ہیں۔
پھر قرآن مجید کے غریب الفاظ کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ ان کی بہترین شرح
وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ابن ابی طلحہؓ سے نقل کی ہے۔ اس
سلسلے میں ایک اہم مسئلہ ناسخ و منسوخ کا ہے۔ مفسرین نے اس سلسلہ کو
بہت بڑھا دیا تھا، حضرت شاہ صاحب نے ان کو گھٹا کر صرف پانچ آیتوں
تک محدود کر دیا ہے۔ اس سے بہت سی الجھنیں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس حد بندی
سے یہ مسئلہ بہت آسان ہو گیا۔

ناسخ و منسوخ آیات کی تعین کے سلسلہ میں جو الجھن پیش آئی شاہ
ولی اللہ صاحب اس کا سبب مفسرین و متاخرین کی اصطلاحات کے
اختلافات کو قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک متقدمین نے نسخ کے لفظ
کو جن مختلف مواقع پر استعمال کیا ہے اگر ان سب اختلافات کو سامنے
رکھا جائے تو منسوخ آیات کی تعداد پانچ سو سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ متاخرین
نے نسخ کے لفظ کو جس معنی میں استعمال کیا ہے اس اعتبار سے منسوخ
آیات کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے منسوخ شدہ
آیات کو بیان کرنے میں ابن عربیؒ کا اتباع کیا ہے۔ انہوں نے ان کی تعداد کو گھٹا کر
بہت کم کر دیا ہے۔ شاہ صاحب اس میں مزید کمی کر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک پانچ سے زیادہ آیات کا منسوخ ہونا ثابت نہیں ہے۔"

فہم قرآن اور تفسیر میں دوسری دشواری شاہ صاحب کے نزدیک اسباب
نزول کی معرفت ہے۔ یعنی صحیح طریقہ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ کون سی آیت کب

اور کس موقع پر نازل ہوئی۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے شاہ صاحب مفسرین کو ان کی ذمہ داری سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"مفسر کے لیے صرف دو چیزوں کا علم ضروری ہے۔ ایک تو وہ واقعات جن کی طرف آیات میں اشارہ کیا گیا ہو کیونکہ ان آیات کا صحیح مفہوم سمجھنا بغیر ان واقعات کے علم کے ناممکن ہے۔ دوسرے وہ واقعات جن کی وجہ سے کسی عام حکم میں کسی طرح کی تخصیص ہوئی ہو یا جو آیات کے مفہوم میں تبدیلی کر دیتے ہوں اور انہیں ظاہری مفہوم کی طرف سے کسی دوسری طرف موڑ دیتے ہوں۔ کیونکہ ان واقعات کے علم کے بغیر بھی آیات کا صحیح مفہوم اور مقصد متعین کرنا ناممکن ہے۔ ان دونوں قسم کے واقعات کے علاوہ بقیہ تمام چیزیں مفسر کے لیے غیر ضروری ہیں۔"

جن چیزوں کو شاہ صاحب نے مفسرین کے لیے غیر ضروری بتایا ہے ان میں دو بہت اہم ہیں۔ اول اسرائیلیات دوم مشرکین و یہود کے عقائد اور عادات و رسومات۔ اسرائیلیات میں انبیاء علیہم السلام کے وہ قصے اور واقعات شامل ہیں جو اہلِ کتاب سے منقول ہیں اور عموماً مشتبہ اور غیر یقینی ہیں۔ ان کے بارے میں شاہ صاحب نے بخاری کی یہ روایت بیان کی ہے کہ "نہ تو ہم ان کی تصدیق کریں اور نہ تکذیب کریں۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہمیں اہلِ کتاب کے بیان کیے ہوئے قصوں کی طرف توجہ ہی نہ دینا چاہیے۔

عادات و رسوم جاہلیت کے بارے میں یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین تو ان واقعات کو اس لیے بیان کرتے تھے کہ وہ قرآن کی آیتوں میں بیان کیے جانے والے حقائق اور کلیات کی سچی تصویر ہوا کرتے تھے ان کا مقصد قصہ بیان کرنا نہیں ہوتا تھا۔ بعد کے مفسرین کے لیے ان واقعات کی وہ حیثیت

نہیں رہی۔ اس لیے اگر ان کے بیان کرنے پر زیادہ توجہ صرف کی گئی تو مقصودِ اعلیٰ آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا اور ذہن قصہ کہانی میں الجھ کر رہ جائے گا۔ اس لیے ان واقعات کی جزئیات و تفصیلات بیان کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

ان امور سے آگاہ کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحب مفسر کو حسب ذیل دو باتوں کا مشورہ دیتے ہیں۔

(۱) ایسے غزوات اور واقعات جن کی طرف آیات میں اشارہ موجود ہو اور ان آیات کے مفہوم سمجھنے کا انحصار ان واقعات کے علم پر ہو انہیں بیان کر دے۔

(۲) اگر آیات میں کوئی قید یا شرط ہو یا کسی خاص نکتہ پر زور دیا گیا ہو جن کا سمجھنا شانِ نزول کے علم پر موقوف ہو تو ان آیات کی تفسیر لکھتے وقت شانِ نزول بھی بیان کر دے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے بعض ان احکام، اشارات اور واقعات کی توجیہہ کی مثالیں پیش کی ہیں جو عام آدمی کی فہم سے ماوراء نہیں۔ لہٰذا مفسر کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان توجیہات پر عبور رکھتا ہو اور موقع مناسب پر انہیں پیش کر سکے۔ مثلاً ذیل کی آیت میں:

يَٰأُخْتَ هَٰرُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا (مریم ۲۷ تا ۲۸)

اشارہ حضرت مریم علیہا السلام کی طرف ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے بعد اہلِ فلسطین نے ان کو اس خطاب سے مخاطب کیا تھا۔ اب اگر مفسر یہ وضاحت نہ کرے کہ جن "ہارون" کا اس آیت میں ذکر ہے وہ حضرت

موسیٰؑ کے بھائی حضرت ہارون نہیں ہیں بلکہ یہ حضرت مریم کے ہم عصر کوئی دوسرے ہارون ہیں تو ایک عام آدمی اس الجھن میں پڑ جائے گا کہ حضرت مریم جو حضرت عیسیٰؑ کی والدہ تھیں حضرت ہارون کی بہن کیسے ہو گئیں جب کہ حضرت ہارون ان سے تقریباً ساڑھے بارہ سو سال پہلے گزر چکے تھے۔

اسی سلسلہ میں شاہ صاحب نے بعض اور مباحث دیے ہیں جن کا تعلق قواعد زبان سے ہے مثلاً حذف، ابدال، انتشار ضمیر، انتشار آیات وغیرہ۔ ان سب کی وضاحت انہوں نے متعلقہ آیات کی مدد سے کی ہے پھر آیات محکمات اور متشابہات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ قرآن کا نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے کیونکہ سورہ آل عمران میں دونوں قسم کی آیات کا ذکر خاص طور پر ہوا ہے۔

هُوَ الَّذِیٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ
هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ
قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ
الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ
اِلَّا اللّٰهُ ؔ (آل عمران ۷)

(ترجمہ: اے نبیؐ وہی خدا ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں: ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں۔ اور دوسری متشابہات۔ جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کے معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

"محکم آیات سے مراد وہ آیات ہیں جن کے مفہوم کے متعلق عربی زبان کے ماہر شخص کو کسی قسم کا تردد یا تذبذب نہ ہو اور ان کا صاف و صریح مفہوم کے سوا کوئی دوسرا مفہوم ہو ہی نہ سکے ——— زبان دانی اور مہارت کا معیار البتہ قدیم اہل عرب ہیں۔ اس زمانہ کے وہ نکتہ سنج نہیں جو اپنی بے محل موشگافیوں اور قیاس آرائیوں کی بدولت محکم کو متشابہ اور صاف واضح آیات کو گنجلک اور مبہم بنا دیتے ہیں۔ اور سامنے کی باتیں بھی بعید از فہم معلوم ہونے لگتی ہے۔"

"متشابہ آیات سے وہ آیات مراد ہیں جن کے بیک وقت دو معنی مراد لیے جا سکتے ہوں اور بظاہر کوئی ایسا قرینہ موجود نہ ہو جس سے کسی ایک معنی کے حق میں فیصلہ کیا جا سکتا ہو۔ اس کے احتمالات کی وجوہ مختلف ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک ہی ضمیر بیک وقت دو مختلف اسموں سے متعلق ہو سکتی ہے۔ کسی آیت میں کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہو جس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور دونوں معانی کی حیثیت مساوی ہو۔ کبھی جملہ میں کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہو جس کا دو مختلف کلمات پر عطف ہو سکتا ہو۔ وغیرہ"

متشابہات ہی کے ذیل میں کنایہ، تعریض، مجاز عقلی اور حروف مقطعات بھی آ جاتے ہیں۔ جیسے الٓمٓ۔ الٓرٰ۔ طٰہٰ۔ طٰسٓمٓ۔ حٰمٓ۔ یٰسٓ وغیرہ یوں تو قرآن کریم ہر اعتبار سے ہی ایک معجزہ ہے تاہم اپنی فصاحت و بلاغت اور لفظی اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے تو اس کو دنیا کا عظیم ترین معجزہ قرار دینا پڑتا ہے۔ جس قوم میں یہ کتاب نازل ہوئی اس کو اپنی زبان دانی پر اس قدر ناز تھا کہ وہ اپنے سوا اقوام عالم کو عجمی یعنی گونگا کہتی تھی۔ اس

قوم کے ایک ایک فرد کو اس کتاب نے چیلنج دیا کہ اگر تم میں کچھ صلاحیت ہے تو اس کلام کے مقابلہ میں صرف ایک آیت ہی کہہ کر لے آؤ۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ تم ہرگز اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکو گے۔ واقعی کسی نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا اور نہ کسی نے اس کے جواب میں لکھنے کی جرأت کی۔ قرآن کا یہ دعویٰ اور چیلنج آج تک قائم ہے۔

قرآن کریم کی ایک خوبی اس کے مختلف اسالیب بیان بھی ہیں۔ دنیا کی کوئی کتاب بھی اٹھا کر دیکھ لیجیے اتنے مختلف اسالیب کہیں نظر نہیں آئیں گے۔ کون سا اندازِ بیان ہے جو اس میں اختیار نہیں کیا گیا۔ کہیں عالمانہ انداز ہے کہیں شاعرانہ اور کہیں خطیبانہ، کہیں نثر عاری کے نمونے ہیں کہیں مسجع و مقفیٰ عبارتیں ہیں۔ کہیں سلیس انداز ہے کہیں دقیق۔ کہیں سادہ ہے کہیں رنگین۔ غرض جو نمونے اس میں پیش ہوئے ہیں وہ اس بات کی بیّن دلیل ہیں کہ یہ کسی فانی مخلوق کا کلام نہیں ہے بلکہ کسی قادرِ مطلق ہستی کی تجلّیات کا نمونہ ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ جس ہستی کا یہ کلام ہے اس نے اپنا کمالِ فن دکھانے کے لیے یہ نمونے پیش نہیں کیے بلکہ ان کا غرور توڑنے کے لیے جن پر ان کو سب سے زیادہ ناز تھا۔ اور اس کو اسی چیز سے لاجواب کر دیا ہے جس پر اس کو سب سے زیادہ ناز تھا۔

بہرحال ایک مفسر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ قرآن کی ان خوبیوں سے بھی کماحقہٗ واقفیت رکھتا ہو تاکہ وہ قارئین میں قرآن فہمی کا صحیح ذوق پیدا کر سکے۔

"اَلْفَوْزُ الْکَبِیْر" سے تفسیر کے یہ اصول بیان کر دینے کے حسب ذیل مقاصد ہیں۔

(۱) مفسر کی کیا کیا ذمہ داریاں ہیں اور ان ذمہ داریوں سے

عہدہ برا ہونے کے لیے اس میں کتنی وسیع النظری سے کام لینا پڑتا ہے اور کن کن باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

(۲) چونکہ اردو زبان میں تقریباً تمام تفسیریں "الفوز الکبیر" کی تصنیف کے بعد لکھی گئیں اس لیے قدرتی طور پر ان تفاسیر کے لکھنے والوں نے کسی نہ کسی حد تک ان اصولوں کو جو اس کتاب میں بیان ہوئے ہیں، اپنے سامنے رکھا۔

(۳) اردو تفاسیر کا جائزہ لیتے وقت ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مفسرین نے اپنی ذمہ داریوں کو کس حد تک پورا کیا ہے۔ اور کون سی تفسیر زیادہ مفید ہے اور کون سی کم۔

اردو میں تفسیر نویسی کا آغاز اور اردو تفاسیر کا

انفرادی جائزہ

جیسا کہ صدر میں لکھا جا چکا ہے، برصغیر میں دورِ مغلیہ سے پہلے فقہ اور تصوّف کی جانب علماء کی توجہ زیادہ رہی اور خالص علوم شرعیہ بالخصوص تفسیر اور حدیث سے بہت کم اعتنا کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی اور فارسی میں تفسیریں بہت بعد میں لکھی جانی شروع ہوئیں۔ سب سے پہلے اس طرف توجہ مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی ہوئی۔ پھر شاہ عبدالرحیم نے کچھ کام کیا لیکن باقاعدہ اس کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں ہوا۔ انہوں نے بڑے پیمانہ پر قرآن، تفسیر اور حدیث اور ان سے متعلقہ علوم کی تدریس کی اور ان موضوعات پر تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ انہوں نے تفسیر کے اصول

بھی نہایت وضاحت سے بتائے۔ لیکن ان کی جملہ تصانیف عربی اور فارسی میں ہیں۔ تاہم ان کے صاحبزادگان اور متبعین نے ان علوم کو اردو میں بھی پیش کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا اور اردو زبان کا دامن پھیلتا چلا گیا۔ خوش قسمتی سے قرآن شریف کے اردو تراجم اور تفاسیر اس کثرت سے ہوئیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ زبان اس معاملہ میں عربی کے سوا دنیا کی تمام زبانوں سے گوئے سبقت لے گئی۔ اور اب بھی اس میں جس تیزی سے اضافے ہو رہے ہیں اس کی مثال دنیا کی کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی۔ تفسیریں براہِ راست اردو میں لکھی بھی جا رہی ہیں اور دوسری زبانوں خاص کر عربی سے ترجمے بھی ہو رہے ہیں۔ یہ تفسیریں جزوی بھی ہیں اور پورے قرآن کی بھی۔ تاہم ان سب کا جائزہ لینے کے لیے ان کی دو قسمیں کی جانی مناسب رہیں گی (۱) براہِ راست اردو میں لکھی جانے والی تفاسیر (۲) ترجمے۔

براہِ راست اردو میں لکھی جانے والی تفاسیر

اردو میں تفسیر نویسی کا آغاز کب ہوا۔ اس کا پتہ چلانا تو مشکل ہے البتہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تحقیق کے بموجب سب سے قدیم نمونہ سورۂ یوسف کی تفسیر ہے جو پرانی گجراتی اردو میں ہے۔ مگر چونکہ جو نسخہ بابائے اردو کو ملا وہ ناقص الطرفین تھا اس لیے اس کے زمانہ کا تعین مشکل ہے۔ تاہم بعض قیاسیات کی بنیاد پر اس کو گیارھویں صدی کے نصف آخر کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد تفسیر قرآن مجید از سورۂ مریم تا آخر آتا ہے مگر اس میں بھی نہ مصنف کا نام دیا گیا ہے اور نہ سنہ تصنیف۔ تاہم زبان و بیان پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ بارھویں صدی ہجری کا ابتدائی حصہ ہے۔

اردو میں تفسیر نویسی کا صحیح معنوں میں ارتقاء اس وقت سے ہوا جب اورنگ زیب نے گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں کو ختم کر کے اورنگ آباد میں قیام کیا اور اس شہر نے کچھ عرصہ کے لیے سلطنتِ مغلیہ کے دارالحکومت کی سی شکل اختیار کر لی۔ اس کے بعد شمالی ہند اور دکن کے باشندوں کے اختلاط سے اردو زبان میں ایک گونہ نکھار پیدا ہوا۔ اور وہی چیز جو بقول قائمؔ چاندپوری:

"اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی" منجھ منجھا کر اردو کے قالب میں ڈھل گئی۔ اصناف شاعری میں بھی بہ اعتبار زبان حسن و دلکشی پیدا ہو گئی۔ اور نثر میں بھی لطف و شگفتگی دکھائی دینے لگی۔ اسی صورت میں تفسیر نویسی میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی۔ پھر جب اورنگ زیب کی وفات کے بعد دارالحکومت دوبارہ دہلی منتقل ہوا تو زبان میں مزید شستگی پیدا ہوتی گئی۔ اور آخر ش اس نے اردوئے معلیٰ کی شکل اختیار کر لی۔ اس پورے دور میں جو تفسیریں لکھی گئیں ان کے مصنفین کے نام اور ان کی تصنیف کے سنین بھی عام طور پر معلوم نہیں۔ یہاں ترتیب وار اس زمانہ کی تفسیروں کے نام درج کیے جاتے ہیں:

(۱) تفسیر سورہ ہود و سورہ الحجر (۲) تفسیر قرآن منسوبہ شاہ مخدوم حسینی (۳) تفسیر سورہ بنی اسرائیل و کہف (۴) تفسیر مرادی از شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی ۱۱۸۵ھ (۵) تفسیر مرتضوی از شاہ غلام مرتضیٰ جنوری ۱۱۹۴ھ۔

شاہ رفیع الدین دہلوی کے زمانہ سے قرآن کریم کے تراجم و تفاسیر کا ایک دوسرا دور شروع ہوا۔ جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک ممتد ہے۔ اس دور میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے اثر سے اردو نثر نگاری کا رواج عام ہو گیا جس کی وجہ سے اس زمانہ میں کافی تعداد میں تفسیریں لکھی گئیں۔ ان میں سے

بعض تفاسیر کے نام ذیل میں درج ہیں۔

(۱) تفسیر موضح القرآن، از شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (۲) تفسیر قرآنی موسومہ حقانی، از سید شاہ حقانی بیرہ سید شاہ برکت اللّٰہ ۱۲۰۶ھ (۳) تفسیر قرآن، از حکیم محمد شریف خاں دہلوی (۴) تفسیر سُورَۃُ فَاتِحَہ، از حضرت سید احمد شہید (۵) تفسیر مجددی المعروف بہ روفی، از شاہ رؤف احمد ۱۲۴۹ھ (۶) تفسیر پارہ عَمَّ (۷) تفسیر قرآن مجید جو پارہ عم کی تفسیر ہے۔ (۸) تفسیر تنزیل یا فوائد البدیعہ از سید بابا قادری حیدر آبادی (۹) تفسیر اِذَا جَاءَ از امین الدین (۱۰) کتاب الحمد یا تفسیر تشریح، از مولوی میر شجاع الدین (۱۱) زاد الآخرۃ (منظوم) تفسیر قرآن قاضی عبدالسلام بدایونی ۱۲۴۴ھ (۱۲) تفسیر سورۃ یوسف، از حکیم محمد اشرف کاندھلہ ۱۲۶۴ھ۔

بیسویں صدی عیسوی میں دیگر علوم و فنون کی طرح قرآن کی تفسیریں بھی بہت بڑی تعداد میں اور نہایت شرح و بسط سے لکھی گئیں۔ چونکہ اس صدی میں حضرت شاہ ولی اللّٰہ صاحب کا ذہنی طور پر اثر بہت بڑھا ہوا تھا اس لیے شاہ صاحب نے فوز الکبیر میں جو اصولِ تفسیر بتائے ان کا خاص طور پر خیال رکھا گیا اور انہوں نے ہی جو خطوط قائم کر دیے تھے انہیں پر کام ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ دورِ جدید میں جو ذہنی تبدیلی ہوئی ہے اور جس طرح کی سوچ نے جنم لیا ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفسرین کو بھی اسی کے مطابق اندازِ بیان اور طرزِ استدلال کو اختیار کرنا پڑا۔ مثلاً اگر پہلے فلسفیانہ اور منطقیانہ طرز اختیار کیا جاتا تھا تو اب سائنس کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر کئی مفسرین نے سائنسی طرز اختیار کیا ہے۔ اور قرآن میں جو سائنسی مسائل ضمناً آ گئے ہیں جدید ذہن کو مطمئن و متاثر کرنے کیلیے

ان مسائل کو سائنسی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً

اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَہَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ

(الرعد۔ آیۃ ۲)

(ترجمہ) وہ اللّٰہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں۔ پھر وہ اپنے تخت پر جلوہ فرما ہوا اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند کیا۔

اس کی تفسیر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اس طرح فرمائی ہے۔

"بہ الفاظ دیگر آسمانوں کو غیر محسوس اور غیر مرئی سہاروں پر قائم کیا۔ بظاہر کوئی چیز فضائے بسیط میں ایسی نہیں ہے جو ان بے حد و بے حساب اجرام فلکی کو تھامے ہوئے ہو۔ مگر ایک غیر محسوس طاقت ہے (یعنی کشش باہمی) جو ہر ایک کو اس کے مقام اور مدار پر روکے ہوئے ہے اور ان عظیم الشان اجسام کو زمین پر یا ایک دوسرے پر گرنے نہیں دیتی۔"

لیکن بعض جدت پسند یا انتہا پسند حضرات نے اس انداز کو اتنا بڑھایا ہے کہ بعض آیات کو زبردستی سائنسی مسائل پر منطبق کرنے کی کوشش کی اور قرآن کریم سے موجودہ دور کی بعض ایجادات کی پیشگوئی کرا دی۔

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۚ

(الرحمٰن ۳۳)

ترجمہ:۔ اے گروہ جن و انس اگر تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں

سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔ نہیں بھاگ سکتے
اس کے لیے بڑی قوت کی ضرورت ہے۔

اس بیان کی تفسیر ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں۔ "اس بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ یہ آیت اس امکان کو ظاہر کرتی ہے کہ ایک دن انسان وہ مقصد حاصل کرے گا جس کو آج ہم (غالباً غیر موزوں طریقہ پر) "خلا کی تسخیر" کا نام دیتے ہیں۔"

سچ پوچھیے تو یہ آیت اس امکان کی نفی کرتی ہے۔

بعض مفسرین نے تو انتہا کر دی ہے کہ اس آخری اور جامع کتاب کی پوری تفسیر ہی اس انداز سے کر ڈالی کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر ایک تصنیف معلوم ہونے لگی ہے۔ جیسے سائنٹیفک روشن خیال (؟) مرتب کی تحقیقات اس سے ظاہر ہے۔

بعض حضرات کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ جب شمس و قمر، ارض و سماوات اور لیل و نہار کے مسخر ہونے کے اشارے قرآن کریم میں موجود ہیں پھر تسخیر کائنات کی مخالفت کیسے کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ حضرات ان آیات کے معنی پر غور کریں تو پتہ چل جائے گا کہ ہر جگہ تسخیر کا فاعل اللہ تعالیٰ نے خود کو قرار دیا ہے اور کسی ایک مقام پر بھی انسان کو حکم نہیں دیا گیا کہ وہ کائنات کو یا شمس و قمر کو تسخیر کرے۔ چنانچہ قرآن میں ۱۶ جگہ "سَخَّرَ" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں اس نے مسخر کر دیا۔ اس نے تابع کر دیا۔ اس نے بس میں کر دیا، اور "اس نے" سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ۳ مقام پر سَخَّرْنَا کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں ہم نے مسخر کر دیا۔ ہم نے تابع کر دیا۔ ایک جگہ لفظ "سَخَّرْنٰهَا" وارد ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں، ہم نے اسکو مسخر کر دیا۔ ہم نے اس کو تابع کر دیا۔ ذیل میں چند آیات درج کی جاتی ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی (الرعد آیۃ ۲)

ترجمہ:- وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں، پھر وہ اپنے تخت پر جلوہ فرما ہوا۔ اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو مسخر کیا۔ اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقت مقرر تک کے لیے چل رہی ہے۔

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ وَكُنَّا فٰعِلِیْنَ
(ترجمہ:-) (الانبیاء آیۃ ۷۹)

(ترجمہ) داؤد کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے۔ اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے۔

واضح رہے کہ اس آیت کریمہ میں وَكُنَّا فٰعِلِیْنَ کہہ کر اللہ نے انسان کو اس غلط فہمی سے بھی بچا لیا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ میں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے"۔

كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (الحج آیۃ ۳۶)

(ترجمہ) ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ کائنات تو بڑی چیز ہے، انسان تو جانوروں کو بھی قابو میں نہیں کر سکتا۔ ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے فضل و کرم سے انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ تاکہ وہ ان سے اپنی حیات دنیوی میں مختلف کام لے سکے۔ جہاں تک انسان کے عجز کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے آیت میں انسی سے اپنے اس عجز کا اعتراف کرا دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ ۝ لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ (الزخرف آیۃ ۱۲ تا ۱۴)

(ترجمہ) اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا تاکہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے

بات کو زیادہ طول نہ دے کر یہ بتا دینا کافی ہے کہ جن لوگوں نے فلکیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس وقت ہی کائنات کی وسعت اتنی ہے کہ ہزاروں سال تک جد و جہد کرنے کے بعد بھی آج تک انسان کو اسکا علم نہیں ہو سکا۔ پھر یہ کائنات ایک حالت میں قائم بھی نہیں ہے۔ بلکہ بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اس صورت حال کے پیشِ نظر یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ انسان کائنات کی وسعتوں کا علم کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتا، اس کو تسخیر کرنے کا تو سوال ہی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو خلافتِ ارضی عطا فرمائی تھی۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ کرہ ارض پر اس کا بندہ بن کر رہے اور کائنات کی تسخیر کے چکر میں نہ پڑے۔ اس ذات واحد نے جو چیز جس کام کے لیے بنائی ہے اس سے وہ کام لے۔

بہرحال ان باتوں سے صرف نظر کر کے بیسویں صدی میں لکھی جانیوالی تفاسیر کی فہرست دی جاتی ہے۔ وَھُوَ ھٰذَا

(۱) تفسیر فتح المنان معروف بہ تفسیر حقانی (۱۳۰۵ھ - ۱۳۲۸ھ) (محمد عبد الحق دہلوی)

(۲) تفسیر بیان القرآن (۱۳۳۰ھ - ۱۳۳۵ھ) (مولانا اشرف علی تھانوی)

(۳) تفسیر قادری (۱۳۱۹ھ) (کشف القلوب) مولانا محمد الحسینی)

(۴) احسن التفاسیر (۱۳۲۵ھ) (مولانا سید امجد حسین)

(۵) معارف القرآن (مفتی محمد شفیع دیوبندی)

(۶) تفہیم القرآن (مولانا ابو الاعلیٰ مودودی)

(۷) فیوض القرآن ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی

(۸) القرآن الحکیم مع ترجمہ و تفسیر (مولانا عبد الماجد دریا بادی)

(۹) تفسیر جواہر القرآن (مولانا غلام اللہ خاں)

(۱۰) خزائن العرفان فی تفسیر القرآن (مولانا سید محمد نعیم الدین)

(۱۱) تدبر قرآن (مولانا امین احسن اصلاحی)

عربی تفاسیر کے اردو ترجمے

(۱) تفسیر ابن جریر (پہلا پارہ) بیت الحکمت دیوبند۔

(۲) تفسیر عزیزی موسوم بہ تفسیر فتح العزیز۔ سورہ بقرہ حصہ اول ایچ۔ ایم سعید کمپنی۔

(۳) انوار الرحمٰن ترجمہ و تفسیر آل عمران۔ ترجمہ عبد الصمد۔ ادارہ [illegible]

(۴) لسان التفاسیر اردو ترجمہ تفسیر فتح العزیز (فاتحہ و بقرہ) مترجم مولانا محمد علی چاندپوری، مطبع فاخری۔ دہلی۔

(۵) ترجمہ تفسیر ابن عباس۔ ترجمہ تنویر المقیاس فی تفسیر ابن عباس مرتبہ علامہ مجد الدین شیرازی۔ مترجم مفتی محمد رمضان اکبرآبادی شاگرد مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی۔ امیر الدین گلشن ہند۔ آگرہ۔

(۶) ترجمہ تفسیر احمد (تالیف شیخ احمد عرف ملا جیون امیٹھوی المتوفی ۱۱۳۰ھ) ترجمہ از حکیم سید امیر حسن خان سہا۔

(۷) ترجمہ تفسیر ابن عربی (شیخ اکبر محی الدین ابن عربی) ترجمہ از امیر حسن خان سہا۔

(۸) ترجمہ تفسیر بیضاوی (انوار التنزیل۔ قاضی ناصر الدین ابوالخیر عبداللہ بن عمر البیضاوی۔ متوفی ۶۸۵ھ) قاسمی پریس دیوبند

(۹) ترجمہ تفسیر جلالین (تالیف علامہ جلال الدین بن محمد بن احمد محلیؒ اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ) مترجم محمد ابوذر سنبھلی۔ اعجاز محمد پریس آگرہ ۱۹۰۵ء۔

(۱۰) ترجمہ تفسیر جلالین (جلد اوّل) از غلام محمد مہدی $\frac{۱۸۵۹ء}{۱۲۷۵ھ}$

(۱۱) تفسیر کمالین شرح اردو جلالین (از مولانا محمد نعیم دیوبندی استاذ تفسیر قرآن)

(۱۲) تفسیر فی ظلال القرآن (پارہ الٓمٓ) از سید قطب شہید (ترجمہ مولانا ساجد الرحمٰن)

(۱۳) تفسیر مظہری (قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی) تشریحی ترجمہ سے ضروری اضافات، از مولانا سید عبدالدائم الجلالی)

(۱۴) تفسیر ابن کثیر۔

منظوم تراجم و تفاسیر

(۱) ریاض دلکشا۔ (تفسیر سورہ یوسف)

ابتدائی دور کی اردو تفاسیر

ابتدائی دور کی اردو تفسیروں کی مندرجہ ذیل چند خصوصیات ہیں۔ یہ

(۱) تفسیریں مکمل نہیں بلکہ جزوی ہیں اور عموماً ایک، دو، دو سورتوں کی مختصر تشریح کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۲) یہ تفسیریں، ترجمہ سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ مترجمین نے وضاحت کے لیے ترجموں میں چند الفاظ کا اضافہ کر دیا ہے۔

(۳) ہر تفسیر کسی مخصوص علاقہ کی مقامی بولی میں کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وہاں کے عوام کے لیے لکھی گئی تھی۔ ویسے بھی یہ ایک فطری امر ہے کہ عوام تک جو بات پہنچانی ہوتی ہے اس کا بہترین ذریعۂ ابلاغ ان کی اپنی روزمرہ کی زبان ہوتی ہے۔ علماء اور خواص تو قرآنی تعلیم کو براہ راست قرآن کے متن اور عربی تفاسیر سے اخذ کر سکتے ہیں لیکن عوام کے لیے یہ بات ممکن نہیں ہوتی لہٰذا مبلغین نے ان کو سمجھانے کے لیے ضروری خیال کیا کہ خود ان کی زبان اور ان کے محاورہ میں اپنی بات ان تک پہنچائیں۔ چنانچہ تحریر اور تقریر جو ابلاغ کے دو طریقے ہیں ان دونوں میں انہوں نے اس اصول کو برتا۔ اور دیگر امور کی طرح قرآنی تعلیم بھی عوام کو ان کی اپنی زبان اور عام فہم انداز میں پیش کی۔

اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی سورہ یوسف کی تفسیر ہے۔ تذ
کے مخطوطات کی تلاش کے دوران یہ تفسیر بھی بابائے اردو مولوی عبدالحق
کے ہاتھ آئی تھی اور انہوں نے اس کو تحقیق کی دنیا میں روشناس کر
بعد بارہویں صدی کے آخر تک دریافت ہونے والی تفسیروں میں ز
زمانی کے اعتبار سے حسب ذیل تفاسیر آتی ہیں۔

(۱) تفسیر سورہ ہود اور سورہ الحجر۔
(۲) تفسیر حسینی
(۳) تفسیر سورہ بنی اسرائیل و سورہ کہف
(۴) تفسیر مرادی از شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی د،
(۵). تفسیر مرتضوی از شاہ غلام مرتضیٰ۔ جنوری ۱۷۶۴ء

تفسیر سورہ یوسف

سورہ یوسف کے ترجمے اور تفسیر کا وہ واحد نسخہ جس کے ذریعہ
کا پتہ چلا۔ ناقص الطرفین ہے۔ اسی لیے اس کے مصنف اور سنہ تصنیف
بارے میں کچھ کہنا تقریباً ناممکن ہے۔ تاہم بابائے اردو مولوی عبدالحق
علامات و قرائین سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ دسویں صدی ہجری کے آخر
صدی کے اوائل کی تصنیف ہے۔ اور چونکہ ان کے اس قیاس کی تر
کے لیے کوئی معقول دلیل موجود نہیں ہے اس لیے ان کے اس دعوے
کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ دسویں صدی کا آخری ربع اکبر بادشاہ
حکومت ہے اور گیارہویں صدی کا پہلا ربع دورِ اکبری اور دورِ جہانگیری
ہے۔ جس کے پیشِ نظر یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ یہ تفسیر دورِ اکبری کے
یا عہد جہانگیری کے اوائل میں منصہ شہود پر آئی۔ اس نسخے کے شروع

حصے غائب ہونے کی وجہ سے اس کے مصنف کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

بابائے اردو اس ترجمہ و تفسیر کی زبان گجراتی اردو بتاتے ہیں۔ اور
اس کے لیے وہ گجراتی زبان کے ان الفاظ کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جو اس نسخے
میں استعمال ہوئے ہیں جیسے:

انے (اور)، تبی (سے، میں)، ہوں (میں)، ڈوسی (بڑھیا)،
تبیک (تھوڑا) اور بیر (عورت)[1]

ان شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر یا جہانگیر کے زمانہ میں اردو تہذیبی اور
سرکاری زبان تھی۔ جبکہ اردو نثر کو اور موضوعات پر اظہار خیال کے لیے بہت
کم کام میں لایا جاتا تھا۔ ہمارے علماء تبلیغِ دین کے کاموں سے غافل نہیں تھے۔
اور وہ مرکز حکومت سے دور رہ کر گجرات جیسے علاقہ میں وہاں کی عوامی زبان
میں قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر سے عوام الناس کو واقفیت دلا رہے تھے۔
اگرچہ اس وقت یہ کام اپنے ابتدائی مرحلے سے گزر رہا تھا تاہم اس کی
داغ بیل پڑ چکی تھی۔

تفسیر کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ البتہ ترجمہ میں کہیں کہیں مترجمین سے
اختلاف دکھائی دیتا ہے۔ جیسے کہ اس سورہ کے آخری حصہ میں بتایا گیا ہے کہ
جب حضرت یوسف علیہ السلام کو جو عزیز مصر یا اس کی نیابت کے منصب
پر فائز تھے، اپنے بھائیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام
آپؑ کے فراق میں روتے روتے نابینا ہو گئے ہیں، تو آپؑ نے کسی کو اپنی قمیص دیکر
فلسطین بھیجا کہ اس کو لے جا کر ان کے منہ پر ڈال دیں۔ ان کے اس حکم پر عمل

---

1. ان تمام الفاظ کو خاص گجراتی قرار دینا درست نہیں بلکہ اکثر پراکرتوں میں ملتے ہیں۔
مثلاً تبیک بمعنی تھوڑا روہیلکھنڈ کے اکثر علاقوں میں عام ہے۔

کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی واپس آگئی۔
اس واقعہ کو سورہ یوسف میں جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وہ الفاظ اور جو
ترجمہ اس وقت کیا گیا تھا دونوں ذیل میں درج ہیں:

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا
وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (۱۲ : ۹۳)

ترجمہ:- یوسف نے کہا، لے جاؤ میری پیرہنی انے (اور) باپ
کے منہ پر چھوڑو تو دیکھتے ہو ویں گے اپنے پیچھے سٹلے (تمام)
آپس کے کم کوں لیواتے (اور) میرے نزدیک آنو۔

مولانا فتح محمد جالندھری نے اس کا ترجمہ آجکل کی زبان میں اس طرح
کیا ہے:

ترجمہ:- یہ میرا کرتا لے جاؤ اور اسے والد صاحب کے منہ پر ڈال دو۔
وہ بینا ہو جائیں گے۔ اور اپنے تمام اہل و عیال میرے پاس
لے آؤ۔

گجراتی اردو کے ان چند الفاظ سے قطع نظر جن کا ذکر اوپر ہوا ہے چند ترکیب
الفاظ کا ترجمہ بھی مولانا فتح محمد کے ترجمہ سے مختلف ہے۔ چنانچہ قمیصی ہذا
کا ترجمہ اس تفسیر میں "میری پیرہنی" کیا گیا ہے۔ جبکہ مولانا فتح محمد نے "یہ
میرا کرتہ" سے اس مفہوم کو ادا کیا ہے۔
"فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ" کا ترجمہ اس تفسیر میں "انے (اور)
باپ کے منہ پر چھوڑو" کیا گیا ہے۔ جبکہ مولانا فتح محمد کا کیا ہوا ترجمہ یہ ہے۔
"اور اسے والد صاحب کے منہ پر ڈال دو"
جس لفظ کا ترجمہ اس تفسیر میں "چھوڑو" کیا گیا ہے اس کے مفہوم کو مولانا
فتح محمد نے "ڈال دو" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ یہ ترجمہ موجودہ محاورہ کے مطابق

بھی ہے اور فاعل کے مرادی معنوں کو بھی صحیح طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس کے
علاوہ "ابی" کا ترجمہ میرے باپ ہونا چاہیے۔ لیکن زیر نظر تفسیر میں اس کا
ترجمہ صرف "باپ" کیا گیا ہے: اور مولانا فتح محمد نے "والد صاحب" کیا ہے۔
جس سے "میرے باپ" کا مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔

بہر حال اس فرق کو اس لیے نظر انداز کرنا پڑتا ہے کہ اب سے تقریباً
ساڑھے تین سو سال پہلے زبانِ اردو اپنے ارتقائی مراحل سے گزر رہی تھی اور
بعد میں بننے والے اردو زبان کے مراکز سے بہت پہلے اور گجرات جیسے دور افتادہ
علاقہ میں اس نے اس وقت تک یہی شکل اختیار کی تھی۔ سچ پوچھیے تو اس دور
کے لحاظ سے یہ بہت صاف ستھری اور منجھی ہوئی زبان معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر
سید حمید شطاری نے صحیح لکھا ہے کہ:

گیارہویں صدی کے ختم تک جملوں کی نحوی ترکیب منظم و مرتب
نہیں ہو سکتی تھی اس لیے جس طرح بن پڑتا مفہوم ادا کر دیا جاتا تھا۔[1]

تفسیر لکھتے وقت چونکہ مفسر کی ____ زبان میں روانی اور شستگی کا
ہونا قدرتی امر ہے۔ چنانچہ زیر نظر تفسیر سورہ یوسف میں تفسیر کی زبان ترجمہ کی زبان
سے زیادہ سادہ اور سلیس ہے۔ ملاحظہ ہو:

"پیچھے بھائی کے عہدیدار سے کہیا کر دے دائم نماز گزارتا ہے
انے (اور) روزے راکھتا ہے۔ انے (اور) تسبی (تسبیح) کرتا ہے۔
انے (اور) ملعولوں (غم زدہ) کو پوچھتا ہے۔ انے (اور) درویشوں
کو کھان (کھانا) دیتا ہے۔ انے (اور) جے (جو) کچھو (کچھ)
آس پاس آوتا ہے سو محتاجوں کو بانٹ دیتا ہے۔ انے (اور) ایسا

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ستمبر ۱۹۸۲ء ص ۵۵

نہیں کھاتا۔ انے (اور) کدھیں اس تھیں کوئی رنجیدہ نہیں ہووا
انس پچھیں جب اے صفتاں ملکس ستیاتب کہیا کہ اے باتاں
بھودیں کی متے مگر پیغامبروں منے ہوویں یا پیغامبروں کے
بیٹگروں (اولاد) منے ہوویں۔ انے (اور) دوجیا یہ پوچھیا
کہ یوسف کی تتبع بھاکسی منے کون کرتا ہے۔ انے (اور) اس پاس
کی پاس نہیں کچھ آوتا ہے۔ پیچھے انہوں نے کہا کہ عزیز کی پییر
(عورت) چھپا کرنے بھیجتی ولیکن وے قبول نہیں کرتا۔ انے
(اور) وے پانچ پیران دو جیاں کرلی ہیں۔ دے بھی بھیجتیاں ہیں
انہوں سکا بھی کچھ قبول نہیں کرتا۔ انے (اور) انہوں سکا بول بھی
نہیں سنتا ہے[1]

دکنی اردو کی ایک خصوصیت جو شعرائے گولکنڈا اور بیجاپور کے یہاں اکثر دکھائی دیتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ فعل ماضی مطلق میں "الف" سے پہلے "ی" کا استعمال اس طرح کیا جاتا تھا کہ یہ دونوں حروف ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مل جاتے تھے کہ "ی" کی آواز زیادہ نمایاں نہیں ہوتی تھی[2] تقسیم ملک کے وقت تک یو۔پی کے دیہاتوں میں اس کا استعمال عام تھا۔ لیکن صرف بولی کی حد تک۔ دکن میں ادبی تحریروں میں یہ چیز عام طور پر دکھائی دیتی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں بھی ایسے کئی نمونے دکھائی دیتے ہیں جیسے پہلی سطر میں "کہا" کی جگہ "کہیا" استعمال ہوا ہے۔ دوسری سطر میں پوچھتا کی بجائے "پوچھا" ہے۔ مگر یہاں فعل حال مطلق کی یہ شکل دی گئی ہے جس کی

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم کا تنقیدی مطالعہ ص ۵۵، ۵۶

[2] حاشیہ بحوالہ دریائے لطافت انشاء اللہ خاں۔

مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ چھٹی سطر میں بجائے "پوچھا" کے "پوچھیا" استعمال ہوا ہے۔

اس تفسیر کی ایک اور خوبی بھی قابلِ ذکر ہے۔ آج کل فعل متعدی میں ماضی مطلق کے ساتھ علامت فاعل لگانا لازمی ہے۔ لیکن نہ صرف دکنی دور کی اردو میں بلکہ شمالی ہند میں متقدمین کے دوسرے دور کے بڑے بڑے شعراء کے ہاں بھی اکثر مقامات پر یہ بے اعتدالی نظر آتی ہے کہ انہوں نے اس علامت کو حذف کر دیا۔ چنانچہ شہنشاہِ متغزلین میر تقی میرؔ، مثنوی سحر البیان کے مصنف میر حسنؔ اور میر محمد باقر حزیںؔ کے کلام میں بھی اس کے نمونے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

میرؔ صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

نقاش دیکھ تو میں کیا نقشِ یار کھینچا
اس شوخ کہ تماشا نت انتظار کھینچا

اس شعر میں حسن نے "کہا میں نے" کی جگہ "کہا میں" سے کام چلایا ہے اور علامت فاعل "نے" ترک کر دی ہے۔

حزیںؔ کہتے ہیں۔

جس دن سے میں سنا ہے کہ آخر ہوئی بہار
اس دن سے چھوٹنے کی مجھے کچھ ہوس نہیں

اس جگہ "میں نے سنا ہے" کی جگہ "میں سنا ہے" استعمال ہوا ہے۔

اس صورت حال کے پیشِ نظر کتنی حیرت کی بات ہے کہ اس ترجمہ اور تفسیر میں علامت فاعل "نے" کا استعمال ایسے موقعوں پر بالالتزام کیا گیا ہے اور درست کیا گیا ہے۔ مثلاً ترجمہ میں ہے۔ "یوسف نے کہا" لے جاؤ میری پیرہنی۔ اسی طرح تفسیر میں ملاحظہ ہو — "پیچھے بچا کی کے عہدیدار نے بیا"

کہ وہ دائم نماز گزارتا ہے۔ آگے چل کر اسی اقتباس میں یہ جملہ بھی ملاحظہ ہو: "پیچھے انہوں نے کہیا۔ کہ عزیز کی بیر (عورت) چھپا کرنے بھیجنی۔

بہرحال یہ تو زبان کے وہ اصول ہیں جو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یہاں تو یہ بتانا مقصود ہے کہ جس زمانہ میں عربی اور فارسی کا رواج عام تھا لیکن ان زبانوں میں بھی تفسیریں بہت کم لکھی جا رہی تھیں۔ اس وقت اردو جیسی زبان میں جو عام بول چال کی زبان تھی۔ ہمارے بعض علماء نے قرآن کریم کے ترجمے اور تفسیر کی ضرورت محسوس کی۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس وقت اردو نثر کا رواج بہت کم تھا اور تحریری طور پر تو علمی اور ادبی کاموں میں اس کے نمونے تقریباً مفقود ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ سرکار، دربار میں ہر جگہ فارسی زبان کا سکہ چل رہا تھا لیکن عوام تک دینی و اخلاقی مسائل پہنچانے کے لیے علماء اردو نثر استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ اس دور میں فارسی محاوروں اور تراکیب کو اردو میں استعمال کیا گیا۔

تفسیر پارہ ہود یا تفسیر پارہ وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِی

(تفسیر سورہ ہود اور سورہ الحجر)

دراصل یہ ترجمہ اور تفسیر ہے پارہ "وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِی" کا مگر چونکہ مصنف نے تفسیر یا ترجمہ کے تعلق سے اس پر کوئی عنوان نہیں دیا۔ اس لیے مولوی نصیر الدین ہاشمی نے قیاس کی بنیاد پر اس کو تفسیر پارہ ہود قرار دیدیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرما دیا ہے کہ:

"اس میں سورہ ہود سے لے کر سورہ الحجر کے کچھ حصہ کی تفسیر شامل ہے۔"

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہاشمی صاحب نے عنوان میں تو سورہ ہود کی بجائے پارہ ہود لکھ دیا ہے اور مندرجہ بالا فقرہ میں سورہ ہود ہی تحریر فرمایا ہے۔

اس تضاد کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے زیرِ نظر تفسیر کو اس سورۃ کی تفسیر قرار دیا ہے۔

جہاں تک سورہ ہود کا تعلق ہے وہ گیارہویں پارے یعنی یَعْتَذِرُوْنَ کے آخری رکوع سے شروع ہو کر بارہویں پارے یعنی وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ کے تقریباً تین چوتھائی تک چلی گئی ہے اور وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِی جس کی یہ تفسیر ہے تیرہواں پارہ ہے۔ لہٰذا سورہ ہود کا اس میں کوئی جز بھی شامل نہیں ہے۔ پھر چونکہ سورۃ الحجر کی ایک سطر اس پارہ میں شامل ہے اس لیے مفسر نے یہیں ترجمہ اور تفسیر کو ختم کر دیا ہے۔ پوری سورہ کی تفسیر اس میں شامل نہ دیکھ کر ہاشمی صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ یہ مخطوطہ ناقص الآخر ہے۔ غرض اس طرح کے بعض سہو ہاشمی صاحب سے ہوتے ہیں جن سے قدرتی طور پر قارئین کو غلط فہمی ہو سکتی ہے اس لیے یہاں ان باتوں کی نشان دہی کر دی ہے۔

تیرہویں پارے میں سورۃ یوسف کا تقریباً آخری نصف حصہ، پوری سورہ رعد، پوری سورہ ابراہیم اور ایک آیت سورہ الحجر کی شامل ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ زیرِ نظر تفسیر سورہ یوسف نصف آخر، سورہ ہود تمام، پوری سورہ ابراہیم اور سورہ الحجر ایک آیت مع لفظ ربما (کسی وقت یا اکثر اوقات) کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔

زیرِ نظر تفسیر میں مترجم و مفسر نے جس طرح ترجمہ کیا اور تفسیر لکھی ہے اس کا نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ اور تفسیر ہے وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِی .... اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ کا۔ ملاحظہ ہو۔

"وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِی اور پاک کرتا ہوں میں نفس کیتیں میرے
یعنی میں کہتا ہوں کہ نفس میرا میل اور آرزوؤں سے پاک ہے۔
اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ۔ تحقیق نفس میرا البتہ فرماں بردار ہے۔

بالسُّوۡٓءِ ساتھ (ساتھ) بدی کے۔ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ۔ مگر
جس چیز کے تئیں کہ رحم کرے پروردگار میرا یعنی عشقے اور نفس
کی فرماں برداری سے امن میں رکھے۔ "اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ"
تحقیق پروردگار میرا بخشنے ہارا ہے گناہ کے قصد کے تئیں یعنی جو گناہ
کہ ظاہر میں نہ آوے اور اس کا خیال دل میں آیا۔ پروردگار اس
گناہ کو بخشتا ہے۔ رحیم مہربان ہے کہ بندے کے تئیں گناہ سے باز
رکھتا ہے۔ وَقَالَ الۡمَلِکُ ائۡتُوۡنِیۡ بِہٖۤ اَسۡتَخۡلِصۡہُ لِنَفۡسِیۡ
جس وقت کے ایلچی بادشاہ کا بادشاہ کے روبرو آیا یوسف علیہ السلام
کے بات ان تمام کہا۔ پس بادشاہ کے تئیں یوسف علیہ السلام کو
دیکھنے کے آرزو اور زیادہ ہوئے"۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فتح الحمید از مولانا فتح محمد جالندھری سے
اس حصہ کا ترجمہ نقل کر دیا جائے تاکہ ایک طرف پرانے اور نئے ترجمہ کا فرق معلوم
ہوسکے۔ دوسری جانب یہ پتہ چل سکے کہ زیر نظر تفسیر میں کتنا ترجمہ ہے اور کتنی
عبارت تفسیر کی ہے۔

(ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری):۔ اور میں اپنے تئیں پاک صاف
نہیں کہتا کیونکہ نفس (امارہ انسان کو) برائی ہی سکھاتا رہتا ہے
مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے۔ بیشک میرا پروردگار بخشنے والا
مہربان ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لاؤ میں اسے
اپنا مصاحب خاص بناؤں گا۔

اس مخطوطہ کی خاص صفت یہ ہے کہ قرآن کی آیتیں سرخ روشنائی سے لکھی گئی
ہیں اور معنی اور تفسیر کو سیاہی سے لکھا گیا ہے۔
عام طور پر لفظی ترجمہ کیا گیا ہے لیکن کہیں کہیں الفاظ کی تشریح و توضیح کر دی

گئی۔ بعض مقامات پر واقعات کو خاصی تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔ کہیں
ایسا بھی ہوا ہے کہ ترجمہ موجودہ محاورے کے مطابق نہیں ہے جس کی وجہ سے صحیح
مفہوم سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی وضاحت وصراحت
نہ کی جائے۔ مثلاً وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے "اور میں پاک
کرتا ہوں نفس کے تئیں میرے"۔ اس کے آگے تفسیری جملہ نہ ہوتا تو مفہوم کچھ کا
کچھ ہو جاتا۔ اس لیے کہ اس کا صحیح مطلب ہے "میں اپنے نفس کو یا اپنی ذات کو
یا اپنے تئیں پاک نہیں کہتا"۔ جیسا کہ مولانا فتح محمد جالندھری کے ترجمہ سے ظاہر ہوتا
ہے۔ جو لوگ اردو زبان کا صحیح ذوق رکھتے ہیں وہ بخوبی اس فرق کو محسوس کر سکتے
ہیں جو "میں پاک کرتا ہوں نفس کے تئیں میرے" اور "میں پاک کہتا ہوں
نفس کے تئیں میرے"۔ بہرحال مترجم و مفسر نے یہ اچھا کیا کہ اس الجھن کو تفسیری
جملہ کے ذریعہ دور کر دیا ہے۔

آگے چل کر اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌ میں "امارہ" کا ترجمہ فرماں بردار کیا
ہے۔ حالانکہ اس کے معنی ہیں "برائی کا حکم دینے والا"۔ ظاہر ہے کہ فرماں بردار
یا تابعدار کے مفہوم میں اچھائی کا اشارہ ملتا ہے۔ ایسا فرماں بردار یا تابعدار
برائی کیوں کر سکھا سکتا ہے جیسا کہ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ سے واضح
ہوتا ہے کہ "نفس برائی ہی سکھاتا رہتا ہے"۔

اسی سلسلہ میں اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ۔ اس ٹکڑے کا مطلب مولانا
مودودی نے تو یہ بتایا ہے "بیشک میرا رب غفور و رحیم ہے" اور مولانا فتح محمد
جالندھری لکھتے ہیں "بے شک میرا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے"۔ ان دونوں
کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بخشش میں اتنی وسعت ہے کہ وہ
اگر چاہے تو ہر طرح کے گناہ بخش دے خواہ وہ گناہ انسان کے دل میں آیا ہو اور
سرزد نہ ہوا ہو یا انسان اس گناہ کا مرتکب نہ ہوا ہو۔ اور اللہ کی غفاریت اور

رحیمی وکریمی کی شان یہی ہے کہ وہ چاہے تو بڑے سے بڑا گناہ کو بخش دے لیکن اس پہلو پر نظر نہ رکھتے ہوئے اس تفسیر کے لکھنے والے نے نہ معلوم کس بنیاد پر ترجمہ کے ساتھ اس تفسیری جملہ کا اضافہ کر دیا ہے۔ " بخشنے؟ را ہے گناہ کہ قصد کتیں۔ یعنی جو گناہ کہ ظاہر میں نہ آدے اور اس کا خیال دل میں آیا پروردگار اوس گناہ کو بخشتا ہے" عقیدہ سے قطع نظر اس آیت میں کوئی قرینہ بھی ایسا موجود نہیں ہے جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو ــــ بہرحال اس کو تفسیر بالرائے کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

اسی طرح درج ذیل آیت کے ترجمہ اور تفسیر میں دوسروں سے اختلاف کیا گیا ہے۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (۱۲: ۹۳)

مولانا فتح محمد صاحب لکھتے ہیں۔ " یہ میرا کرتہ لے جاؤ اور اپنے والد صاحب کے منہ پر ڈال دو وہ بینا ہو جائیں گے اور اپنے تمام اہل وعیال کو میرے پاس لے آؤ" مولانا مودودی نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ " جاؤ میرا یہ قمیض لے جاؤ اور میرے والد کے منہ پر ڈال دو ان کی بینائی پلٹ آئے گی۔ اور اپنے سب اہل وعیال کو میرے پاس لے آؤ"

ان دونوں کے مقابلہ میں صاحب تفسیر ہذا کا ترجمہ اور تفسیر یہ ہے" لے جاؤ تم پیراہن میرا جو یہ ہے (اور وہ پیراہن ابراہیم علیہ السلام کا تھا کہ جبرئیل کنوئیں میں یوسف کے تئیں پہناتے تھے اور وحی پہنچاتے تھے کہ اس پیراہن کے تئیں یعقوب کے پاس کنعان میں بھیجو) پس ڈالو تم اوس پیراہن کے تئیں عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ اور منہ باپ کے میرے یَاْتِ بَصِيْرًا آئیں گے بینائے آنکھوں کے لینے انکھیاں اون کے روشن ہوویں گے۔ اور آؤ تم میرے پاس

ساتھ لوگوں تمہارے تمام ہو۔

غرض تفسیر ہذا کی زبان تو پرانی ہے ہی، ترجمہ اور تفسیر میں بھی جھول دکھائی دیتے ہیں۔

تفسیر حسینی

فارسی زبان میں قرآن کریم کی ایک مشہور تفسیر ہے جس کے مصنف مُلّا حسین واعظ کاشفی ہیں۔ ان کے نام کی مناسبت سے اس کا نام تفسیر حسینی ہوگیا ہے۔ اتفاق سے اردو میں بھی اسی نام کی تفسیر کا ایک مخطوطہ دریافت ہوا ہے جو غالباً کسی فارسی تفسیر کا ترجمہ ہے لیکن اس تفسیر کے مصنف کا نام دریافت نہیں ہو سکا۔ اس وقت یہی تفسیر پیش نظر ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے " قدیم اردو" میں قرآن مجید کے ترجموں کے سلسلہ میں اردو تفسیر حسینی کے مخطوطہ کا ذکر کرتے ہوئے ملا حسن واعظ کی تفسیر حسینی سے اس کا مقابلہ کیے بغیر، محض نام کی بنا پر قیاس اس کو اسی فارسی تفسیر حسینی کا ترجمہ قرار دے دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

" تفسیر حسینی کا ترجمہ بھی کسی صاحب نے پرانی دکنی میں کیا ہے۔ یہ تفسیر نہایت مقبول ہے اور اس کے متعدد ترجمے دکنی زبان میں ہوئے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت پارہ عم کی تفسیر کا ترجمہ موجود ہے۔ اس کی زبان پرانی ہے۔ آخر میں کاتب نے دن، وقت تاریخ (روز جمعہ بوقت عصر در ماہ جمادی الآخر) تو لکھی ہے، سنہ نہیں لکھا۔ چند آیتوں کا ترجمہ یہاں لکھا جاتا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ ساتھ تفسیری جملے بھی ہیں"

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے بابائے اردو نے اس مخطوطہ کا نام تفسیر حسینی

دیکھ کر صرف قیاس کی بنیاد پر اس کو فارسی کی مشہور و معروف تفسیر حسینی
ترجمہ بتا دیا ہے۔ لیکن دونوں کا موازنہ و مقابلہ کرنے سے پتہ چلتا ہے
ان میں کافی فرق ہے اس لیے بابائے اردو کے قیاس کو درست نہیں کہہ
جہاں تک نام کے اشتراک کا تعلق ہے اس سلسلہ میں دو توجیہات کی جا
ایک یہ کہ جس طرح "لفظ حسین" فارسی تفسیر کے مصنف کے نام کا ایک جزء ہے
نسبت سے انہوں نے اپنی تفسیر کا نام تفسیر حسینی رکھا ہے۔ اس طرح ممکن ہے ا
مخطوطہ کے مصنف کے نام کا جز یا پورا نام ——— حسین یا حسینی ہو
انہوں نے بھی اپنی تفسیر کو اپنے نام یا نام کے اس جزء سے نسبت دے کر اس کو تفسیر
کے نام سے موسوم کیا ہو۔ دوسری توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ اسی نام کی کسی دو
فارسی تفسیر کا ترجمہ ہو۔

بہرحال بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے یہ تو بتا دیا ہے کہ زیر
تفسیر حسینی کے کاتب نے اس کے لکھے جانے کا دن اور تاریخ تو دے دی ہے
اس کی کتابت کس سنہ میں ہوئی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ اسی طرح مصنف
نام بھی نہیں بتایا گیا۔ لہٰذا بابائے اردو بھی ان امور پر روشنی ڈالنے سے قاصر
ساتھ ہی وہ یہ بھی نہیں بتا سکے کہ یہ تفسیر پورے قرآن کی ہے۔ یا اس کے کسی جزء
تاہم ان کے اس جملہ سے کہ "میرے سامنے اس وقت پارہ عمہ کی تفسیر کا ترجمہ
ہے" مترشح ہوتا ہے کہ پارہ عم کے علاوہ بھی قرآن کریم کے اور اجزاء کا ترجمہ
زیر نظر تفسیر حسینی میں ہوگا۔ نمونے کے طور پر جو حصہ بابائے اردو نے پیش کیا
وہ سورۃ النباء کی ١٢ آیتوں کا یعنی عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ سے وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ
سَبْعًا شِدَادًا تک کا ہے۔ ملاحظہ ہو:

(عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ) کس چیز تے پوچھتے ہیں او (وہ) کافراں
یعنی بعثت تے پوچھتے ہیں آپس میں:

"اے یا رسول کون ہوا سو متاں کون (عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيمِ) بزرگ
خبر تے (الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ) ایسی خبر کہ انوں اس میں
اختلاف کرنہارے ہیں (كَلَّا سَيَعْلَمُونَ) یوں نہیں پوچھتا
ہے کہ انکار کرے تو تھے کر سمجھیں گے اور لوگوں پر ڈرانے کا وعدہ ہے
(ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ) پچھیں یوں نہیں پوچھتا ہے ترت ہے کہ
سمجھیں او تو دوبار لیا یا ایسے تاکید کے راستے۔ ہور "ثم" سون
لیا نا سمجھیا کر دیتا ہے یو کہ دوسرا وعدہ بہت سخت ہے۔ اور بعضے
بولے پیلا (پہلا) سو جیو (جان) کا پڑنے وقت دوسرا سو گنوارا
(گہوارہ) جو نہنوا دان (بچوں) کا ہے۔ یو ذکر کو بڑا ہے تھوڑیاں
باتاں کوں دیکھتے ہیں او خدا کے عجائب صفت تے یو او دلوکوں
سمجھانے کے واسطے اس کی کمال قدرت پر دلیل پڑیں۔ اس سے بحث
کے درست ہوتے پر (وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا) بولتا اللہ تعالیٰ آیا
نہیں کیے ہیں ڈونگراں (پہاڑوں) کو میخاں زمین کیاں۔ یوں نہ
ہوتے تو ہلتی (وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا) ہور کیا نہیں پیدا کیے
ہیں تمناں جوڑی جوڑی مرد عورت (وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا)
ہور کیا نہیں پیدا کیے ہیں تمارے سونے کوں توڑنا دیکھنے تے
ہور ہلنے سے تمنا راحت۔ ہور آسودہ ہونے کے واسطے (وَجَعَلْنَا
اللَّيْلَ لِبَاسًا) ہور کیا نہیں پیدا کیے ہیں رات کو پیتنا (پہننا)
اوہاں (وہاں) یعنی ہے اپنے اندھارے سوں۔ جو نکہ کپڑا ڈھانکتا
ہے اپنے انگ کوں (وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا) اور کیا نہیں کیے
ہیں دنیں (دن) کو زندگانی (معاش) بدل (واسطے) تا طلب
کریں تمہیں زندگانی سب جو تک کھانا پینا کپڑا۔ (وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ

سَبۡعًا شِدَادًا) ہور کیا نہیں بنا کیا گئے ہیں تمارے اوپر سات آسماناں گھٹے (محکم) کہ نہیں پورانیاں ہوتیاں نی بہت زمانے جائے سوں۔"

جیسا کہ سطور بالا میں بتایا جا چکا ہے کہ بابائے اردو نے اصلی تفسیر حسینی (فارسی) کو دیکھے بغیر زیر نظر دکنی تفسیر حسینی کو اس کا ترجمہ قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ اول الذکر موخر الذکر سے بہت سی باتوں میں مختلف ہے۔ دونوں میں آیتوں کی ترتیب و تقسیم مختلف ہے۔ الفاظ معانی اور تراکیب کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے۔ فارسی تفسیر میں بعض حصوں کی تفسیر تفصیل سے کی گئی ہے جو دکنی تفسیر میں دکھائی نہیں دیتی۔ چنانچہ فارسی تفسیر میں زیر نظر سورۃ النباء کی تفسیر اس طرح شروع کی گئی ہے۔

"چوں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت آشکارا کرد وقرآن برخلق خواندن بروِن قیامت بیم فرمود کفار در نبوت آنحضرتؐ ونزول قرآن ووقوع بعث اختلاف کردند و از ان یک دیگر را می پرسیدند یا از پیغمبر و مومناں پرسش می نمودند چنانچہ حق تعالیٰ فرمود عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ۔"

دکنی تفسیر میں اس عبارت کا ترجمہ نہیں ہے۔ اسی طرح اور بہت سے مقامات پر بھی دونوں میں بین فرق دکھائی دیتا ہے۔ یہ باتیں اس امر پر پوری طرح دلالت کرتی ہیں کہ دکنی تفسیر حسینی، فارسی تفسیر حسینی کا ترجمہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ تفسیر کسی دکنی عالم نے خود لکھی ہے اور ترجمہ اور تفسیر میں خاصا اچھا انداز اختیار کیا ہے۔

زیر نظر تفسیر میں آیات قرآنی کا ترجمہ پرانی دکنی میں کیا گیا ہے اور ترجمے کے ساتھ تفسیری جملے دیے گئے ہیں۔ مترجم نے ترجمہ میں بہت احتیاط برتی ہے اور اکثر مقامات پر نہایت موزوں الفاظ استعمال کیے ہیں مثلاً عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

"کس چیز نے پوچھتے ہیں او کافراں یعنی کلی کافراں یعنی بعث تے پوچھتے ہیں آپس میں اے یا رسولؐ کوں ہور مومناں کو۔"

اس جملہ میں دو حروف ربط استعمال ہوئے ہیں "تے" اور "کوں" اردو محاورے کے مطابق دونوں کے معنی "سے" ہوں گے۔ لیکن جہاں "تے" استعمال ہوا ہے وہاں اگر "کوں" استعمال کر دیا جاتا تو صحیح مفہوم ادا نہ ہوتا۔ اس لیے کہ "تے"، "سے" کے بارے میں "کے معنی بھی نکل آتے جو یہاں مقصود ہیں۔ "کوں" کے استعمال سے یہ مقصد پورا نہ ہوتا۔

اس تفسیر کی زبان اور اس کے انداز بیان سے ڈاکٹر سید حمید شطاری نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ زیر نظر تفسیر حسینی اواخر گیارہویں یا اوائل بارہویں صدی ہجری میں لکھی گئی ہوگی۔[1]

تفسیر سورہ بنی اسرائیل و کہف

اس نام کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔ اس کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دراصل پارہ سبحٰن الذی کا ترجمہ و تفسیر ہے۔ چونکہ اس پارے میں پوری سورہ بنی اسرائیل اور سورہ کہف کا حصہ شامل ہے اس لیے مترجم و مفسر نے غلطی سے مخطوطہ پر اس کا نام "تفسیر سورہ بنی اسرائیل و کہف" لکھ دیا اور وہی نام اب بھی قائم ہے۔ اس سے مخطوطہ ہذا کے مطالعہ کرنے والوں کو

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک ۔ ص ۷۵

غلط فہمی ہو سکتی ہے اور وہ سورہ کہف کے آخری تہائی حصہ کو اس بنا
اس کو ناقص الآخر قرار دے سکتے ہیں۔

مخطوطہ میں نہ مفسر کا نام دیا گیا ہے۔ اور نہ سنہ تفسیر درج ہے۔ ترقیمہ
کی قسم کی بھی عبارت دکھائی نہیں دیتی جس کی وجہ سے ان باتوں کا پتہ لگایا جا
ہے۔ مفسر کے نام کا معلوم ہونا تو کسی ذریعہ سے بھی ممکن نہیں۔ البتہ زبان،
بیان کی مدد سے کسی قدر یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تفسیر ۱۲۰۰ء کے
لگ بھگ لکھی گئی ہو گی۔

تفسیر سورہ هُودٌ کی طرح آیات قرآنی سرخ روشنائی سے لکھی گئی ہیں اور
ترجمہ وتفسیر میں کالی روشنائی استعمال کی گئی ہے۔ اس ترجمہ اور تفسیر کی ایک خصوصیت
یہ ہے کہ مترجم و مفسر نے نہ ترجمہ براہِ راست قرآن کریم سے کیا ہے اور نہ تفسیر
خود لکھی ہے۔ بلکہ فارسی ترجمہ وتفسیر حسینی سے دونوں چیزوں کا ترجمہ اس زمانہ
کی مروجہ زبان میں کر دیا ہے۔ نثر کا ترجمہ نثر میں کیا گیا ہے اور اشعار کا اشعار
میں۔ البتہ کہیں کہیں تفسیر میں کچھ الفاظ یا عبارت کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مترجم
و مفسر کے اس طرزِ عمل سے یہ بات ظاہر ہے کہ ملا حسین الواعظ الکاشفی کی تفسیر
حسینی اس زمانہ میں بے حد مقبول تھی اور اس کو معیاری سمجھا جاتا تھا۔ اس نظر
سے دیکھا جائے تو یہ اقدام نہایت مستحسن تھا۔ مفسر نے ان لوگوں کے استفادہ
کے لیے جو عربی اور فارسی دونوں زبانوں سے ناواقف تھے ان کی اپنی زبان
میں ایک معیاری چیز پیش کر دی۔ اگر وہ براہِ راست عربی سے ترجمہ کرنے کی
کوشش کرتے اور تفسیر بیان کرتے تو ممکن تھا کہ وہ اس قدر صحیح مفہوم نہ پیش
کر سکتے۔ ذیل میں قرآن کا متن، ملا حسین کاشفی کا ترجمہ فارسی اور زیر نظر
اردو ترجمہ دیا جا رہا ہے۔ اس سے اس کی افادیت بھی ظاہر ہو جائے گی اور ترجمہ
کی صحت اور تفسیر کی خوبی بھی واضح ہو جائے گی۔

قرآنی متن	فارسی ترجمہ وتفسیر (تفسیر حسینی)	اردو ترجمہ تفسیر
سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی	پاکی و بے عیبی آنرست	پاکی و بے عیبی ہے اوس کے
بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ	کہ بجہتِ کرامت بردبندہ	تئیں کہ واسطے کرامت کیلیے
الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ	خود را کہ محمد است صلی اللہ	گیا بندہ کے تئیں اپنے جو
الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا	علیہ وسلم شبی یعنی در بعض	محمد ہے صلی اللہ علیہ وسلم
حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ	از شب مسجد حرام کہ محیط	ایک رات یعنی بیچ بعضے شب
اٰیٰتِنَا ط (۱۵: ۱)	بحرم کعبہ است یا از خانہ	کے مسجد حرام سے کہ محیط ساتھ
	امہانی چہ مکہ و حریم او ہمہ	حرم کعبہ کے ہے یا گھر سے
	مسجد اند بسوئے مسجد دور	ام ہانی کے جو دختر ابی طالب
	تر از مسجد اہلِ مکہ یعنی	کے تھے زوجہ محترمہ رسول
	بیت المقدس۔ آن مسجدی	اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
	کہ برکت کردیم گرداگرد او	کے کس واسطے کہ مکہ
	کہ ارض شام است ہمہ	اور حریم مکہ تمام مسجد ہے
	برکت دین کہ او د المحبط	طرف مسجد اقصیٰ کے جو بیت المقدس
	وحی و معبد انبیاء سابقیم	ہے اور اقصیٰ اس کے تئیں اس
	وہم برکت دنیا کہ گرد ا	سبب کہتے ہیں کہ دور تر ہے اہل
	تیدیم اور اشجار و	مکہ سے اور بیچ اوس زمانے کے
	انہار و بسیاری میوہ	سوائے اوس کی مسجد دوسری نہ
	وفراخی معیشت و	تھی۔ وہ مسجد کہ برکت کی ہم نے
	ارزانی پس بد انجا	اطراف اس کی جو زمین شام ہے
	محمد صلی اللہ علیہ وسلم	ہم برکت دیں گے اوس کے تئیں

برویم ـ تا بنمائیم او را از
دلائل قدرت ما کہ اندک
زمانے از مکہ بہ شام رفت
و بیت المقدس را مشاہدہ
کرد و انبیا را بعدہ و توقف
بر مقامات ایشاں حاصل کرد
و بر عجائب و غرائب آسمانہا
اطلاع یافت ـ اکثر علما برآنند
کہ معراج در سال دوازدہم
از بعثت بودہ و در ماہ او
اختلاف کردہ اند کہ ربیع الاول
است یا ربیع الآخر یا شوال
اشہر شب بست و ہفتم
است از رجب ـ و رفتن
آنحضرت از مکہ بہ بیت المقدس
بہ نص قرآن ثابت شدہ
و منکر آن کافر است
و عروج بر آسمانہا
و وصول بہ مرتبہ قرب
یا احادیث صحیحہ مشہور
کہ قریب است بحد تواتر

محبط وحی اور معبد انبیاء کیے
ہم یعنی جائے نزول وحی اور
عبادت گاہ انبیاء علیہم السلام
کا کیے ہم اور ہم برکت دنیا کے
کہ آباد کیے ہم اوس کے تئیے
ساتھ اشجار کے اور انہار کے
اور ساتھ بھوت (بہت) سے
میوہ ہا کے اور ساتھ فراخی معیشت
کے اور ارزانی غلہ کے ـ پس
بیچ اس جا کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کے تئیں گئے ہم تا دکھیا دیں ہم
اوس کے تئیں آیات اور دلائل قدرت
ہماری بابیچ تھوڑی وقت کے
مکہ معظمہ سے شام کے تئیں گیا.
اور بیت المقدس کے تئیں
مشاہدہ کیا اور انبیائے تئیں
دیکھا اور وقوف اوپر مقامات
اون کی حاصل کیا یعنی واقف
ایک کے مقامات و منازل کا
ہوا اور اوپر عجائبات اور غرائبات
آسمانہا کے اطلاع پا کر اکثر
علماء اوپر اس بات کے ہیں کہ

ثابت گزشتہ و ہر کہ انکار
آں کند ضال و مبتدع
باشد ـ نظم

قصہ معراج کا ایک سال آگے ہجرت
کے ہوا ہے اور بیچ ماہ اوس کی اختلاف
کیے ہیں کہ ماہ ربیع الاول ہے یا رمضان
ہے یا ماہ شوال ہے یا ماہ ربیع الآخر ہے
اور اشہر یہ ہے کہ شب بیست و
ہفتم تھے ماہ رجب سے اور جانا
حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا
مکہ معظمہ سے بیت المقدس تک
نص قرآن سے ثابت ہے اور منکر
اس کا کافر ہے اور عروج فرمانا
اور آسمانہا کے اور واصل ہونا بیچ
مقام قاب قوسین او ادنیٰ کے اور
پونچھیا (پہنچنا) مرتبہ قرب ہے ـ سات
احادیث صحیحہ مشہور ہوا ـ قریب سات
حد تواتر کے ہے ثابت ہوا ہے اور جو
کہ انکار اس کا کرے مضل
اور مبتدع یعنی گمراہ اور بدعتی
ہووے ـ

شاہد معراج نبیؐ وافر است
آنکہ مقر نیست بدیں کافر است
دست کہ سلطنت ایں وصال
نیست بہ پامردی او قیل و قال

شاہد معراج نبیؐ وافر ہے
جو مقر اس کا نہیں کافر ہے

عقل چہ داند، چہ مقام است ایں　عقل کیا جانے یہ کیا ہے گا مقام
عشق شناسد کہ چہ دام است ایں　عشق پہچانے ہے یہ کیا ہے گا مقام

فارسی اور اردو ترجمہ اور تفسیر کا مقابلہ کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زیر نظر ترجمہ اور تفسیر کے مصنف نے تفسیر حسینی سے پوری طرح استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ ترجمہ میں تو پوری یکسانیت ہے۔ تفسیر میں کہیں کہیں ملا حسین الواعظ کاشفی سے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ مثلاً ملا حسین واعظ نے تو اتنا ہی لکھ کر چھوڑ دیا ہے۔ "از خانہ ام ہانی چہ مکہ وحریم او ہمہ مسجد اند"۔ لیکن اردو ترجمہ اور تفسیر میں اس میں کافی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں "گھر سے ام ہانی کے جو دختر ابی طالب کے تھے زوجہ محترمہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے" سمجھ میں آتا جب قرآن کریم میں صاف طور پہ بیان کیا گیا ہے "مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" تو ملا حسین واعظ نے کس بنیاد "یا از خانہ ام ہانی" کا اضافہ کر دیا ہے۔ پھر جب خود ہی یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ "چہ مکہ وحریم او ہمہ مسجد اند" تو پھر "خانہ ام ہانی" کی تخصیص چہ معنی دارد۔ بہرحال انہوں نے کلام اللہ میں یہی تحریف معنوی کی تھی کہ "خانہ ام ہانی" کو "مَسْجِدِ الْحَرَامِ" کا درجہ دے دیا تھا لیکن اردو میں ترجمہ کرنے والے صاحب نے اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے "ام ہانی" کا تعارف ان الفاظ میں کرا دیا۔ "ام ہانی جو دختر ابی طالب کی تھی زوجہ محترمہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی"۔ چونکہ ملا حسین الواعظ صاحب ام ہانی کا پورا تعارف کرانے سے چوک گئے تھے اس لیے مترجم اردو نے اس کمی کو یہ کہہ کر پورا کر دیا کہ "کسی اور ام ہانی کو نہ سمجھ لیا جائے بلکہ یہ وہ ام ہانی ہیں جو بیٹی تھیں ابو طالب کی اور زوجہ تھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم"۔ ان دونوں بزرگوں کے بیان میں صرف ایک بات صحیح ہے کہ حضرت ام ہانیؓ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کے والد ابو طالب کی بیٹی تھیں۔ باقی دو باتیں بالکل غلط ہیں۔ نہ معراج حضرت

ام ہانیؓ کے گھر سے ہوئی اور نہ حضرت ام ہانیؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ تھیں۔ معراج کا واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے۔ اس وقت تک نہ ام ہانی دائرۂ اسلام میں داخل ہوتی تھیں نہ ان کا شوہر "ہبیرہ" مسلمان تھا۔ وہ زندگی بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی دشمن رہا اور کفر کی حالت میں مرا۔ ایسی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے گھر میں قیام کرنا اور وہاں سے معراج کے لیے جانا کیسے ممکن تھا۔ بہرحال اس صراحت سے جو ان دونوں بزرگوں نے کی ہے ان کے عقیدہ اور رجحانِ طبیعت کا اظہار ہو جاتا ہے۔

تفسیر میں ایک بات ان دونوں نے دوسرے مفسرین سے زیادہ صحیح لکھی ہے۔ وہ یہ کہ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر تو نص قرآنی سے ثابت ہے لیکن معراج کی دیگر منازل کے بارے میں قرآن کریم میں کوئی اشارہ نہیں۔ صرف احادیث سے اس کے متعلق پتہ چلتا ہے۔ دوسرے مفسرین، میلاد خواں اور واعظ اس کے لیے بھی قرآن سے سند پیش کرتے ہیں اور سورہ النجم کی ابتدائی آیتوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہ تک فرما دیتے ہیں کہ رسول اللہ، اللہ تعالیٰ کے اتنے قریب پہنچ گئے تھے کہ دونوں کے درمیان "صرف دو کمان" کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ یہ روایت جتنی مشہور ہے اتنی ہی غلط ہے۔

لفظ "الیٰ" کا ترجمہ ملا حسین الواعظ نے "بسو" کیا ہے اور اردو ترجمہ میں "کی طرف" کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ باقی مترجمین نے لغوی ترجمہ "تک" لیکن ڈاکٹر سید حمید شطاری نے ان دونوں بزرگوں کی اس جدت کو سراہا ہے، اور ان کے ترجمے کو صحیح بتایا ہے۔[1] لیکن اس کو صحیح کہنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اس لیے کہ قرآن میں مسجد اقصیٰ سے آگے سفر کا کوئی حوالہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس سلسلہ

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک ص ۹۶

میں تمام تفصیلات احادیث سے حاصل کی گئی ہیں جن سب کا مستند ہونا یقینی نہیں۔ اگر معراج کے سفر کی تفصیلات جو بیان کی جاتی ہیں نا قابلِ تردید ہوتیں، صحابہ کے درمیان یہ اختلاف نہ ہوتا کہ بعض اس کو جسمانی کہتے ہیں اور بعض روحانی۔

ترجمہ میں بعض الفاظ پرانے استعمال کیے گئے ہیں اور متعدد الفاظ عربی، فارسی کے وہی استعمال کر دیے گئے ہیں جو تفسیر حسینی میں ہیں۔ جیسے اشجار، انہار، فراقی، میوہ ہا، ارزانی، آسمانہا، احادیث صحیح وغیرہ۔ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو اس زمانہ میں شمالی ہندوستان میں استعمال ہوتے تھے۔ اور دکن میں وہ رائج نہیں تھے۔ ان شواہد کی بناء پر ڈاکٹر شطاری صاحب نے قیاس کیا ہے مترجم کا تعلق شمالی ہند سے ہے۔[1]

تفسیر مرادی از شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی

اس تفسیر کا اصلی نام "خدائی نعمت" ہے۔ جو اس کا تاریخی نام بھی ہے۔ "جمل" کے قاعدہ سے اس نام کے اعداد ۱۱۸۵ برآمد ہوتے ہیں اور خاتمہ کتاب کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مصنف شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی نے ۴ محرم ۱۱۸۵ھ کو اس تفسیر کو اختتام کو پہنچایا تھا۔ لہٰذا "خدائی نعمت" ہی اس کتاب کا صحیح نام ہے لیکن کاتبوں کی لاپروائی کی وجہ سے اکثر مطبوعہ نسخوں میں "خدا کی نعمت" درج ہے جو نہ موزوں معلوم ہوتا ہے اور نہ درست۔

"خدائی نعمت" پارہ عَمَّ کی اردو زبان میں تفسیر ہے۔ اپنی مقبولیت کی وجہ سے یہ کئی بار طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جتنی مرتبہ

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ص ۹۸

یہ طباعت کے مرحلے سے گزری اتنی ہی مرتبہ اس کی عبارت میں ردوبدل اور زبان میں اصلاح ہوئی۔ چنانچہ ۱۲۷۱ھ میں طبع ہونے والے نسخے کے خاتمۃ الطبع میں درج ہے کہ طباعت سے پہلے صحت کے لیے دس بارہ نسخے فراہم کیے گئے تو پتہ چلا کہ ہر ایک میں تحریف ہوئی ہے۔ البتہ ایک نسخہ جس کی ضخامت باقی نسخوں سے دوگنی ہے، تحریف سے بڑی حد تک پاک ہے۔ لیکن ڈاکٹر سید حمید شطاری کا خیال ہے اور اپنے اس خیال میں وہ حق بجانب معلوم ہوتے ہیں کہ "دوگنے حجم کے تعلق سے مرتب کی کسی وضاحت کی عدم موجودگی میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ بقیہ نسخے ہی اصل تفسیر کی نقل ہیں اور سب سے زیادہ تحریف کا شکار وہی نسخہ ہوا ہے جس کا حجم دوچند ہے"[1]

یوں تو پوری تفسیر کے بارے میں یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ اتنی تحریفات کے بعد کونسی عبارت مفسر کی اپنی ہے جس کی بنیاد پر اس کے طرز تحریر کا کچھ اندازہ لگایا جا سکے۔ تاہم بعض قیاسات و قرائن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خاتمہ کتاب میں جو عبارت دی گئی ہے وہ قریب قریب اصلی حالت میں ہے اور اگر اس میں تحریف کا عمل ہوا ہے تو بہت کم۔ ملاحظہ ہو۔

"حمد اور شکر کا سجدہ لائق ہے، سزاوار ہے پاک پروردگار کے تئیں۔ جس خداوند نے اپنے فضل و کرم سے اور حضرت نبی صاحب صلی اللہ علیہ کے طفیل سے "عَمَّ" پارے کی تفسیر ہندی زبان میں تمام کروایا اور اس عاصی گنہگار مراد اللہ انصاری سنبھلی قادری، نقشبندی، حنفی کو یہ خدمت فرما کر توفیق بخش کر اس کے ــــ دل میں اپنے پاک کلام کا بیان بخشا۔ زبان کو باکفوں کو

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک ص ۱۰۷

قوت بخشے، قلم کو کاغذوں کے اوپر جاری کروا دیا۔ یہ خیر کا کام پورا کر دیا۔ پھر اس تفسیر کا نام خدا کے نعمت مقرر کروا دیا۔ یہ تفسیر چوبیسویں تاریخ محرم کے مہینے کے جمعے کے دن تمام ہو چکی۔ حضرت پیغمبر صلعم کے ہجرت کے گیارہ سو برس کے اوپر چوالیس برس گزر چکے تھے۔ پچاسی شروع ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل یہ بندۂ عاجز گنہگار امیدوار ہے جو اس تفسیر کے لکھنے میں، اس کے پڑھنے میں اور پڑھانے میں یہ بندہ اور جو کوئی ہووے پڑھے پڑھاوے ہمیشہ ہمیشہ دنیا میں قبر میں، آخرت میں اس کے برکتوں سے محروم نہ ہووے لکھنے کا، پڑھنے کا پڑھانے کا، سمجھانے کا، سیکھنے کا، سکھانے کا، عمل کرنے کا اور کو عمل بتانے کا ثواب پاتا رہے۔ نعمتیں خوبیاں لیتا رہے۔ پھر رحمت خدا کے اور عنایت اور فضل خدا کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ ہمیشہ پہنچتا رہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تَعَالیٰ اَوَّلًا وَّ آخِرًا۔[1]

مطبوعہ نسخوں میں "ی" معروف اور "ی" مجہول کا عدم فرق اور ضمہ کی جگہ "و" کا استعمال ختم کر دیا گیا ہے لیکن خاتمہ کتاب کی جو عبارت اوپر دی گئی ہے اس میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ خاتمہ کتاب مفسر کا لکھا ہوا ہے اور ترجمہ و تفسیر میں مرتّبین نے اصلاح کر دی ہے۔

---

[1] تفسیر مرادی نمبر مخطوط (۱۰۴۵) ادارہ ادبیات اردو بحوالہ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک ص ۱۰۴

جس طرح اصل تفسیر کے اور مقامات پر ضرورت سے زیادہ تحریف کی گئی اسی طرح شاہ مراد اللہ صاحب کے کیے ہوئے ترجمہ میں اس حد تک رد و بدل کر دیا گیا ہے کہ اب یہ پتہ چلانا مشکل ہو گیا کہ ترجمہ میں کتنا حصہ شاہ صاحب کا ہے اور کتنا مرتبین نے دوسری جگہوں سے لے کر اس میں شامل کر دیا ہے۔ جہاں شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے ترجمہ کی مقبولیت کو دیکھ کر شاہ مراد اللہ کے ترجمہ کی جگہ اس کو رکھ دیا گیا ہے۔ وہاں تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا برکت کے لیے شاہ صاحب کا نام رہنے دیا گیا ہے۔ ورنہ اصل کام شاہ عبدالقادر صاحب کا ہے۔ اگرچہ مرتبین نے یہ تبدیلی بہتر سمجھ کر کی ہے لیکن دیانت داری کے سراسر خلاف ہے۔ بہتر ہوتا اگر شاہ مراد اللہ کے ترجموں کو جوں کا توں باقی رہنے دیا جاتا۔ اور مقابلہ کے لیے شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کو حاشیہ پر لکھ دیا جاتا۔ تاکہ دونوں بزرگوں کے انداز فکر و غور کا فرق بھی معلوم ہو جاتا اور اردو زبان کی تدریجی ترقی کا بھی پتہ چل جاتا۔ بہرحال اس وقت جو چیز سامنے ہے اس کو جانچنے کے لیے قرآن کریم کے متن اور دونوں بزرگوں کا ترجمہ ساتھ ساتھ دیا جا رہا ہے۔

قرآن کا متن	شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کا ترجمہ	شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کا ترجمہ
عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ	کیا بات پوچھتے ہیں لوگ	کیا بات پوچھتے ہیں یہ
الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ كَلَّا	آپس میں اس بڑی خبر سے	لوگ آپس میں اس بڑی چیز سے
سَيَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ	جس میں وے کئی طرف ہو رہے	جس میں وے کئی طرف ہو رہے
اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ	ہیں۔ یوں نہیں اب جان لینگے	ہیں۔ یوں نہیں اب جان لینگے
اَوْتَادًا وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا	پھر بھی یوں نہیں اب جان	پھر بھی یوں نہیں اب جان
(۳۰: ۱ : ۷)	لیں گے۔ کیا ہم نے نہیں بنائی	لیں گے کیا ہم نے نہیں بنایا

زمین بچھونا اور پہاڑیں میخیں	زمین بچھونا؟ اور پہاڑ میخیں
اور پیدا کیا ہم نے تم کو جوڑے جوڑے۔	اور تم کو بنایا جوڑے جوڑے۔

خط کشیدہ ٹکڑے میں شاہ رفیع الدین محدث دہلوی سے مماثلت ہے باقی تمام ترجمہ شاہ عبدالقادر کی نقل ہے۔ البتہ کہیں کہیں فرق ہے۔ جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے وہ شاہ مراد اللہ کی اپنی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں بجائے مفسر کے شاہ صاحب ایک واعظ معلوم ہوتے ہیں۔ جس طرح کوئی واعظ اپنی بات سامعین کے ذہن نشین کرانے کے لیے کثرت سے مترادفات کا استعمال کرتا ہے اس طرح شاہ صاحب نے تفسیر میں کیا ہے۔ اس سے عبارت کی فصاحت و روانی میں ضرور خلل واقع ہوا ہے تاہم عبارت میں زور اور اثر پیدا ہو گیا جو ایک عام قاری کے لیے مفید ہے۔ تفسیر میں زبان صاف اور سادہ استعمال کی گئی ہے۔ مترادفات کے استعمال سے مفہوم میں زور اور تفہیم میں سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ نمونہ کے لیے سورۂ ضحیٰ کی ایک آیت وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ کی تفسیر پیش ہے۔

"اور مقرر شتاب عطا کرے گا۔ دیوے گا۔ بخشے گا تجکو یا" محمد" پاک پروردگار تیرا کہ پر راضی ہووے گا۔ تو وے وے نعمتیں خوبیاں بخشے گا تجکو یا "محمد" پیدا کرنے والا تیرا آخرت میں جو تو خوش ہو جاوے گا۔ سب طرح کی فکریں جاتی رہیں گی۔ تمام عالم کی شفاعت کا درجہ مقام محمود۔ تمام امت کی شفاعت کا حکم، بہشت کی بڑی بڑی نعمتیں، بے حد، بے نہایت، ہمیشہ کا دیدار، ایسی بڑی خوبیاں تیرے واسطے رکھی ہیں۔ خاطر کو خوش رکھ۔ ان کافروں، مشرکوں کے طعنے مارے میں غمگین ناخوش مت ہو۔ کوئی دن میں بے سبب

باتیں جاتی رہیں گی۔ تم کو خوشی ہمیشہ رہے گی۔

روایت ہے جب یہ آیت نازل ہوئی حضرت رسول (ص م) خوش ہوئے اور فرمایا میں ایک آدمی کی بھی میری امت کے دوزخ میں رہنے کا راضی نہیں ہونے کا۔ یہ بات امت کے واسطے بڑی خوش خبری ہے۔ تھوڑے سے بہتیت ہے۔ پہلے حال سے آخر کا حال بہتر ہے۔ دنیا سے بہتر ہے۔"[1]

اگر یہ تمام عبارت واقعی شاہ مراد اللہ انصاری کی ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اب سے سوا دو سو سال پہلے شمالی ہند میں اردو نثر بھی کافی منجھ گئی تھی۔

تفسیر مرتضوی (منظوم)

یہ ایک منظوم تفسیر ہے اور پارہ عم تک محدود ہے۔ غالباً اردو نظم میں یہ سب سے پہلی تفسیر ہے جو مغل فرماں روا شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں لکھی گئی۔ اس کے مصنف غلام مرتضیٰ جنون، میر و سودا کے ہم عصر تھے لیکن ان کا ذکر شعراء کے تذکروں میں نہیں ملتا۔ صرف نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے گلشن بے خار میں لالہ سری رام نے خم خانہ جاوید میں سرسری طور پر ان کا ذکر کیا ہے۔ شیفتہ کے الفاظ یہ ہیں۔

شاہ غلام مرتضیٰ الہ آباد کے برگزیدہ لوگوں میں سے تھے۔ زہد و تقویٰ میں مشہور و معروف تھے۔ عرفا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شعر و سخن سے بھی تھوڑی بہت رغبت تھی۔ ان کی فکر کا نمونہ یہ ہے:

---

[1] قدیم اردو صفحہ ۱۳۱ بحوالہ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۱۰۲

تری چشم مست نے ساقیا یہ سیاہ مست جنوں ہوا
کہ مے دو آتشہ طاق پر جو دھری تھی وہ وہیں دھری رہی[1]

خم خانہ جاوید میں مرقوم ہے۔

"شاہ غلام مرتضیٰ متخلص بہ جنوںؔ متوطن عظیم آباد پٹنہ و ہم عصر مرزا رفیع السودا۔ مہذب صورت پاکیزہ سیرت، نہایت خوش مذاق، اکثر فنون میں قابل اور کامل۔ بڑھاپے میں نابینا ہو گئے تھے مگر مشق سخن میں وہی انہماک تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ لکھتے ہیں کہ ان کا وطن الٰہ آباد تھا اور زہد و تقویٰ میں مشہور تھے۔ دیوان ریختہ بھی مرتب کیا تھا۔"[2]

ڈاکٹر سید حمید شطاری مخطوط تفسیر (۷) کتب خانہ سالار جنگ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"تفسیر مرتضوی کے دیباچہ اور خاتمہ کتاب کے اشعار سے جو معلومات ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ غلام مرتضیٰ شاہ عالم بادشاہ کے عہد کا ایک اچھا شاعر گزرا ہے۔ اس کے والد کا نام شاہ محمد تیمور تھا جو الٰہ آباد کے متوطن تھے۔"[3]

نمونہ کلام کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غلام مرتضیٰ جنوںؔ ایک اوسط درجہ کے شاعر تھے۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ دار الحکومت سے دور ہونے کے سبب وہ مشہور

---

۱ گلشن بے خار اردو ترجمہ جناب محمد احسان الحق فاروقی ایم۔ اے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ کراچی۔ سنہ اشاعت ۱۹۶۲ء ص ۱۵۶

۲ خم خانہ جاوید جلد دوم ص ۲۷۰ بحوالہ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (ڈاکٹر سید حمید شطاری) ص ۱۱۹ ۳ ایضاً ص ۱۲۰

نہ ہو سکے اور ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں تک نے ان کا ذکر نہیں کیا۔

بہرحال ان کی شاعرانہ عظمت سے قطع نظر یہ بات نہایت اہم ہے کہ دینی رجحان ہونے کی بنا پر انہوں نے قرآن کریم کے اس پارہ کی تفسیر لکھنے کی طرف توجہ کی جس کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کی جاتی ہے۔ خواص ہی کو نہیں عوام کو بھی دن میں پانچ مرتبہ نمازوں میں اس کی سورتیں پڑھنی ہوتی ہیں اور ان سورتوں میں زیادہ سے زیادہ عقائد بیان ہوتے ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیت کو اس زمانہ میں پارہ "عم" کی منظوم تفسیر لکھنے میں ظاہر کی جب اس کا کوئی نمونہ بھی ان کے سامنے نہیں تھا اور اردو شاعری میں اس طرح کے مضامین کو بیان کرنا دقت طلب تھا لیکن عزم و ہمت کے سامنے کوئی دقت و دشواری باقی نہیں رہتی۔ بہرحال غلام مرتضیٰ جنون نے اپنے دینی رجحان سے متاثر ہو کر اور اس نیک کام کی ضرورت و اہمیت کا احساس کرتے ہوئے یہ تفسیر لکھی اور اس کی تکمیل کے بعد خواب میں امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اظہار پسندیدگی فرمایا جس کا ثمرہ یہ ہوا کہ جب یہ منظر عام پر آئی تو بے حد مقبول ہوئی۔ چنانچہ خاتمہ کتاب میں مفسر نے یہ تفصیلات اس طرح بیان کی ہیں۔

"دربیان خاتمۂ کتاب"

ذکر حق میں ایک شب اے دوستاں
میں گیا بے خود یہ اوج آسماں

دیکھتا ہوں کہ ہر چرخ بریں
بیٹھے ہیں حضرت امیر المومنیں

تخت زریں پر بہ اعزاز تمام
ہیں ملک ہر سو برائے اہتمام

اولیا ہیں دست بستہ با ادب
خاموشی سے صورت دیوادب

جاکے در پیش شہ عالی مقام
باادب ہو کے کیا میں نے سلام

عرض کی میں نے کہ یا حضرت امام | حکم سے تفسیر کے لایا غلام
دونوں جلدیں رکھ کے دونوں ہاتھ پر | لے گیا میں نذر کو پیشِ نظر
پایا حضرت کی مدد سے انصرام | ورنہ ہو سکتا تھا کب مجھ سے یہ کام
دونوں لیں دستِ مبارک سے اٹھا | دیر تک دیکھا کیے شیرِ خدا
تب یہ فرمایا بہ آوازِ بلند | تیری محنت کو کیا ہم نے پسند
خوش ہوئے ہم اس تری تفسیر سے | تیری اس تحریر اور اس تقریر سے
دوست جو اس کو رکھا ہم نے بجاں | دوست رکھیں گے اسے سب مومناں

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اظہار پسندیدگی کے بعد مفسر سے دریافت کیا کہ وہ اس کا کیا صلہ چاہتا ہے۔ مفسر نے یہ اشارہ پا کر اپنا مدعا اس طرح بیان کیا:

مانگتا ہوں تم سے اے حق کے حبیب | دولتِ دارین ہو اس کو نصیب
اور رہے جس گھر میں دائم یہ کتاب | وہ رہے آباد تا روزِ حساب
اور جو اس کو پڑھے باعتقاد | اس کی حاصل ہووے سب دل کی مُراد

اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ نہ صرف مفسر کی زندگی میں بلکہ کافی عرصہ بعد تک تفسیر خاصی مقبول رہی۔ چنانچہ جس سنہ میں یہ لکھی گئی اس کے پورے پینسٹھ سال بعد مولوی عبد الماجد بن حکیم مولوی عبد المجید نے مطبع طبعی کلکتہ (؟) سے چھپوا کر شائع کی۔ لیکن امتدادِ زمانہ سے اس کی مقبولیت ختم ہو گئی اور اب یہ تفسیر تقریباً نایاب ہے۔ ڈاکٹر سید حمید شطاری صاحب کی تحقیق کے بموجب:

"مطبوعہ نسخوں کے علاوہ اس کے صرف چار مخطوطات دریافت ہوئے ہیں۔ کتب خانہ سالار جنگ میں دو مخطوطے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو میں ایک اور مولوی عبد الحق کے پاس بھی ایک مخطوطہ تھا"[1]

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (ڈاکٹر شطاری) ص ۱۱۶

کتب خانہ سالار جنگ کے مخطوطوں کے نمبر (۷) اور (۸) ہیں۔ لیکن ڈاکٹر شطاری صاحب نے ان دونوں نسخوں کے جو اشعار بطور نمونہ دیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخطوطہ نمبر (۸) کے مقابلہ میں مخطوطہ نمبر (۷) کہیں زیادہ صحیح ہے۔

مفسر نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لقب اور اپنے نام غلام مرتضیٰ کی رعایت سے تفسیر کا عنوان "تفسیر مرتضوی" قرار دیا۔ چنانچہ "در سبب تصنیف کتاب" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

دل لگا کہنے بوقتِ اختتام | اس کا رکھ تفسیر مرتضوی تو نام
کیوں کہ تو ہے گا غلامِ مرتضیٰ | حکم سے مولا کے ہے اس کو لکھا
سنہ ہجری ان دنوں تو جان لے | یکہزار اور ایک سو چورانوے

آخری شعر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس تفسیر کا سنہ تصنیف ۱۱۹۴ ہجری ہے[1]۔

حمد و نعت کے بعد تفسیر شروع ہوتی ہے۔ چونکہ یہ تفسیر عَمَّ کے سیپارہ کی ہے اس لیے مخطوطہ نمبر (۷) میں سورہ "فاتحہ" کی تفسیر نہیں دی گئی اور سورہ النبأ کی تفسیر سے اس کا آغاز کیا گیا ہے۔ اور سورہ الناس پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اندازِ تفسیر ملاحظہ ہو:[2]

—— عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ (یہ لوگ جس چیز کے بارے میں پوچھ کچھ کر رہے ہیں)

اصل تھا عن ما اے پسر | نون کے تئیں کر میم پھر ادغام کر
کر الف کو حذف سن معنی بجاں | پوچھیں آکس چیز سے یہ کافراں

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ (ڈاکٹر سید حمید شطاری) ۱۱۸ [2] ایضاً ص ۱۲۴

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (کیا اس بڑی خبر کے بارے میں جس کے متعلق یہ مختلف چہ مگوئیاں کرتے ہیں لگے ہوئے ہیں)۔

اس خبر سے کہ بڑی ہے بے خلاف　　کرتے ہیں سب جس میں باہم اختلاف
یا کتاب اللہ ہے بناء عظیم　　قول شاعر جس کو کہتے ہیں لئیم
یا کہیں ہے سحر یا ہے مفتراہ　　نزد بعضے ہے کلام کبریاہ
یا محمد ہے کہ جمیع مومنین　　اس کے تبعؑ کہتے ہیں ختم المرسلین
اور اسے کہتے بعضے ساحر کافراں　　شاعر و مجنوں گروہ مشرکاں
پاک ہے اس بناء سے محترم مراد　　اس سے نہ آگاہ خیر رب العباد

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: هٰؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ

عزیٰ کو کہتے ہیں حق ہے مشرکاں　　ہم کو بخشا دیں پیش حق بناں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا

منکران حشر کہتے ہیں ہنوز　　نہ مگر یہ زندگی ہے چند روز

اللہ تعالیٰ کا قول ہے: بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا

اور کہتے ہیں شکیں زاں بناء عظیم　　کیونکہ ہوں گے زندہ یہ عظیم رمیم
تا کہ دور ہو جائے قول ناصواب　　یہ دیا کفار کو حق نے جواب

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (ہرگز نہیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا)

جا بئیں گے جب کہ قوم منکراں　　روز مرگ، وقت نزع روح جاں
یعنی جب ہوں گے فرشتے آشکار　　تب یقیں جانیں گے قوم نابکار

ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (ہاں ہرگز نہیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا)

پس یقیں جانے گی یہ قوم پلید　　جب عذاب قبر ہو جائے گا شدید
کہ وقوع بعث میں کچھ شک نہیں　　ہم کو خبر دوزخ کے اب مسلک نہیں

پایۂ تکرار از پئے تاکید ہے　　کہ نہ ان اندھوں کو چشم دید ہے
پھر کہے حق نے برائے منکراں　　یہ دلائل اپنی قدرت کی بیاں
کتنے زیر پا ہیں کتنے فوق سر　　کتنے ان کی ذات میں ہیں جلوہ گر

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا (کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا)۔

آیا یہ ہم نے کیا ہے خاک سے　　فرش گسترده تمہارے واسطے
ہے بچھائی ہم نے پانی پہ زمیں　　مردہ اور زندوں کے رہنے کے تئیں

وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا (اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا)۔

اور کیا کوہوں کو میخیں استوار　　تا نہ کانپے اور زمیں پکڑے قرار

وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا (اور تمہیں (مردوں اور عورتوں کی) جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا)۔

اور تمہیں پیدا کیا ہے ہم نے جفت　　ای نر و مادہ کو بے گفت و شنفت
یعنی زن اور مرد کو پیدا کیا　　ایک کا دل ایک پر شیدا کیا
تا کہ ان دونوں سے پیدا ہو پسر　　جیسے آب و خاک سے کشت و ثمر
یا ازواج سے ہے قسم قسم　　مختلف در صورت والوان و جسم

وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (اور تمہاری نیند کو باعث سکون بنایا)

اور کیا ہم نے تمہارے خواب کو　　موجب راحت تن بے تاب کو
ای کیا ہے ہم نے خواب مرد ماں　　راحت چشم و جناں و جسم و جاں

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا (اور رات کو پردہ پوش بنایا)

اور گردانا ہے ہم نے رات کو　　پردہ کار بد و کار نکو
شیخ اکبر کے سخن پر کر تو میل　　معنی سب ہے پردۂ اصحاب لیل
شب ملاقی ہے انہوں کو یار سے　　کر کے پنہاں دیدۂ اغیار سے

تاکہ اس خلوت میں ان کو یا حبیب لذتِ دیدار ہوتے ہیں نصیب
ہوتے ہیں محبوب جاتے ہم کلام پیتے ہیں جام حضوری کو مدام
درخورِ احوال واستعداد خویش ہووے برخوردار ہر درویش ریش
یہ سخن سن لے تو تبعِ اسلام کا ہے یہ نکتہ سالکوں کے کام کا
یعنی شب ہے پردہ دارِ سالکاں پردہ پوشِ کارِ وبارِ عاشقاں
شب ہے پردہ گریۂ عشاق کا شب ہے پردہ عاشقِ مشتاق کا
شب ہے پردہ دیدۂ بے خواب کا شب ہے پردہ عاشقِ بے تاب کا
شب دلِ عشاق کی ہے رازدار عاشق و معشوق کی ہے غم گسار
کہتے ہیں اہلِ وصالِ دوست سب کاش تا صبحِ قیامت رہتی شب

وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (اور دن کو معاش کا وقت بنایا)

اور کیا ہیں روز کو وجہِ معاش تا کرو تم اس میں روزی کی تلاش

یہ سورہ "اَلنَّبَاء" کی ١١ آیتوں کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ ترجمہ آیتوں کے سامنے اس لیے دے دیا ہے تاکہ تفسیر کو سمجھنے میں مدد ملے۔ واضح رہے کہ تفسیر تقریباً سوا دو سو سال پرانی ہے اس لیے اس لیے آج کل کی زبان کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اس میں بے کیفی اور بے لطفی محسوس ہو گی۔ جس زمانہ میں یہ تفسیر لکھی گئی وہ میر اور سودا کا زمانہ تھا۔ اس وقت ان عظیم شعرا کی زبان میں بھی بعض ایسے الفاظ اور محاورات استعمال ہوئے ہیں جو آج کل اجنبی اور متروک سمجھے جاتے ہیں۔ اس وقت کے اسالیب اور طرزِ ادا میں بھی بڑی حد تک اجنبیت اور پرانا پن محسوس ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اکثر شعرا نے اپنے کلام میں مجرد جذبات واحساسات کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے اس لیے ان کے کلام میں اثر و تاثیر آج بھی محسوس کی جاتی ہے لیکن تفسیر کلام اللہ میں ان چیزوں کی توقع رکھنا عبث ہے۔ قرآن کریم کے جو منظوم ترجمے ماضی قریب میں ہوئے ہیں ان میں بھی

شاعرانہ لطافت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں تفسیر مرتضوی پر جو غالباً اردو زبان میں سب سے پہلی کوشش ہے کسی طرح کا کوئی اعتراض قطعاً نامناسب ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی یہ رائے اپنی جگہ درست ہے کہ "ایسی چیزوں کا ترجمہ اور وہ بھی نظم میں، سراسر بے لطف ہو جاتا ہے" بے شک خالق کے کلام کا ترجمہ اسی زور اور اثر کے ساتھ نثر میں ہونا بھی ناممکن ہے چہ جائیکہ نظم میں۔ لیکن جس طرح عربی سے نابلد لوگوں کے لیے نثر میں ترجمہ ضروری سمجھا جاتا ہے، اسی طرح ترجمہ اور تفسیر کے لیے نظم کو بھی ذریعۂ اظہار بنانا ایک مستحسن فعل ہے۔ اس لیے کہ منظوم کلام نثر کے مقابلہ میں یقیناً موثر ہوتا ہے۔ غلام مرتضیٰ صاحب قابلِ تعریف ہیں کہ انہوں نے شعرا کو ایک نئی راہ دکھائی۔

تفسیر موضح قرآن

حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی

علوم شرعیہ کی ترویج و اشاعت میں خانوادۂ ولی اللہی کے جہاں اور بہت سے کارنامے ہیں ایک کارِ عظیم یہ بھی ہے کہ مکمل قرآن کریم کا اردو ترجمہ اور اس پر تفسیری حاشیہ بھی سب سے پہلے اسی خاندان کی ایک مقدس ہستی نے تحریر کیا۔ یہ ہستی حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کی تھی جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے تیسرے یا چوتھے فرزند تھے[1]۔ چونکہ ان کے

[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی فاطمہ بنت شیخ عبید اللہ سے ایک صاحبزادے تولد ہوئے جن کا نام "محمد" تھا یہ شاہ صاحب کے (باقی اگلے صفحہ پر)

برادر بزرگ حضرت شاہ رفیع الدینؒ نے جو تحت اللفظ ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ اس کی تصنیف کا سنہ معلوم نہیں ہے۔ اس لیے بعض حضرات قیاس کی بنیاد پر اس کو سب سے پہلا ترجمہ قرار دیتے ہیں۔ تاہم اگر ان کی اس بات کو صحیح مان لیا جائے تب بھی شاہ عبدالقادرؒ صاحب اس ترجمہ اور تفسیر کو اولیت کا مقام حاصل رہے گا۔ اس لیے کہ اول تو یہ ترجمہ بامحاورہ ہے اور شاہ رفیع الدینؒ صاحب کا تحت اللفظ۔ دوم اول الذکر پر تفسیری حاشیہ بھی ہے جبکہ مؤخر الذکر معری ہے۔

"موضح قرآن کو غلطی سے "موضح القرآن" کے نام سے شہرت دے دی گئی ہے۔ لیکن چونکہ اس ترجمہ اور تفسیر کا سنہ تصنیف ۱۲۰۵ھ ہے اور موضح قرآن کے اعداد بھی جمل کے قاعدہ سے ۱۲۰۵ نکلتے ہیں اس لیے یہ اس کا تاریخی نام ہوا۔ لہٰذا یہی صحیح ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے برصغیر میں جس اہتمام سے علوم شرعیہ کی اشاعت کی مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے اپنے زمانہ میں فارسی زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر ضروری سمجھا کہ قرآن کریم کا فارسی ترجمہ کریں۔ قرآن کریم کے لیے ترجمہ کا مسئلہ نازک اور اختلافی تھا اور فارسی ترجمہ بھی بڑی جرأت کا کام تھا۔ یہ ترجمہ خاصا مقبول

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) سب سے بڑے بیٹے تھے۔ آپ نے دوسری ۴۳ سال کی عمر میں سیدہ ارادت بنت سید ثناء اللہ سونی پتی سے کی۔ ان سے آپ کے چار صاحبزادے ہوئے جن کے نام ترتیب وار یہ ہیں (۱) شاہ عبدالعزیز (۲) شاہ رفیع الدین (۳) شاہ عبدالقادر (۴) شاہ عبدالغنی۔ اگر شاہ محمد صاحب کو بھی ملا لیا جائے تو شاہ عبدالقادر کا نمبر چوتھا ہوتا ہے۔ اور اگر چاروں سگے بھائیوں کے حساب سے دیکھا جائے تو آپ کا نمبر تیسرا رہ جاتا ہے (بحوالہ "شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان" مولفہ حکیم محمود احمد برکاتی ص ۱۴۴ تا ۱۶۶)

ہوا لیکن نصف صدی گزرنے کے بعد اردو زبان نے فارسی کی جگہ لے لی۔ اور عوام کے لیے شاہ صاحب کے فارسی ترجمہ سے استفادہ کرنا مشکل ہو گیا یہ دیکھ کر ان کے فرزند حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے آسان اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا تاکہ عوام کو قرآن فہمی میں مدد ملے۔ یہ گویا اصولِ ترجمہ و تفسیر ہیں۔ جو غالباً اس تفصیل سے پہلی مرتبہ بیان ہوا ہے۔ انہوں نے دیباچہ میں ان باتوں کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اس کے کلام میں جو ہدایت ہے دوسرے میں نہیں۔ پر کلام پاک اس کا عربی زبان میں ہے اور ہندوستانی کو اس کا ادراک محال ہے۔ اس واسطے بندہ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے والد بزرگوار حضرت شیخ ولی اللہ بن عبدالرحیم محدث دہلوی ترجمہ فارسی کو کیے ہیں، سہل و آسان آپ ہندی زبان میں قرآن شریف کو ترجمہ کرے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہ سنہ ۱۲۰۵ھ (بارہ سو پانچ) میں میسر ہوا۔ اب آگے کی زبان میں معلوم رکھے۔ اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بلفظ ضرور نہیں کیونکہ ترکیب ہندی، ترکیب عربی سے بہت بعید ہے۔ اگر بعینہ وہ ترکیب رہے تو معنی مفہوم نہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ[1] نہیں بولی تاکہ عوام کو بے تکلف دریافت ہو۔ تیسرے یہ کہ ہر چند ہندوستانیوں کو معنی قرآن اس میں آسان ہوئے لیکن ابھی اوستاد سے سند کرنا لازم ہے۔ اول معنی قرآن بغیر سند معتبر نہیں۔ دوسرے ربط کلام ماقبل و مابعد سے پہچاننا اور قطع کلام سے بچنا بغیر اوستاد نہیں آتا۔ چنانچہ قرآن عربی زبان ہے اور عرب بے محتاج استاد نہیں۔ چوتھے یہ کہ فقط ترجمہ قرآن

[1] ریختہ یعنی زبان شعر اور ہندی معنی اردو ئے قدیم کے فرق کے احساس کی اہمیت۔

ہوا تھا۔ بعد اوسکے لوگوں نے خواہش کی تو بعضے فوائد زائد بھی متعلق تفسیر داخل کیے۔ اوس فائدہ کے امتیاز کو حرف (ف) نشان رکھا۔ اگر کوئی مختصر چاہے صرف ترجمہ لکھے، اگر مفصل چاہے فوائد بھی داخل کرے باقی قواعد خط ہندی کہنے میں طول ہے۔ اوستاد سے معلوم ہوں گے۔ البتہ ہندی میں بعضے چیز لکھیں ہیں کہ فارسی میں نہیں۔ اس سبب سے فارسی خواں اول اٹکتا ہے۔ دو چیز دیکھے تو ماہر ہو جاوے اور "اوس کتاب کا نام موضح قرآن ہے۔ اور یہی اس کی صفت ہے اور یہی اس کی تاریخ بھی۔"

اس عبارت سے کئی باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔

(۱) جس زمانہ میں یہ ترجمہ اور تفسیری حاشیہ لکھا گیا اس وقت بھی آج کل کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کے لیے عربی زبان کا سمجھنا محال ہو گیا تھا۔

(۲) حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تقریباً نصف صدی پہلے فارسی زبان میں جو ترجمہ کیا تھا وہ بھی عوام کے لیے قابلِ فہم نہیں رہا تھا جس کی وجہ سے شاہ عبد القادر صاحب کو ہندی (اردو) میں ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

(۳) اس زمانہ میں شعرائے اردو جو زبان استعمال کرتے تھے وہ عوام کی روزمرہ کی زبان سے مختلف تھی۔ اور ریختہ کہلاتی تھی۔ عام بول چال کی زبان کو ہندی یا ہندوی کہا جاتا تھا چونکہ شاہ عبد القادر نے ترجمہ اور تفسیری حاشیہ خصوصیت سے عوام کے لیے لکھا تھا اس لیے وہ عام بول چال کی زبان یا ہندی کو کام میں لائے اور ریختہ سے اجتناب برتا۔ چنانچہ واضح طور پر لکھتے ہیں: "دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف تا عوام کو بے تکلف دریافت ہو۔"

(۴) ترجمہ اور تفسیری حاشیہ میں عام فہم زبان استعمال کرنے کے باوجود شاہ صاحب قرآن کو سمجھنے کے لیے استاد کی مدد کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں

وہ فرماتے ہیں "لیکن ابھی استاد سے سند کرنا لازم ہے۔ اول معنی قرآن بغیر سند معتبر نہیں۔ دوسرے ربط کلام ماقبل و مابعد سے پہچاننا اور قطع کلام سے بچنا بغیر استاد نہیں آتا۔"

(۵) شاہ عبد القادرؒ صاحب اپنے بڑے بھائی شاہ رفیع الدینؒ صاحب کے ترجمہ قرآن کا کوئی حوالہ نہیں دیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک شاہ رفیع الدینؒ صاحب کا ترجمہ منصۂ شہود پر نہیں آیا تھا۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو جو لوگ شاہ عبد القادرؒ صاحب کے ترجمہ کو اردو زبان میں ہونے والا سب سے پہلا ترجمہ کہتے ہیں۔ وہ حق بجانب ہیں۔

(۶) شاہ عبد القادرؒ صاحب کے پیش نظر آسان اردو (ہندی) زبان میں صرف ترجمہ پیش کرنا تھا۔ مگر بعض لوگوں کے مشورہ دینے سے مختصر تفسیری حواشی بھی لکھے لیکن ان میں بھی عوام کی سہولت کا خیال رکھا اور ان کو نہ طویل ہونے دیا اور نہ مبہم و معلق۔

(۷) شاہ صاحب نے خود ترجمہ اور تفسیری حواشی کا نام "موضح قرآن" بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ "یہی اس کی صفت ہے اور یہی اس کی تاریخ بھی۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ "موضح القرآن" بعد کی اختراع ہے۔ شاہ صاحب نے فارسی ترکیب استعمال کی تھی۔ معتقدین نے شاہ صاحب کی توضیح پر غور کیے بغیر حسنِ عقیدت کی بناء پر کلام اللہ کے ترجمہ اور تفسیری حاشیہ کا نام عربی ترکیب کے ساتھ "موضح القرآن" لکھنا ضروری سمجھا اور بعد میں یہی نام چل پڑا۔ اصلی نام کی طرف سے سب کی توجہ ہٹ گئی۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ شاہ عبد القادر صاحب کے ترجمہ قرآن کی بعد کے تمام علماء نے تعریف کی ہے اور ہر زمانہ میں اس کو معیاری قرار دیا ہے۔ اکثر مترجمین نے قرآن کریم کا ترجمہ کرتے وقت شاہ صاحب کے اس ترجمہ کو

سامنے رکھنا ضروری سمجھا ہے۔ یہ امر واقعی حیرت خیز ہے کہ جس زمانہ میں یہ ترجمہ کیا گیا اس وقت تک مکمل قرآن کریم کے ترجمہ کا تو سوال ہی کیا ہے اردو نثر کے نمونے کم تھے۔ پھر شاہ صاحب نے ترجمہ میں جو اہتمام کیا ہے اور صحت کا جتنا خیال رکھا ہے اتنا موجودہ زمانہ میں بھی جب اردو زبان ارتقاء و ترقی کے کتنے منازل طے کر چکی ہے کسی متنفس کے لیے رکھنا مشکل ہے۔ آپ نے بہت سوچ بچار کے بعد ترجمہ میں موزوں ترین الفاظ استعمال کیے تاکہ غیر موزوں الفاظ کے استعمال سے قرآن کریم کے مفہوم و مدعا کو سمجھنے میں غلطی یا الجھن نہ پیدا ہو۔ اس التزام کے ساتھ کہ عربی، فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ بھی استعمال نہ ہوں اور زبان عوام کی فہم اور روزمرہ کے مطابق بھی رہے۔ موزوں الفاظ کا ڈھونڈ نکالنا شاہ صاحب جیسے ہی محتاط اور عزم و ہمت والے انسان کا کام تھا۔ یہ اسی احتیاط اور تلاش و جستجو کا نتیجہ تھا کہ "آپ نے اس ترجمے کو ۲۲ سال کی طویل مدت کے اعتکاف میں پورا کیا اور تکمیل کا سنہ ۱۲۰۵ ہجری ہے[1]۔"

شاہ عبدالقادر صاحب نے جو اختصار ترجمہ میں برتا اسی کو آپ تفسیر میں بھی عمل میں لائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ اور تفسیری حاشیہ لکھتے وقت اول سے آخر تک آپ کے سامنے طبقہ عوام رہا۔ اس لیے نہ آپ نے صرفی و نحوی مسائل پر زور دیا، نہ فلسفیانہ موشگافیوں سے کام لیا اور نہ اسرائیلیات میں الجھے یا دوسروں کو الجھایا۔ بلکہ جہاں ضرورت سمجھی چند الفاظ میں بات کہہ دی اور آگے بڑھ گئے۔ ظاہر ہے عوام کو لمبی چوڑی بحثوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ تو مختصر الفاظ میں بات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحب نے ان کی نفسیات سامنے رکھ کر اور ضرورتوں کا احساس کرتے ہوئے "ما قلّ و دلّ" کے

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (ڈاکٹر سید حمید شطاری) ص ۱۴۴

زریں اصول کو برتا ہے۔ شروع سے آخر تک آپ کا یہی انداز ہے۔ نمونہ کے لیے چند مثالیں پیش ہیں:

قرآن کریم کی پہلی سورۃ "الفاتحہ" ہے۔ اس میں کل سات آیتیں ہیں۔ اسی لیے اس کو سبع مثانی بھی کہا جاتا ہے۔ ان سات آیتوں میں وہ جامعیت ہے کہ بندہ کی دونوں جہان کی ضرورتیں سمٹ کر اس میں جمع ہو گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بندہ کی جانب سے دعائیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو سکھائی ہیں۔ اور ان کو بار بار دہرانے کی ہدایت کی ہے۔ تاکہ اس کے ذہن میں یہ بات تازہ ہوتی رہے کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جو ہماری دین و دنیا کی جملہ سعادتوں کی ضامن ہیں۔ بندہ کی ان دعاؤں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پورا قرآن نازل کیا جس میں اس کی حیات دنیوی اور اخروی کے تمام مسائل بیان کر دیے اور بتادیا کہ اگر تم اپنی دعاؤں میں مخلص ہو تو اس کتاب میں درج طریقوں کو اپنے عمل کی بنیاد بناؤ۔ یہی تمہیں ہدایت کے راستہ پر چلائے گی اور جو کچھ تم چاہتے ہو وہ تمہیں اس سے حاصل ہوگا۔" شاہ صاحب نے پوری سورت کا ترجمہ کر کے اس کی تفسیر مختصراً ان الفاظ میں بیان کر دی۔

"ف۔ یہ سورت اللہ صاحب نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ اس طرح کہا کریں[1]۔"

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بعض باتیں سمجھانے کے لیے ایسی چیزوں کی مثالیں دیتا ہے جو انسان کے مقابلہ میں اور اس کے نزدیک بہت کم حیثیت اور حقیر ہیں۔ نزول قرآن کے وقت کفار یہ اعتراض کرتے تھے کہ اللہ کو کیا ہو گیا ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کی مثال دیتا ہے۔ بلکہ اس سے بڑھی اور وسیع

[1] عکسی قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر موضح القرآن۔ تاج کمپنی لمیٹڈ۔ قرآن منزل لاہور حاشیہ ص ۲

اشیاء موجود نہیں ہیں کہ ان کی مثالیں دی جائیں۔ ان کم عقلوں کے دماغ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ

(۱) ان چیزوں کی مثالیں ہی تو زیادہ موثر ہوں گی جو ہر وقت انسان کے سامنے رہتی ہیں اور جن کے مخصوص حالات کا اس کو دن رات تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ جیسے مکھی، مکڑی، چیونٹی، گدھا، اونٹ وغیرہ۔

(۲) مثال میں موزونیت کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے۔ جیسے کسی چیز کی کمزوری کو ظاہر کرنا ہو تو اس کے لیے مکڑی کے جالے کی مثال سے بہتر کوئی مثال نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں ان کو یہ سہارا قطعاً کوئی سہارا نہیں دے گا اس لیے کہ یہ سہارا مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ کلام پاک کے الفاظ ملاحظہ ہو:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ (۲۰ : ۴۱)

ترجمہ:۔ جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے، اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے۔

یہاں تشبیہ اور مثال کے لیے مکڑی کے جالے کو کام میں لایا گیا ہے۔ اس موقع کے لیے اس سے بہتر کوئی مثال ہو سکتی تھی۔ اس وقت تو کفار نے اس قسم کی مثالوں پر اعتراض کیا تھا لیکن بعد میں یہ مثال اتنی مقبول ہوئی کہ اب یہ محاورہ بن گیا۔ "ان دو آدمیوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ تارِ عنکبوت ثابت ہوا۔"

اسی طرح پڑھے لکھے جاہلوں کے لیے یہ کہا جاتا ہے۔ "گدھے پر کتابیں لدی ہوئی ہیں۔" قرآن کریم میں آج سے چودہ سو سال پہلے فرما دیا تھا:

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا

ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔

نیز گدھے کی صوت یا آواز کو بدترین آواز بھی قرار دیا ہے۔

اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ۔

(۳) سوچنے کی بات ہے کہ کفار اپنے مقابلہ میں چیونٹی، مکھی اور مکڑی کو حقیر سمجھ کر ان کی مثال دینے پر اعتراض کر رہے ہیں لیکن اللہ کے نزدیک تو نہ صرف انسان بلکہ پوری کائنات میں مکھی اور مکڑی سے زیادہ حقیر ہیں البتہ مخلوق ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ لہٰذا انسان کو سمجھانے کے لیے وہ کسی چیز کی بھی مثال دے سکتا ہے۔ بہرحال کفارِ مکہ کی جانب سے جب یہ اعتراض ہوا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کا یہ مختصر سا جواب دیا گیا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ (۱ : ۲۶)

اللہ کچھ شرماتا نہیں کہ بیان کرے کوئی مثال ایک مچھر یا اس سے اوپر۔ پھر جو یقین رکھتے ہیں، سو جانتے ہیں کہ وہ ٹھیک ہے انکے رب کا کہا۔

اس پر شاہ صاحب نے یہ تفسیری حاشیہ تحریر فرمایا ہے۔

ف۔ قرآن شریف میں کہیں مثال فرمائی ہے مکڑی کی کہیں مکھی کی۔ اس پر کافر عیب پکڑتے تھے کہ اللہ کی شان نہیں کہ ان چیزوں کا ذکر تا۔ یہ کلام

اس کا ہوتا تو ایسے مذکور نہ ہوتے۔ اس پر یہ دو آیتیں فرمائیں۔ موجودہ سائنس نے تو حقیر ترین جسم وائرس اور ایٹم (جوہر) کو جو اہمیت دی وہ پیش نظر رہے۔

قرآن کریم میں انسان کو اس کی محدود صلاحیتوں کا احساس دلانے کیلئے مختلف پیرایۂ بیان اختیار کیے گئے ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر تک کو اس سلسلہ میں متنبہ کرنے کے لیے ایک ایسے شخص سے ملایا جن کے بعض کاموں کے کنہ و حقیقت کو وہ نہیں سمجھ سکے اور اس اجنبی شخص کے سمجھانے سے انہیں اصلیت و حقیقت کا پتہ چلا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پیغمبر تک کا علم بھی محدود ہوتا ہے اللہ ہی عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ہے۔ وہ جتنا علم چاہتا ہے بندوں کو دے دیتا ہے۔ لہٰذا انہیں اپنے علم کو غیر محدود نہیں سمجھنا چاہیے اور اس پر نازاں نہ ہونا چاہیے۔ ان حقائق کو قرآن کریم میں چند سطروں میں سمجھا دیا ہے۔ سورہ کہف۔ آیت ۶۵ میں ہے

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝ (۱۵: ۱۸: ۶۵)

پھر پایا ایک بندہ جماعت بندوں میں کا جس کو دی تھی ہم نے اپنی مہر اپنے پاس سے اور سکھایا تھا اپنے پاس سے ایک علم۔

ف۔ وہ بندہ خضر تھا۔ مل کر سبب پوچھا آنے کا موسیٰؑ نے سبب بتایا۔ خضر نے کہا تم کو اللہ نے تربیت فرمائی۔ پر بات یوں ہے کہ اللہ کا ایک علم مجھ کو ہے تم کو نہیں۔ ایک تم کو ہے مجھ کو نہیں۔ ایک چڑیا دکھاوی دریا میں سے پانی پیتی۔ کہا سارا علم سب خلق کا اللہ کے علم میں سے اتنا ہے جتنا دریا میں سے چڑیا کے منہ میں پانی۔

سورۃ النحل (سورۃ ۱۶) کی آیت ۱۲ کا ترجمہ دے کر اس پر جو تفسیری

حاشیہ تحریر کیا ہے وہ شاہ صاحب کے صحیح غور و فکر اور قوتِ فیصلہ کا بولتا ثبوت ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

(۱۶: ۱۲)

ترجمہ: اور کام لگائے تمہارے رات اور دن اور سورج اور چاند سے۔ اور تارے کام میں لگے ہیں اس کے حکم سے اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کو جو بوجھ رکھتے ہیں۔

اس آیت پر شاہ صاحب کا تفسیری حاشیہ ملاحظہ ہو۔ کتنا مختصر اور کیا جامع ہے۔ لکھتے ہیں:

چار چیزوں سے بندوں کو کام لگ رہے ہیں صریح لیکن ستاروں سے کچھ ظاہر میں ان کو کام نہیں۔ ان کو جدا فرمایا۔

چیونٹی پر ابلاغ کا تکلم پر تعجب نہ کیجیے جس کا ذکر قرآن میں ہے۔ آج کل تو شہد کی مکھیوں کی زبان پر تحقیق ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔

اس آیت کو پڑھ کر اور اس کے ترجمے کو دیکھ کر عام آدمی تو یہی کہے گا کہ جب چار چیزوں یعنی لیل و نہار اور شمس و قمر کو "مسخر" کے تحت جمع کر دیا گیا ہے تو "نجوم" کو مسخرات بِاَمْرِهٖ کے ساتھ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اس کو طول کلام سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔ لیکن شاہ صاحب کی توجیہ کو دیکھ کر انسان ان کے غور و فکر کی گہرائی کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وہ صحیح غور و فکر ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بار بار انسان کو متوجہ کیا ہے۔ ارشاد باری ہے "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا" (اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ بیکار نہیں پیدا کیا) حالانکہ یہ الفاظ انسان کی زبان سے ہی

ادا کرائے گئے ہیں۔ لیکن جب انسان غور و فکر سے کام نہیں لیتا تو اس کو بہت سی
چیزیں بیکار معلوم ہونے لگتی ہیں۔ شاہ صاحبؒ اس مختصر حاشیہ کے ذریعہ
جہاں "نجوم" کو لیل و نہار اور شمس و قمر سے علیحدہ بیان کرنے کی مصلحت
بتائی ہے۔ وہاں یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی کوئی شے
فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ تاہم بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے فائدے اور کام
ظاہر ہیں اور بعض ایسی ہیں کہ جن کے فائدے ظاہر نہیں ہیں لیکن اس بنا پر
ان کو بیکار نہ سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ ایک اور مقام پر قرآن کریم نے اجرام سماوی
کا یہ فائدہ بتایا ہے:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي
ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (سورہ الانعام: ۹۷)

ترجمہ:- اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندروں
کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔

اکیسویں پارے یعنی اُتْلُ مَا أُوحِيَ کی آخری آیتوں اور بائیسویں پارے
یعنی وَمَن يَقْنُتْ کی ابتدائی آیات میں ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو
مخاطب کر کے حسن معاشرت کے بعض اصول بتائے ہیں۔ یہ ایک طویل رکوع
ہے جس میں از اول تا آخر ازواج مطہرات سے تخاطب ہے اور جمع مونث کا صیغہ
استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ
الدُّنْيَا ...... وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ
آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ۔

اسی عبارت کے بیچ میں یہ فقرہ بھی آگیا ہے إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ
عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا۔ اس فقرہ کو آیت

تطہیر کہا جاتا ہے۔ یہاں دو مقامات پر ضمیر جمع مذکر استعمال ہوئی ہے عَنكُمُ
(تم سے) اور يُطَهِّرَكُمْ (اور ستھرا کرے تم کو) لیکن جس طرح پہلے اور بعد
کی آیتوں میں ضمیر جمع حاضر چل رہا ہے اسی طرح ان دونوں موقعوں پر بھی
ضمیر جمع حاضر ہی کو کام میں لایا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جن ازواج
کو پہلے اور بعد میں مخاطب کیا جا رہا ہے ان ہی سے تخاطب اس آیت تطہیر
میں بھی ہے۔ تاہم عرب کے محاورہ کے مطابق یہاں ضمیر جمع مذکر استعمال کی گئی
ہے۔ لیکن ایک فرقے نے اس ذرا سے فرق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس آیت
کا تعلق حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ اور ان کی اولاد سے قائم کر دیا اور آجتک
(ایک جماعت کے نزدیک) اہلِ بیت کا لفظ اسی خاندان کے لیے استعمال
ہوتا ہے۔ کوئی کوئی مفسر رحم کھا کر ازواجِ رسولؐ کو بھی اہلِ بیت میں شامل
کر لیتا ہے ورنہ وہ ازواج ہونے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے اہلِ بیت میں شامل کیے جانے کے قابل نہیں سمجھی جاتیں۔ حضرت شاہ
صاحب نے روشِ عام سے ہٹ کر ازواجِ مطہرات کو اصلی اہلِ بیت
قرار دیا ہے۔ اور پھر کہا ہے کہ ان کے بعد اور گھر والے بھی اہلِ بیت میں
شامل ہیں۔ شاہ صاحب کا ترجمہ اور تفسیری حاشیہ ملاحظہ ہو[1]

---

[1] یہاں تو تخاطب ازواجِ رسولؐ سے ہے اس لیے قواعد کے مطابق بھی جمع
حاضر کی ضمیر کا استعمال مناسب ہے لیکن محاورہ عرب نے تو جمع حاضر مذکر کی ضمیر
کا استعمال حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی ایک زوجہ کے لیے بھی جائز رکھا ہے۔
چنانچہ جب فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ کو اسحاقؑ کی اور اسحاقؑ کے بعد
یعقوبؑ کی خوشخبری دی تو وہ بولی "قَالَتْ يَا وَيْلَتَىٰ أَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ" الخ
(ہائے میری کم بختی! کیا اب میرے ہاں اولاد ہوگی جبکہ میں (باقی اگلے صفحہ پر)

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (۲۲ : ۳۳ : ۳۳)

اللہ یہی چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے گندی باتیں۔ اے گھر والو، اور ستھرا کرے تم کو ایک ستھرائی سے۔ ف ۴

ف ۴ یہ خطاب ہے ازواج کو اور داخل ہیں حضرت کے سب گھر والے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے واضح طور پر بتلایا ہے کہ "یہ خطاب ہے ازواج کو" لیکن حضورؐ کے سب گھر والوں کو اہلِ بیت میں داخل کر کے یہ صراحت نہیں کی کہ "ان سب گھر والوں" سے کون کون حضرات مراد ہیں۔ چونکہ اس کے لیے قرآن میں کوئی اشارہ یا قرینہ نہیں ہے اس لیے آپ نے اس کو مبہم چھوڑ دیا ہے۔ چونکہ حضورؐ کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی جیسا کہ قرآن کریم کے ان الفاظ سے واضح ہے "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ (الاحزاب) صاحبزادیاں سب بیاہی جا چکی تھیں جس کی وجہ سے ان کو آپؐ کے گھر والوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا اس لیے شاہ صاحب کے

(بقیہ حاشیہ) بڑھیا پھونس ہو گئی اور میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔" یہ سن فرشتوں نے جو فقرہ کہا قرآن کریم کی زبان میں وہ یہ آیت ہے:

"قَالُوا أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ رَحْمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ ۝ (ہود : ۷۳)

ترجمہ:- فرشتوں نے کہا "اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیم کے گھر والو، تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور برکتیں ہیں اور یقیناً اللہ نہایت قابلِ تعریف اور بڑی شان والا ہے۔")

اس فقرہ کو کہ "اور داخل ہیں حضرت کے سب گھر والے" آپ کی احتیاط پسندی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

سورۃ "عبس" کی پہلی دو آیتوں کا ترجمہ اور تفسیری حاشیہ شاہ صاحب نے اس طرح دیا ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ أَن جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ (۸۰ : ۱ تا ۲)

تیوری چڑھائی اور منہ موڑ لیا ف ۳ اس سے کہ آیا اس کے پاس اندھا ف ۴

ف ۳ حضرت ایک کافر کو سمجھاتے تھے کہ اس میں ایک مسلمان آیا نابینا۔ وہ اپنی طرف مشغول کرنے لگا کہ وہ آیت کیونکر ہے، اس کے معنی کیا ہیں۔ حضرت پر گراں لگا بے وقت کا پوچھنا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ آیتیں بھیجیں۔

ف ۴ یہ کلام گویا اوروں پاس کلام ہے رسول کا۔ آگے رسول کا خطاب فرمایا۔

ایک صحابی جن کا نام ابن ام مکتومؓ تھا نابینا تھے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنے ہمراہ غزوات میں نہیں لے جاتے تھے اور اکثر مدینہ میں قائم مقام کی حیثیت سے چھوڑ جاتے تھے۔ چنانچہ ۲۷ یا ۲۸ غزوات میں سے ۹ میں وہی قائم مقام رہے۔ اکثر مفسرین نے نابینا مسلمان سے مراد انہی کو لیا ہے۔ لیکن شاہ صاحب نے یہاں بھی محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔ اور صرف نابینا مسلمان کہہ کر چھوڑ دیا ہے۔ نام نہیں لیا ہے۔ شاہ صاحب نے ان دونوں آیتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکایت قرار دیا ہے۔

سورۃ اَلْبُرُوْج کی تفسیر کے تحت "أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ" کے

قصے میں شاہ صاحب نے لکھا ہے۔

"ایک بادشاہ کا لے پالک بیٹا تھا۔ بادشاہ اس کو بھیجتا تھا ساحر پاس کہ سحر سیکھے۔ وہ بیٹھتا ایک راہب پاس کہ انجیل سیکھے۔ اللہ نے اس کو کمال دیا کہ شیر اور سانپ اس کا کہا مانیں اور کوڑھی اندھے اس کے ہاتھ چھونے سے چنگے ہوں۔ اس کے ہاتھ سے بہت خلق اللہ پر اور حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لائی۔ بادشاہ تھا بت پرست، اس نے لے پالک کو مار ڈالا۔ پھر شہر میں ہر محلے کے آگے کھائی کھو دی۔ آگ سے بھری۔ پھر محلے میں سے مرد اور عورتیں پکڑ منگاتا۔ جو بت کو سجدہ نہ کرتا آگ میں ڈالتا۔ ہزاروں خلق شہید کیے۔ جب اللہ کا غضب آیا وہی آگ پھیل پڑی۔ بادشاہ اور امیروں کے گھر سارے پھونک دیے۔"

بعض مورخین اور مفسرین کے نزدیک یہ واقعہ نجران[1] میں پیش آیا تھا۔ یا تو شاہ صاحب کے زمانہ تک یہ تحقیق نہیں ہوئی ہوگی یا پھر عوام کیلیے غیر ضروری سمجھ کر انہوں نے اس ملک کا نام نہ بتایا ہو۔ بہرحال ترجمہ اور تفسیری حواشی کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے پیشِ نظر ہمیشہ عوام رہتے تھے۔ اس لیے وہ آسان زبان، سلجھا ہوا پیرایۂ بیان اور عوام کی عقل و سمجھ کے مطابق واقعات اختیار کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دو سو سال گزرنے کے بعد بھی ان کا ترجمہ اور تفسیری حاشیہ مقبول ہے۔

---

[1] دیکھیے تفہیم القرآن جلد ششم صفحہ نمبر ۲۹۷ ——— سب سے مشہور واقعہ نجران کا ہے۔ جسے ابنِ ہشام، طبری، ابن خلدون اور صاحب معجم البلدان وغیرہ اسلامی مورخین نے بیان کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے بھی تاریخ ارض القرآن میں یہی لکھا ہے۔

تفسیر قرآنی موسومہ حقّانی

سیّد شاہ حقّانی نبیرہ سیّد شاہ برکت اللہ

سنہ ۱۲۰۶ ہجری

یہ تفسیر قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ (یو۔پی) کے ایک بزرگ سیّد شاہ حقّانی نبیرہ سیّد شاہ برکت اللہ نے تحریر فرمائی۔ مفسر موصوف نے شروع میں سبب تفسیر بتا کر یہ امر بھی واضح کر دیا ہے کہ یہ تفسیر پورے قرآن کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"پہلے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور اللہ تعالیٰ کا ناؤ اور اس کے حبیب اور اس کی آل و اَصْحَابُ صَلَوٰتُ اللّٰہِ عَلَیْھِمْ اَجْمَعِیْنَ کے ناؤ کو پڑھ کر یہ عاصی کہتا ہے کہ احوال اس کے لکھنے کا یہ ہے جو غور کر کے دیکھا تفسیر زبان عربی میں اور فارسی میں عالموں، فاضلوں، بزرگوں نے اس بارہ سے چھ برس (۱۲۰۷) کے عرصے میں تصنیف کری ہیں اور اپنے فہم و عقل کے زور سے معینوں کو آیت آیت حرف حرف کے ساتھ فصاحت اور بلاغت کے لکھے ہیں اور زیر و زبر کو قاعدہ صرف نحو کے سے ثابت کیا ہے اور شانِ نزول اور احوال پیغمبروں کے موافق حدیث اور روایت صحابہ رضی اللہ عنہم کے داخل کرے ہیں جو ان تفسیروں کو نظر کیا دریا علم کا اور ہدایت کا ہے کہ موج مارتا ہے۔ جاری ہے اور ہر ایک کو اس کے مدعا کو پہنچنا بے استاد جیسا کچھ چاہیے

مشکل ہے۔ پھر آخر کار کتب خانۂ استادی، مرشدی حضرت
بھائی صاحب وقبلہ حضرت سید شاہ حمزہ صاحب قدس اللہ
سرہ العزیز کے سے تفاسیر جدا کر کے حرف حرف کے معنوں کو اور
شانِ نزول ہر ایک کلمے اور آیت اور سورت کا دریافت
کرکے اور سب احوال پیغمبروں کا سمجھ کر موافق وقوف اور
عقلی اہمیت کے نزدیک کے ہر ایک کلمے اور آیت اور سورت
کے ساتھ مختصر کر کے لکھا، داخل کیا تاکہ ان پڑھوں کو جلد
سمجھنے میں آوے۔ عبارت طویل کو موقوف کیا۔ کس واسطے کہ
دل عالم کے تنگ ہو گئے ہیں۔ زیادہ عبارت کے پڑھنے سے
الجھتے ہیں، تنگ آتے ہیں۔ بلکہ پڑھے ان پڑھوں سے زیادہ
جی چھپاتے ہیں۔"

شاہ عبدالقادر دھلویؒ کے ترجمہ وتفسیر کا سنہ تصنیف ۱۲۰۵ھ ہے اور
بعض حضرات کے خیال کے مطابق شاہ رفیع الدین کا ترجمہ ۱۲۰۳ھ میں شائع
ہو چکا تھا۔ ان حقائق کے پیشِ نظر یہ نتیجہ اخذ کرنا بعید از قیاس نہیں کہ
ان دونوں ترجموں اور شاہ عبدالقادر دہلوی کی تفسیر "موضح قرآن" کو
دیکھ کر سید شاہ حقانیؒ مارہروی کو تحریک ہوئی کہ وہ خانوادہ ولی اللہی
کے ان دو نامور سپوتوں کے شروع کیے ہوئے کام کو آگے بڑھائیں اور
اپنی فہم اور عام مسلمانوں کی ذہنی سطح کے مطابق قرآن کریم کا ایک اور ترجمہ
کریں اور مختصر الفاظ میں آیات قرآنی کی نہایت عام فہم اور سلجھے ہوئے
انداز میں تفسیر لکھیں۔ مقدمہ میں جو باتیں شاہ عبدالقادر صاحب نے بیان
کی تھیں تقریباً وہی۔ سید شاہ حقانی نے دہرائی ہیں۔ اس سے اندازہ کیا
جا سکتا ہے کہ شاہ عبدالقادرؒ کی شروع کی ہوئی تحریک کا ردِ عمل کتنی جلدی ہوا۔

یہ ان کے کام کی بیّن ثبوت ہے۔

جن بزرگوں نے قرآن کریم یا احادیث نبوی کی کچھ خدمت انجام دی
ان کی نیتوں پر شک وشبہ کرنے کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے البتہ چونکہ
ذہنی صلاحیتیں سب کی یکساں نہیں ہوتیں اس لیے یہ اعتراف کرنے میں
کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ جو بات شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ اور
تفسیری حاشیہ میں ہے وہ سید شاہ حقانی کے ترجمہ میں دکھائی نہیں دیتی۔
نمونہ کے لیے سورہ بقرہ کی آخری چند آیتوں کا ترجمہ جو تفسیر قرآنی موسومہ
حقانی سے نقل کیا گیا ہے، درج ذیل ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ
نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ
عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا
بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا
فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ (۲) ۲۱۶)

ترجمہ:- رنج میں نہ ڈالے گا خدا تعالیٰ کسی کو مگر موافق طاقت
اس کی کے۔ اس کو ہے جو عمل کیا اور اوپر اس کے جو گناہ کیا۔
اے پروردگار میرے عذاب مت پکڑ تو مجھ پر جو بھول جاؤں
میں یا خطا کروں میں۔ اے پروردگار میرے اور پر بوجھ مت
دے تو اوپر میرے بوجھ بھاری جیسے بوجھ رکھا تو نے اوپر
اس گروہ کے کہ پہلے تھے مجھ سے۔ اے پروردگار میرے اور مت
رکھ اوپر سر میرے کے بوجھ جو کہ نہ اٹھا سکوں میں اور درگزر
کر خطاؤں میری سے اور بخش تو گناہوں میرے کو اور رحم کر

تو اوپر میرے۔ تو ہے خاوند میرا۔ پھر غالب کر تو مجھ کو اوپر
قوم کافروں کے۔"

اس کے مقابلہ میں شاہ عبدالقادرؒ کا ان ہی آیتوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی شخص کو مگر جو اس کی گنجائش ہے۔
اسی کو ملتا ہے جو کمایا اور اسی پر پڑتا ہے جو کیا۔ اے رب
ہمارے نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا چوکیں۔ اے رب ہمارے
اور نہ رکھ بوجھ ہم پر بھاری جیسا رکھا تھا تو نے اگلوں پر
اے رب ہمارے اور نہ اٹھوا ہم کو جس کی طاقت نہیں ہم کو
اور درگزر کر ہم سے، اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم پر۔ تو ہمارا
صاحب ہے۔ مدد کر ہماری قوم کافر پر۔"

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا کا ترجمہ شاہ حقانی صاحب نے "رنج میں نہ ڈالے گا خدا تعالیٰ کسی کو" اور شاہ عبدالقادرؒ صاحب نے "اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو" کیا ہے۔ ـــــــ شاہ عبدالقادر صاحب نے "اللہ تکلیف نہیں دیتا" محاورہ کے مطابق کیا ہے۔ آج بھی ہم روزمرہ کی گفتگو میں یہی کہتے ہیں "فلاں صاحب کو تکلیف نہ دو" یا "آپ تکلیف نہ کیجئے" یا "آپ نے بڑی تکلیف کی"۔ اس جگہ "رنج میں نہ ڈالے گا" کسی طرح موزوں نہیں۔ اس سے مفہوم بدل جاتا ہے۔ پھر قرآن کریم کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ "حیاتِ دنیوی میں اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی گنجائش اور طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا"۔ گویا یہ سب کچھ زمانہ حال کے لیے کہا جا رہا ہے۔ لیکن شاہ حقانیؒ صاحب نے ترجمہ زمانہ مستقبل میں کر کے کچھ ایسا تاثر دیا ہے کہ یہ بات اخروی زندگی کے لیے کہی جا رہی ہے۔

غرض شاہ عبدالقادرؒ صاحب کے ہاں اختصار کے ساتھ ساتھ زبان کی

سادگی، سلاست اور فصاحت زیادہ ہے۔ سید شاہ حقانی صاحب کے ہاں خوبیاں اس حد تک دکھائی نہیں دیتیں۔ تاہم جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ دو سو سال پہلے کی نثر کا نمونہ ہے تو ہمیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نثر اردو کے نمونے تقریباً ناپید تھے اور زیادہ تر دفتری، علمی، ادبی کام فارسی میں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ نجی خط و کتابت بھی فارسی ہی میں ہوتی تھی۔ اس وقت اللہ کے کلام کو اس قدر صاف، سادہ اور عام فہم نثر اردو میں پیش کر دینا ان علماء کا ایسا کارنامہ ہے جس کی داد دینے سے بھی ہم لوگ قاصر ہیں۔

تفسیرِ قرآن

از

حکیم محمد شریف خاں دہلوی

دہلی کے شریف خانی خاندان کے اطباء کے مورثِ اعلیٰ حکیم محمد شریف خاں دہلوی، عہدِ شاہ عالم ثانی کے مشہور و معروف طبیب تھے۔ ان کا سالِ ولادت تو معلوم نہیں سنہ وفات میں بھی تذکرہ نگاروں میں باہم اختلاف ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، حکیم محمد احمد خاں دہلوی کے حوالے سے ان کا سنہ وفات ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء بتاتے ہیں۔ تذکرہ علمائے ہند، کے مولف مولوی رحمان علی ان کا سنہ وفات ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۵ء تحریر فرماتے ہیں۔ وہ نہایت وثوق سے لکھتے ہیں۔

ان کی وفات ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۵ء میں ہوئی۔ کسی شاعر نے ان کے انتقال کی تاریخ یوں کہی ہے۔

قطعۂ تاریخ انتقال حکیم شریف خاں دہلوی

دریغا ازیں دار فانی گزشت — حکیم و طبیب و لطیف و ظریف
شرد گفت سال وفاتش بمن — صد افسوس مرزا محمد شریف[1]
۱۲۳۱ھ

تذکرہ علمائے ہند کے مترجم و مرتب ڈاکٹر محمد ایوب قادری اس تحقیق پر یہ اضافہ کرتے ہیں۔

"بعض تذکرہ نویسوں نے ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء تحریر کی ہے اور "دُخَلَ الجنۃ بلا حساب" مادہ تاریخ لکھا ہے۔ حکیم شریف خاں کے مزار پر جو لوح کندہ ہے اس پر بغیر "ۃ" کے "دَخَلَ الجنّۃ بلاحِسَاب" تحریر ہے[2]"

ڈاکٹر سید حمید شطاری اپنے تحقیقی مقالہ "قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر" میں لکھتے ہیں۔

"دَخَلَ الجُنَّۃَ" بغیر "ۃ" کے نہیں بلکہ بغیر نقطوں کے ہوگی۔ اور یہ کتابت کی غلطی ہے۔ ......[3] "ۃ" کے عدد (۴۰۰) جوڑے جانے کے بعد ہی ۱۲۲۲ ہوتے ہیں۔"

بہرحال ان تمام اختلافات کے باوجود اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ حکیم صاحب تیرہویں صدی ہجری مطابق انیسویں صدی عیسوی میں فوت ہوئے۔

حکیم محمد شریف خاں کے والد کا اسم گرامی حکیم محمد اکمل خاں تھا۔ وہ بھی اپنے زمانے کے نامی گرامی طبیب تھے۔ تذکرہ علمائے ہند کے مترجم لکھتے ہیں۔

"حکیم محمد شریف خاں علم و فضل اور شہرت و ناموری میں باپ سے

1۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو) شائع کردہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ۱۹۶۱ء ص ۲۳۳
2۔ ایضاً ص ۲۳۴
3۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۲۰۷

بھی سبقت لے گئے۔ شاہ عالم کے عہد میں شاہی طبیب رہے۔ اشرف الحکماء کا خطاب ملا۔[1]"

ترجمہ و تفسیر قرآن کے علاوہ حکیم محمد شریف خاں کی اور بھی کئی تصانیف ہیں جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

عجالۂ نافعہ، تالیف شریفی، علاج الامراض، دستور الہند، حاشیہ نفیسی، حاشیہ شرح اسباب، مشکوٰۃ شریف کا فارسی میں ترجمہ کاشف المشکوٰۃ کے نام سے کیا۔[2]

حکیم محمد شریف خاں کی تفسیر قرآن کا سنہ تصنیف معلوم نہیں ہو سکا۔ قیاس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ تفسیر، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور شاہ رفیع الدین دہلوی کے ترجموں کے بعد لکھی گئی ہوگی۔ یہ تفسیر ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ اس کا واحد قلمی نسخہ حکیم محمد احمد خاں صاحب کے کتب خانے میں موجود تھا۔ اسی سے اس تفسیر کے وجود کا علم ہوا اور اسی کو دیکھ کر بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے اس کے بارے میں تمام معلومات فراہم کیں۔

ترجمہ سے مفسر اور کاتب کے ناموں کا بھی پتہ چلتا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ "حکیم محمد شریف خاں نے شاہ عالم ثانی کے ایماء پر یہ کام انجام دیا تھا۔ ترقیمہ کی عبارت درج ذیل ہے۔

"لِلّٰہِ الحَمْدُ وَالمِنَّۃَ کہ ایں تفسیر سلامت تحریر حسب الامر ارفع اشرف اعلیٰ بادشاہ جمجاہ دین پناہ السلطان ابن السلطان الخاقان ابن الخاقان اسد المعارک والمغازی جلال الدین۔

1۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو) ص ۲۳۳
2۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳۳، قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۲۰۲

محمد شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ، و سلطانہ و افاغن علی العالمین برہ و احسانہ ذرہ خاکسار بے مقدار حکیم محمد شریف خاں بن حاذق الملک حکیم محمد اکمل خاں مرحوم شروع در تسوید و تحریر آن نمودہ بود بمساعدت توفیق الٰہی و معاضدت اقبال شہنشاہی در نیکو ترین ازمنہ و بہترین ادنہ زیب و زینت اختتام پذیرفت الحمد للہ الذی بہ توفیقہ تحت ہذا التفسیر محمد بدر الدین مفوض اللہ بن فیض اللہ......![1]

بابائے اردو مولوی عبد الحق، حکیم شریف خاں صاحب کی اس تصنیف کو قرآن مجید کا ترجمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ

"حکیم صاحب اسے تفسیر کہتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ترجمہ ہے۔ البتہ کہیں کہیں ایک آدھ لفظ ترجمے کی صراحت کے لیے بڑھا دیا گیا ہے جیسا کہ نمونے معلوم ہوگا۔"[2]

اس صراحت کے بعد بابائے اردو تحریر فرماتے ہیں:

"اس کی زبان شاہ عبد القادر مرحوم کے ترجمے کے مقابلہ میں زیادہ صاف ہے اور لفظی پابندی میں اتنی سختی نہیں کی گئی ہے۔ اردو زبان کی ترکیب کا نسبتاً زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ نیز شاہ صاحب کی طرح ہندی میں نہیں بلکہ ریختے میں ترجمہ کیا ہے۔"[3]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کی لمبی چوڑی تفاسیر کو دیکھ کر بابائے اردو

---

[1] قدیم اردو ص ۱۳۶ بحوالہ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۲۰۷

[2] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ص ۲۰۹

[3] ایضاً ص ۲۰۷

حکیم صاحب کی تفسیر کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اور اس کو ترجمہ کہنے پر مصر ہیں۔ لیکن جس زمانہ میں حکیم صاحب نے تفسیر لکھی تھی اس وقت اختصار سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ حکیم صاحب کے سامنے شاہ عبد القادر صاحب کا بھی تفسیری حاشیہ موجود تھا لہٰذا انہوں نے وہی طرز اختیار کیا اور تحت اللفظ ترجمہ کی جگہ وضاحت کر دی۔ ترجمہ فارسی محاوروں اور ترکیبوں کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتا ہے نہ کہ خاص اردو شعور پناہ پکڑنا فارسی ترکیب کا لفظی ترجمہ ہے۔ عوام کے سمجھانے کو اتنا ہی بہت تھا۔ رہا حکیم صاحب کی زبان کے صاف ہونے کا معاملہ اس کا سبب خود بابائے اردو نے یہ کہہ کر دیا ہے کہ (حکیم صاحب نے) شاہ صاحب کی طرح ہندی میں نہیں بلکہ ریختے میں ترجمہ کیا ہے۔ یہاں سورہ فاتحہ مع استعاذہ و بسملہ کا ترجمہ و تفسیر درج ہے۔

"(اَعُوْذُ بِاللّٰہِ.....) پناہ پکڑتا ہوں میں اور التجا کرتا ہوں میں ساتھ اللہ کے بدی شیطان وسواس دلانے والے کے سے کہ دور رحمت ہی سے اور نکالا گیا بہشت سے (بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ) شروع کرتا ہوں میں قرآن کو ساتھ نام اللہ لائق بندگی کے بہت بخشنے والا اوپر خلق کے وجود دینے سے دنیا میں مہربان ہے اوپر ان کے آخرت میں" (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ...... وَلَا الضَّآلِّیْنَ) جو تعریف کہ اول سے آخر تک موجود ہے لائق ہے واسطے اللہ کے کہ پالنے والا ہے تمام عالموں کو، بخشنے والا وجود کا آخرت میں مہربان داخل کرنے بہشت کے سے مالک دن قیامت کے کا۔ تفرق کرنے والا اس دن جو چاہے گا کرے گا۔ خاص تجھی کو بندگی کرتے ہیں ہم اور خاص تجھی سے مدد مانگتے ہیں ہم۔ اوپر بندگی تیری کے۔ دکھا تو ہم کو راہ سیدھی بیچ قول کے اور فعل کے اور اخلاق کے، راہ ان آدمیوں کی..... اور نہ گمراہوں کی۔"

"تفسیر کے بعض حصوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں حکیم صاحب نے شاہ صاحب کا پوری طرح تتبع کیا ہے مثلاً الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی تفسیر (حکیم صاحب) بہت بخشنے والا اوپر خلق کے وجود دینے سے دنیاں میں مہربان ہے اوپر ان کے آخرت میں"۔

(شاہ صاحب) خوب بخشتا ہے اوپر خلق کے وجود حیات کا۔ بخشش کرنے والا ہے اوپر خلق کی کہ ایمان لائی ہیں ساتھ اس کے اور بچانے والا ہے آفت سے دن آخرت کے"۔

حکیم محمد شریف خاں کی اہمیت یہ ہے کہ شاہ عبدالقادرؒ صاحب کے ترجمہ اور تفسیر موضح قرآن کے بعد اردو زبان میں پورے قرآن کی یہ دوسری تفسیر ہے۔ اور نہایت عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے۔

تفسیر سورہ فاتحہ

از

حضرت سید احمد شہیدؒ

"فاتحہ" مونث ہے فاتح کا۔ اس لفظ کے لغوی معنی ہیں کھولنے والی عورت یا کامیاب ہونے والی عورت، اس لفظ کا مادہ فتح (ف ح ت) ہے جس کے معنی کھولنا ہیں۔ مثلاً فتح الباب بمعنی دروازہ کھولنا۔ اصطلاحاً غالب ہونا۔ مالک ہونا۔ فتح کرنا بھی ہوئے جیسے فتح البلاد شہر فتح کیا، اس پر غلبہ پایا، مالک ہوا۔ وغیرہ۔ یہ کلام مجید کی پہلی سورت کا نام ہے جس کی وجہ سے اس لفظ کے مجازی معنی دیباچہ۔ عنوان، آغاز اور شروع ہونے کے ہیں۔ "سورہ فاتحہ" میں سات آیات ہیں جو بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کو سبع مثانی بھی کہا جاتا ہے۔ اس سورہ کی اہمیت کا

اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کا آغاز اس سورہ سے ہوتا ہے۔ دراصل یہ ان جامع و مکمل دعاؤں کا مجموعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو سکھائی ہیں اور جن کو دن میں متعدد بار دہرانے کا حکم دیا ہے۔ تاکہ انسان کو اپنے "عبد" (بندہ) اور اللہ تعالیٰ کے "معبود" (جس کی بندگی کی جائے) ہونے کا احساس برابر ہوتا رہے۔

پورا قرآن مجید اسی سورہ فاتحہ کا جواب ہے۔ "بندہ" اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" بمعنی اے اللہ تعالیٰ تو ہمیں سیدھی راہ پر چلا۔ "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" بمعنی "راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل کیا۔ نہ وہ جن پر غصہ ہوا ہے اور نہ بہکنے والے"۔ گویا ان آخری آیتوں سے اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ "سیدھی راہ" سے کیا مراد ہے۔

بندہ کی اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۔ یعنی یہ کتاب جو تمہیں دی جا رہی ہے تمام نقائص سے پاک ہے۔ یہ ہدایت دیتی ہے ان متقی لوگوں کو جو غیب کی باتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے ان کو دیا ہے ان میں سے اِنْفَاقُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰه کرتے ہیں"۔

کس قدر بلیغ انداز ہے۔ شروع ہی میں بندہ کو یہ جتا دیا ہے کہ تمہاری ہدایت کے لیے ہم یہ کتاب بھیج تو رہے ہیں لیکن یہ یاد رکھو کہ اس سے تمہیں ہدایت اسی صورت میں ملے گی جب تم تقویٰ کو اپنے دل میں جگہ دے کر ان باتوں پر عمل کرو گے۔ (۱) يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (۲) يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ (۳) وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی کتاب "تدبر قرآن" میں شروع ہی میں یہ بات بتادی ہے کہ قرآن کریم ہدایت کا سرچشمہ تو ہے مگر اس سے ہدایت اسی صورت میں مل سکتی ہے جب تم اس کا مطالعہ ہدایت حاصل کرنے کے لیے کرو۔ اگر دنیا کے دکھانے کے لیے بغیر سمجھے بوجھے اس کی تلاوت کرتے رہو یا تنقیدی نظر سے اس کا مطالعہ کرو تو اس سے تمہیں کوئی ہدایت حاصل نہیں ہوگی۔

بہرحال سورہ فاتحہ کی اہمیت مسلّم ہے۔ اسی لیے کئی حضرات نے اس کا ترجمہ نہایت اہتمام سے کیا ہے ساتھ ہی تفسیر بھی بیان فرمائی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس سورت کی جو تفسیر لکھی ہے وہ اردو زبان میں ادب العالیہ کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اندازِ بیان نہایت موثر اور زبان بے حد شگفتہ ہے۔ ان سے تقریباً ایک صدی پہلے حضرت سید احمد شہیدؒ نے بھی نماز میں اسے بار بار پڑھے جانے کی وجہ سے اس کو اہم سمجھتے ہوئے یہ تفسیر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے داماد اور اپنے مرید مولانا عبدالحئیؒ صاحب کو املا کرائی تھی جو ۲۰ صفحات کے ایک رسالہ کی شکل میں جمادی الآخر سنہ ۱۲۳۷ ہجری میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔ بعد میں لوگوں نے اس کی نقلیں بھی کیں جن میں دو قلمی نسخوں کا حوالہ ڈاکٹر سید حمید شطاری نے اپنے تحقیقی مقالہ "قرآن مجید کے اردو تراجم اور تفاسیر" میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس کے دو مخطوطے دستیاب ہوتے ہیں۔ ایک کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو میں ہے اور دوسرا کتب خانہ آصفیہ میں۔ اگرچہ کاتبوں کے نام نہیں ہیں لیکن دونوں کاتب الگ الگ معلوم ہوتے ہیں۔"[1]

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۲۱۳

ترجمے کی عبارت درج ذیل ہے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہ تفسیر الحمد شریف کی ہندی زبان میں جو حضرت رئیس المومنین امام العارفین سید المسلمین زبدۃ السالکین پیر و مرشد حضرت سید احمد صاحب نے نفع پہنچانے تم کو اور سب مسلمان بھائیوں کو ان کو بقا سے اور تزاید کرے فیض اور ارشاد ان کا۔ آپ اپنے زماں فیض و ہدایت ترجمان سے فرماکر جامع علوم ظاہری و باطنی مولانا عبدالحئیؒ صاحب دام فیضہ سے تحریر کروائی۔ اور حقیقت صلوٰۃ کی خوبیاں نماز پنجگانہ ہے۔ اور کئی فائدوں کے ساتھ جسے ایک فاضل کامل نے حضرت پیر و مرشد کے مریدوں میں سے حضرت کی زبانِ اقدس سے سن کر ہندی زبان میں لکھا ہے۔ اہتمام سے عاصی میر خاں اور وارث علی کے جناب مولوی سید محمد علی صاحب کی تصحیح سے مولوی بدر علی صاحب کے چھاپے خانے میں خاص و عام کے فائدوں کے لیے چھاپا ہوئی۔ اگر عالی ہمت کے مقام پر عبارت محاورے کے مخالف پاویں تو زبان طعنے کی دراز نہ کرے کیونکہ مقصود چھاپنے سے محض خیر خواہی جماعت مسلمین کی اور بہتری خواہ عوام مومنین کی ہے۔ نہ آرائشِ الفاظ کی۔ لہٰذا جو قلمی مولوی صاحب ممدوح کا تھا۔ اگرچہ بعض مقام پر خلاف محاورہ ہووے بجنس جمادی الآخر کی بائیسویں تاریخ سنہ ۱۲۳۷ء ہجری میں علی ہاجرہ الصلوٰۃ والسلام طبع ہوا۔"[1]

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۲۱۵، ۲۱۶

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ رسالہ سورہ فاتحہ کی تفسیر کے طور پر لکھا گیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ سورہ نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے اور ہر نماز کا جزو اعظم ہے۔ لہٰذا تفسیر شروع کرنے سے پہلے نماز پنجگانہ کی تلقین، نماز کی اہمیت اور نماز کی ترکیب وغیرہ بھی مختصراً بتائی گئی ہے۔ مضامین کی ترتیب مندرجہ ذیل طریقے پر رکھی گئی ہے۔

رسالے میں حمد و نعت کے بعد مریدوں اور عام مسلمانوں کو نماز پنجگانہ کی تلقین کی گئی ہے۔ ترکیب نماز کے ساتھ نماز کی اہمیت بھی بیان کر دی گئی ہے اور ساتھ ہی موقع موقع سے کئی فائدے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً

فائدہ: "اور اٹھانا دونوں ہاتھوں کا تکبیر میں دست بردار ہونا دونوں جہاں سے۔"

فائدہ: "نیت اور تکبیر فرض ہے۔ بعد اس کے دعا استفتاح ہے اور اس میں تعظیم اور توحید ہے۔"

فائدہ: رکوع دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ حضور میں بسبب عظمت کے پشت میری جھک گئی۔"[1]

چونکہ نماز میں سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی ایک سورہ پڑھی جاتی ہے اس لیے سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص کا ترجمہ لکھا گیا ہے اور رسالہ کے آخر میں سورہ فاتحہ کی تفسیر لکھی گئی ہے۔

سورہ فاتحہ کے ترجمہ لکھتے وقت سید صاحبؒ کے سامنے شاہ عبدالقادرؒ صاحب کا ترجمہ رہا ہے اس لیے رسالہ ہذا میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ شاہ صاحب کا ہی ترجمہ لکھ دیا گیا ہے۔ ذیل میں سورہ فاتحہ کا متن اور دونوں

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ص ۲۱۸

ترجمے درج کیے جاتے ہیں۔

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝ مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۝ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝

(ترجمہ مندرجہ رسالہ تفسیر سورہ فاتحہ) سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہان کا۔ بہت مہربان نہایت رحم والا۔ مالک انصاف کے دن کا۔ تجھی کو ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ چلا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان کی جن پر تو نے فضل کیا۔ نہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بہکنے والوں کی۔[1]

(ترجمہ سورہ فاتحہ از شاہ عبدالقادر) سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہان کا۔ بہت مہربان نہایت رحم والا۔ مالک انصاف کے دن کا۔ تجھی کو ہم بندگی کریں اور تجھی سے ہم مدد چاہیں۔ چلا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل کیا۔ نہ وہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بہکنے والے۔[2]

حضرت سید احمد شہیدؒ نے جس طرح ترجمہ میں شاہ عبدالقادرؒ صاحب کا تتبع کیا ہے اسی طرح دیباچے کے لکھنے میں بھی شاہ صاحبؒ نے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے۔ تاہم چونکہ رسالہ ہذا کا اصل موضوع سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے اس لیے وہاں سید صاحبؒ نے اپنا منفرد انداز قائم رکھا ہے اور بڑے

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۲۲۰

۲۔ عکسی قرآن مجید مع ترجمہ مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ قرآن منزل۔ لاہور ص ۲

دلنشین انداز سے تفسیر بیان کی ہے۔ آخری صفحہ ملاحظہ ہو۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ بتلا ہم کو راہ سیدھی صراط مستقیم سے اللہ کی رضا سمجھنا چاہیے۔ اور جیز اس مقام پر سمجھنے لائق نہیں اس واسطے کہ جو کوئی کچھ مانگے۔ کتنا ہی خوب سے خوب مانگے۔ اللہ کے خزانوں میں ہزار چند اس سے بہتر ہو سکتا ہے۔ مثلاً کوئی اللہ سے مانگے ایسی بہشت اس طرح کی حوریں مجھے ملیں اور ان حوروں کے بیان میں خوبیاں اس کے خیال میں گزریں۔ بلکہ جو ساری مخلوق کے خیال میں گزریں وہ سب کہے اور اس کے سوال مطابق اللہ تعالیٰ عنایت فرما دے۔ پھر اللہ اپنی قدرت سے ایسی حوریں پیدا کرے کہ یہ حوریں جو اس کے مانگنے کے موافق ہیں۔ اس حور کے آگے لونڈی سی ہو جاویں۔ اس واسطے اچھا سوال یہی ہے کہ اس کی رضا مانگے۔ اپنی تجویز نہ کیجیے۔ اور رضا خدا کی ہر اچھے کام پر ہوتی ہے۔ اور اچھا کام کبھی بروں سے بھی ہو جاتا ہے۔۔۔۔

۔۔۔۔ بعضے کافر محتاجوں کو دیتے ہیں۔ مال خرچ کرتے ہیں۔

۔۔۔۔ پر یہ رضا کچھ کام نہ آوے گی۔ دنیا میں اللہ چاہے بدلہ دے پر آخرت میں اونکو کچھ فایدہ نہیں ہے۔ جب اللہ کی رضا بعضے اچھے کام کہ بروں سے ہوتے ہیں، ان پر بھی ہووے ہے تو اس واسطے صراط مستقیم کا بیان بتلایا۔ کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کہ راہ ان کی جن پر فضل کیا تو۔ نہ وہ لوگ پیغمبر اور صدیق اور صالح ہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ اپنی وہ رضا ہمیں دے جو ایسے لوگوں کو دی۔ نہ ایسی رضا کہ جیسے کسی اچھے کام پر بعضے برے لوگوں کو ہو جاتی ہے کہ ان پر غصے بھی ہوتا ہے ان کی برائیوں

سے اسی واسطے فرمایا غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ۔ نہ دے کہ جس پر غصہ کیا جیسے گنہ گار فاسق کہ خدا کے غضب میں ہیں ہر چند کوئی کام اون سے اچھا بھی ہو جاوے کہ اللہ کے یہاں مرضی ہو وَلَا الضَّآلِّيْنَ اور یہ گمراہ بعضے کافر۔ ہر چند اون سے بھی کبھی کوئی کام اللہ کی رضا مندی کا ہو جاوے پر ان کی راہ بھی ہر گز نہیں مانگتا ان کے نصیب وہ رضا مندی نہیں کہ جو آخرت میں فائدہ دے۔

جس زمانہ میں یہ تفسیر لکھی گئی اس سے پہلے فورٹ ولیم کالج[1] میں اردو نثر نے بڑی ترقی کر لی تھی۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ میر امن، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، بہادر علی حسینی، مظہر علی خاں ولا، مرزا کاظم علی جوان، شیخ حفیظ الدین احمد وغیرہ کے ہاتھوں اردو زبان کافی منجھ گئی تھی۔ بہت سی ضخیم کتابیں تصنیف یا ترجمہ ہو کر اردو کے ذخیرۂ کتب میں داخل ہو چکی تھیں۔ خود سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ کے بزرگوں نے دین کے مسائل پر متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے تھے۔

شاہ عبدالعزیز کے بعض شاگردوں اور مریدوں نے بھی بعض غیر اسلامی رسوم و رواج کے خلاف رسالے لکھے تھے۔ جیسے نواب صدیق حسن کے والد اولاد حسن قنوجی نے تعزیہ داری کے رد میں ایک رسالہ "ہدایت المومنین" لکھا تھا۔ اسی کا اثر ہے کہ رسالہ ہذا کی زبان نہایت صاف ستھری ہے۔ اگر کوئی

---

[1] فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا تھا۔ اور میر امن، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس وغیرہ کی کتابیں ۲۴ر فروری ۱۸۰۴ء کو گلکرسٹ کے مستعفی ہونے سے پہلے لکھی جا چکی تھیں جبکہ سید احمد شہیدؒ کی ولادت ۱۷۸۶ء میں ہوئی، ۱۸۰۸ء میں ان کا تعلق شاہ عبدالعزیز سے ہوا اور یہ تفسیر اس تعلق کے قائم ہونے کے بعد میں لکھی گئی۔

حصہ موجودہ محاورے کے خلاف دکھائی دے تو اس کے لیے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اوّل تو یہ املا ہے۔ دوسرے اب سے دوسو سال پرانا ہے۔

تفسیر مجددی المعروف بہ رؤفی

از

شاہ رؤف احمد مصطفیٰ آبادی

اس تفسیر کے مصنف شاہ رؤف احمد مصطفیٰ آبادی، شاہ ابوسعید دہلوی کے خالہ زاد بھائی تھے۔ وہ ۱۴ محرم ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام رحمان بخش ہے۔ انہوں نے علومِ شرعیہ کی تحصیل و تکمیل حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مرزا مظہر جان جاں کے خلیفہ اجل شاہ غلام علی دہلوی سے سلسلہ نقشبندیہ میں خرقۂ خلافت پایا۔ شاعری میں شیخ قلندر بخش جرأت (م ۱۸۱۰ء) کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ رافت تخلص ہے۔ شاعری کا ذوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ پورا دیوان مرتب کرنے کے علاوہ انہوں نے جابجا اپنے اشعار سے کام لیا۔ چنانچہ تفسیرِ قرآن میں بھی اپنے اس ذوق کو پورا کیا ہے۔ جملہ مراحل طے کرنے کے بعد بھوپال چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

اردو فارسی میں مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں اہم ترین تفسیر رؤفی ہے۔ یہ اردو میں ہے۔ اس کا آغاز ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۳ء میں اور اختتام ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء میں ہوا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد بھوپال ہی سے حج بیت اللہ کے ارادہ سے روانہ ہوئے لیکن جہاز ہی میں راہیٔ ملک بقا ہو گئے۔ ان کا سنہ وفات ۱۲۴۹ھ ہے۔ عبدالغفور نساخ نے حسب ذیل قطعۂ تاریخ لکھا ہے۔

رافت آں قبلۂ اربابِ کمال — از جہاں رفت بہ سوئے جنت
بہرِ تاریخِ رحلتش نساخ — شد رقم "قدوۂ جنت رافت"[1]
۱۲۴۹ھ

جیسا کہ سطور بالا میں بتایا گیا ہے شاہ رؤف احمد صاحب کی سب سے اہم تصنیف، تفسیر رؤفی یا تفسیر مجددی ہے۔ یہ تفسیر دو جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ دوسری جلد میں سورہ ناس کی تفسیر کے بعد ایک مثنوی بھی شامل ہے۔ اس میں مفسر علام نے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنی حالت بیان کی ہے۔ اور آخر میں تفسیر کے تعلق سے یہ دو اشعار لکھے ہیں۔

کلامِ الٰہی کا اردو زباں میں — کھلا ترجمہ صاف آئینہ ساں ہے
بتاریخ آئی ندا غیب سے یوں — کہ تفسیرِ قرآن ہندی زباں ہے

پھر اس تفسیر کی انفرادیت کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے:

تفسیر کتاب آسمانی — ایسی کہ ہر یک کے دلنشیں ہے
اردو میں بیان بیاض و قاص — قبل اس کے کوئی ہوئی نہیں ہے

آخر میں ایک شعر سے مادہ تاریخ تکمیل نکالا ہے اور ضمناً مفسر کے نام کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔ کہتے ہیں۔

تاریخ میں اس کے دل یہ بولا — شاباش رؤف آفریں ہے
۱۲۴۸ھ

تفسیر کا انداز یہ ہے کہ پہلے آیت لکھی گئی ہے پھر فوراً اس کا ترجمہ مع تفسیر

---

[1] تذکرہ علمائے ہند (اردو) صفحات ۱۹۸، ۱۹۹ (مرتبہ و مترجمہ محمد ایوب قادری مع مقدمہ از ڈاکٹر سید معین الحق۔ شائع کردہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی۔ سندھ، پہلا ایڈیشن سنہ اشاعت ۱۹۶۱ء)

دے دیا گیا ہے۔ کہیں کہیں موقع کی مناسبت سے مفسر نے اپنا کوئی شعر دے دیا ہے۔ تفسیر میں شرح وبسط سے کام لیا ہے۔ ترجمہ میں اکثر ادقات تحت اللفظ اور بامحاورہ کو ملا دیا ہے لیکن کہیں کہیں لفظی ترجمہ کا اس درجہ التزام کیا ہے کہ تعقید لفظی کا عیب پیدا ہو گیا ہے اور کہیں ایسا شگفتہ اور شاعرانہ انداز اختیار کیا ہے کہ اس کی وجہ سے اس پر ایک ادبی تحریر وتصنیف ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ تفسیر میں چونکہ ترجمہ سے زیادہ آزادی ہوتی ہے اس لیے اس میں یہ تمام باتیں اور صفات زیادہ شدّت سے دکھائی دیتی ہیں۔

نمونے کے لیے سورۃ نباء کی چند آیات کا ترجمہ اور تفسیر پیش ہے، ملاحظہ ہو:

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ کس چیز سے سوال کرتے ہیں کافر۔ سمجھ لیجیے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جو دعوت اسلام کی ظاہر فرمانے لگے اور قرآن شریف پڑھ کر روز قیامت سے ڈرانے لگے کفّار نبوت میں آپؐ کے اور نزولِ قرآن میں اور وقوع بعثت میں اختلاف کر کر آپس میں پوچھنے لگے، یا پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اور مومنوں سے سوال کرنے لگے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، کس چیز سے پوچھتے ہیں کافر عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ خبر بڑی ہے کہ قرآن شریف ہے اَلَّذِیْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ وہ خبر کہ بیچ اس کے اختلاف کرنے والے ہیں کہ شعر یا سحر یا کہانت ٹھہراتے ہیں اور جھوٹی باتیں اور پہیلی کہانیاں بتاتے ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے کہ نباء عظیم نبوت حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہے۔ کافروں کا شبہ تھا کہ یہ پیغمبر ہیں یا ولی یا شاعر یا ساحر یا مجنون۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ نباء عظیم بعثت ہے اس میں کافر اختلاف کرتے تھے۔ کتنے کہتے تھے بعد مرنے کے نہ جئیں گے نہ اٹھیں گے اِنْ هِیَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا اور کتنے کہتے تھے قیامت کو اٹھیں گے لیکن شفاعت ہماری ہمارے بت کریں گے هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ اور کتنے شک میں

کہ قیامت ہو گی یا نہ ہو گی بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْهَا پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ہرگز نہیں۔ یوں البتہ شتاب جانیں گے وقت نزع کے کہ جس میں اختلاف کرتے ہیں وہ حق ہے ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ پھر ہرگز نہیں۔ یوں البتہ جلد جانیں گے، دن قیامت کے جھوٹے قول پلید عقیدہ اپنے کو اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا۔ کیا نہیں کیا ہے ہم نے زمین کو بچھونا بچھا ہوا تا قرارگاہ تمہارا ہو۔ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا اور پہاڑوں کو میخیں زمین کی تا ان سے محکم رہے۔ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا اور پیدا کیا ہم نے تم کو نر اور مادہ تا نسل تمہاری باقی رہے یا طرح طرح کے سیاہ اور سفید، دراز اور کوتاہ خوب و زشت وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا اور کیا ہم نے نیند تمہاری کو آرام بدن کا تمہارے۔ سمجھ لیجیے کہ نیند سے حس و حرکت جاتی ہے۔ قوائے حیوانیہ آرائش پاتے ہیں۔ ماندگی دور ہوتی ہے وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا اور کیا ہم نے رات کو پردہ تا ظلمت سب چیزوں کو چھپا لے۔ شیخ محی الدین عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے فتوحات مکیہ میں کہ رات لباس اصحاب لیل ہے۔ نگاہِ اغیار سے چھپ کر اس میں لذّت مکالمہ کی یا محاضرہ کی یا مشاہدہ کی موافق اپنے اپنے استعداد کے اٹھاتے ہیں۔

کیوں بھائیں نہ عاشقوں کو راتیں   محبوب سے کرتے ہیں یہ باتیں
پاتے ہیں حضور اس میں رافت   چکھتے ہیں شہود حق کی لذّت

شیخ الاسلام نے فرمایا ہے کہ شب پردہ روندگاں راہ ہے روز بازار بیداران سحرگاہ ہے۔

شب محرم راز عاشقاں ہے   شب خلوتِ خاص عازماں ہے

وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا۔ اور کیا ہم نے دن کو وقت طلب معاش کا تا کہ تحصیل میں اس کے جستجو کرو۔[1] آج سے ڈیڑھ سو سال کی تحقیق ہونے

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر صفحہ ۱۱۔ ۲۳۵ تا ۲۳۶

کی وجہ سے کہ فارسی کا ذوق ہنوز باقی تھا۔ عبارت میں فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔

تفسیر پارہ عمّ

یہ تفسیر مخطوطہ کی شکل میں دریافت ہوئی ہے اور مخطوطہ کے بھی صرف دو نسخوں کا پتہ چل سکا ہے ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے، ایک بابائے اردو مولوی عبدالحق کے پاس تھا۔ دونوں نسخوں سے نہ اس تفسیر کے مصنف کا پتہ چلا اور نہ کاتب کا نام معلوم ہوا۔ بابائے اردو کے نسخے کا سنہ کتابت ۱۲۵۴ھ ہے جو ۱۸۳۹ء سے مطابقت رکھتا ہے لیکن اس سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس تفسیر کا آغاز کس سنہ میں ہوا۔ اور تکمیل کس سنہ میں ہوئی۔ قیاس کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ تفسیر انیسویں صدی عیسوی کے دوسرے ربع میں لکھی گئی ہوگی۔ طرزِ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ مفسر کا تعلق برصغیر کے شمالی حصہ سے ہے۔

کتب خانہ آصفیہ اور بابائے اردو کے مملوکہ نسخوں میں یہ فرق ہے کہ اوّل الذکر میں بطور ابتدائیہ اور تفصیل و تفسیر کے طور پر جو عبارتیں دی گئی ہیں وہ موخر الذکر میں مفقود ہیں۔ اسی وجہ سے بابائے اردو اور نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اس کو تفسیر ماننے میں تامل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ عمّ کے پارے کا ترجمہ ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی کی رائے ہے کہ:

"اس کو تفسیر کی بجائے ترجمہ کہنا چاہیے کیونکہ اس میں آیتوں کے لفظی معنی لکھ کر بعض مقامات پر مزید تفصیل کی گئی ہے اور زیادہ تر معنی پر اکتفا کیا گیا ہے۔"[1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہاشمی صاحب کے نزدیک تفسیر میں صرفی اور نحوی مسائل کا بیان کرنا، فلسفیانہ موشگافیوں اور کلامی بحثوں میں الجھانا اور اسرائیلیات اور قصے کہانیوں کا شامل ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے بعض عربی میں لکھی جانے والی تفسیروں کو سامنے نہیں رکھا جن میں وہی انداز اختیار کیا گیا ہے جو زیرِ نظر تفسیر کا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں مثال تفسیر جلالین کی ہے جو اپنے اختصار کے باوجود تفسیر ہی سمجھی جاتی ہے اور مقبولیت میں عربی میں لکھی جانے والی کسی تفسیر سے کم نہیں۔ اس مثال کے سامنے ہوتے ہوئے تفسیر "پَارَۃُ عَمَّ" کو تفسیر کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

سُوْرَۃُ نَبَاء کا تعارف پیش کرتے ہوئے اور اس کا شانِ نزول بتاتے ہوئے مفسر نے اس سورۃ کے شروع میں بیان کیا ہے۔

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں آشکارہ لوگوں کو دینِ اسلام کی طرف بلانے لگے اور قیامت کے دن کا خوف بتائے۔ بعض کافر پیغمبری میں حضرت کی اور قرآن میں اختلاف کیے اور آپس میں پوچھنے لگے، یہ نیا دین اور قرآن کیا ہے۔ کسی نے کہا شاعر ہے کسی نے کہا سحر ہے۔ کسی نے کہا اگلے قصے (اساطیر) ہیں۔ اس واسطے حق تعالیٰ نے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حال سے خبردار کیا اور فرمایا عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ۔"

اس عبارت کو تفریح اور تفسیر کے سوا اور کیا کہا جائے گا۔ اس سے گزر کر جب ہم سورۂ نباء کے ترجمہ اور تفسیر پر آتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں کافی صراحت دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِھٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا کی تفسیر میں زمین کے متعلق کافی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اس کے بعد

ان آیات کی پوری وضاحت کر دیتے ہیں۔ یہ غرض ترجمہ سے بڑھ کر اس میں
اور بہت کچھ ہے جس کو ہم تفسیر ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اب سُورۂ نَبَاء کی چند آیات کا ترجمہ اور تفسیر ملاحظہ ہو تا کہ معلوم
ہو سکے کہ مفسر نے عام طور پر کیا روش اختیار کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ کس چیز سے سوال کرتے ہیں وہ کافر آپس میں
پھر ابھی (آپ ہی) فرمایا عَنِ النَّبَاءِ الْعَظِیْمِ سوال کرتے ہیں
وہ خود سے کہ بڑی ہے یعنی قرآن اور نبوت اور قیامت سے اَلَّذِیْ
هُمْ فِیْهِ ایسی خبر عظیم کہ وہ کافر بیچ اس کے مُخْتَلِفُوْنَ اختلاف
کرنے والے ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ حق تعالیٰ نے فرمایا
کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ حق ہے کہ قریب جانے گے وہ جب قیامت آئیگی
کہ پیغمبر سچے تھے۔ اور قرآن حق تعالیٰ کا کلام تھا۔ ثُمَّ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ
پھر حق ہے کہ قریب جانے گے وہ دن قیامت میں کہ بُرا کیا ہم نے جو
ایمان نہ لائے۔ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهَادًا آیا نہیں کی ہم نے
زمین کتیں بچھونا تاکہ رہو تم وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا اور پہاڑوں کے
تئیں میخیں۔ یعنی جب کہ حق تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا۔ وہ پانی پر
ہلتی تھی۔ پہاڑوں کی میخوں سے اس کو قائم کیا —— فائدہ ——
جاننا چاہیے کہ بیچ کرہ پانی کے زمین مانند گیند کے پڑی۔ آدھی
سے زیادہ پانی میں غرق ہے۔ اور آدھی سے کم باہر ہے۔ اور جو کی باہر
ہے دو قسم پر ہے۔ ایک قسم تو محض ویران ہے نشانی آبادی کی اس
میں ہرگز نہیں ہے اور دوسری قسم آبادی ہے کہ اسے ربع مسکوں
کہتے ہیں۔ اور اس میں دریائیں اور پہاڑیں اور میدائیں اور جنگلیں
اور شہریں واقع ہیں اور مساحت اس کی ایک سو بیس برس کی راہ ہے

وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا اور پیدا کیے ہم نے تمہاری بیں جوڑے نر
تم سے اولاد ہووے۔ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا اور کی ہم نے
نیند کے تئیں تمہاری آرام بدن کا تا ماندگی دن کی دور ہووے
وَجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا اور کیسے ہم نے رات کیں لباس کہ سب کو
اندھاری سے اپنی ڈھانپیں تا جو عیب کے دن کو ہوتے رات کو چھپویں
(چھپیں) صاحب فتوحات مکی فرماتے ہیں کہ رات لباس، رات
کے جاگنے والوں کی ہے کہ اونوں کی نظر سے اغیار کی ڈھانپتی ہے تاکہ
اپنے معشوق سے برخورداری پاویں۔ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا اور
کیسے ہم نے دن کے تیئں وقت زندگی کا کہ اوس میں روزی پیدا
کر و سات کسب کے اور پکاؤ کھاؤ۔ وَبَنَیْنَا فَوْقَكُمْ اور بنائی
ہم نے اوپر تمہاری سَبْعًا شِدَادًا سات آسمانوں کے تئیں کہ
سخت ہیں یعنی محکم اور استوار کہ بیچ اون کے کچھ فرجہ اور خلل نہیں
کہ نشانی نقصان کی ہے —— فائدہ —— پہلا آسمان فلک قمر، دوسرا
فلک عطارد، تیسرا فلک زہرہ، چھوتھا (چوتھا) فلک شمس، پانچو
(پانچواں) فلک مریخ، چھٹا فلک مشتری، ساتواں فلک زحل۔
اس کے اوپر کرسی ہے۔ اس کے اوپر عرش.....[1]

جیسا کہ صدر میں بتایا جا چکا ہے کہ عبارت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ
مفسر برصغیر کے شمالی حصہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ
نہ صرف بہت سے الفاظ کا املا غلط ہے بلکہ دکنی مفسرین و مصنفین کی طرح حالت
مفعولی میں اسم کی جمع اس مفسر نے بھی "یں" لگا کر بنائی ہے۔ مثلاً دریائیں،
پہاڑیں، میدائیں، جنگلیں اور شہریں —— بہرحال اس کو اردو زبان کے

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر صفحات ۲۴۳ تا ۲۴۶

ارتقاء کی ایک منزل کہا جاسکتا ہے۔

تفسیر "چراغِ ابدی"

شاہ عزیز اللہ ہمرنگ

یہ پارہ عم کی تفسیر ہے جو شاہ عالم ثانی کے دورِ حکومت کے آخری سال میں اورنگ آباد کے ایک بزرگ عزیز اللہ ہمرنگ نے لکھی تھی۔ مصنف کا اصلی نام عزیز اللہ اور تخلص ہمرنگ تھا۔ ان کے والد شاہ مبر عالم حسینی ایک صوفی بزرگ تھے اور قادریہ و نقشبندیہ سلسلوں میں منسلک تھے۔ ہمرنگ کو بھی تصوف کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک بڑے عالم دین اور شاعر بھی تھے۔ اور ان اوصاف کے ساتھ تصنیف و تالیف سے بھی دل چسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ تفسیر اور دیوان کے علاوہ ان کی اور بھی کئی تصانیف ہیں جن میں ایک رسالہ "دودھ دلیا" ہے جو فن تصوف میں ہے اور کافی شہرت رکھتا ہے۔

تفسیر "چراغِ ابدی" کا دوسرا نام چراغ ہدایت" ہے لیکن "چراغِ ابدی" تاریخی نام ہے اس لیے یہ تفسیر اس نام سے زیادہ مشہور ہے۔ "چراغِ ابدی" کے اعداد جمل کے قاعدہ سے ۱۲۲۱ ہیں۔ اس سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۲۱ ہجری ہے۔ جو ۱۸۰۶ عیسوی سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور ۱۸۰۶ عیسوی شاہ عالم ثانی کا سالِ وفات اور شاہ معین الدین اکبر المعروف بہ اکبر شاہ ثانی کا سالِ جلوس تھا۔ مثنوی "دودھ دلیہ" ۱۲۲۳ھ کی تصنیف ہے اور "فقہ منظوم" ۱۲۲۵ھ میں منصۂ شہود پر آئی۔ شاہ عزیز اللہ ہمرنگ کے سالِ وفات کا کسی ذریعہ سے بھی پتہ نہیں چل سکا۔ تاہم بعض شواہد کی بناء پر مشفق خواجہ صاحب نے بتایا ہے کہ وہ ۱۲۶۸ھ سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔[1]

۱۔ جائزہ مخطوطات اردو جلد اوّل از مشفق خواجہ شائع کردہ مرکزی اردو بورڈ گلبرگ طبع اول فروری ۱۹۷۹ء ص ...

چراغ ابدی کے کئی مخطوطے دستیاب ہیں۔ ان ہی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تفسیر طبع بھی ہو چکی ہے۔ لیکن اس وقت تک اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ نہیں ملا۔

تفسیر "چراغ ابدی" اگرچہ اردو زبان میں ہے لیکن خود مصنف نے صراحت کی ہے کہ میں نے یہ تفسیر دکنی ہندی سے ہٹ کر اس زبان ہندی میں لکھی ہے جو بالفعل اورنگ آباد کے لوگوں کا محاورہ ہے۔ ان کی اس تشریح سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں باوجودیکہ اورنگ آباد دکن ہی کا ایک شہر تھا مگر وہاں کی زبان کو دکنی زبان سے مختلف بتاتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو یہ فرق ان کے زمانہ میں پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ اورنگ زیب کی شہزادگی کے زمانہ سے چلا آرہا تھا۔ **اس سلسلہ میں** ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی "دلی کے دبستان شاعری" میں تحریر فرماتے ہیں۔

> "ولی سے پیشتر دکنی زبان میں شعر گوئی موجود تھی لیکن وہ محض دکنی زبان میں تھی۔ جب سے اورنگ زیب نے اپنی شہزادگی کے زمانہ سے اورنگ آباد کو اپنا مستقر بنایا (۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء) اور (۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) تک دکن کے مختلف شہروں کی فتوحات کے سلسلہ میں وہیں رہا تو اس کے ساتھ دہلی اور شمالی ہند کی کثیر آبادی اورنگ آباد اور اس کے قرب و جوار میں بس گئی تھی۔ اس کثیر آبادی کے اثر سے شمالی ہند کی زبان اورنگ آباد اور دکن میں رائج ہوئی جس نے دکنی تمدن اور معاشرت کے ساتھ وہاں کی زبان کو قطعی طور پر مٹا دیا۔"[1]

اس سلسلہ میں مشفق خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

۱۔ دلی کا دبستان شاعری ص ۶۰ (طبع دوم ۱۹۶۵ء)

"ہمرنگ نے اپنی زبان کو "اورنگ آباد کا محاورہ" کہا ہے۔ اس سلسلہ میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"مؤلف نے اورنگ آباد کی زبان کی علیحدہ حیثیت قرار دی ہے
جس کا دکنی زبان سے تعلق نہیں ہے۔ اور یہ بھی یہی کہ ابتدا سے
اور خصوصاً شاہجہاں اور اورنگ زیب کی صوبہ داری میں اسکا
تعلق زیادہ تر شمالی ہند کی زبان سے رہا۔ اور وہاں کے اہل زبان
اور شعرا نے جو زبان لکھی ہے وہ حیدرآباد، بیجاپور اور علاقہ مدارس
کی زبان سے بالکل الگ ہے وہ زیادہ تر شمالی ہند کی زبان کی
تقلید کرتے تھے۔" (قدیم اردو، ص ۱۴۵)[1]

غرض تفسیر چراغ ابدی کے مصنف نے اپنے زمانہ کے رجحان کو دیکھ کر اپنے وطن اورنگ آباد کی مروجہ زبان استعمال کی ہے۔ دیباچہ کی عبارت سے بھی اس کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ ملاحظہ ہو:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"بہترین تفسیر حمد الٰہی ہے اور خوش تقریر نعت رسالت پناہی
صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم وصحبہ صلوٰۃ مثونتہ عن التناہی۔

امابعد

بیت
عرض کرتا ہے دوستدار دوستی
آشنا بوتی غم گساردوستی

زاویہ تعیّن کوچہ کم زای دبی استعدادی طالب منصب وارستگی
وآزادی فقیر عزیز اللہ ابن میر عالم الحسینی القادری النقشبندی

---

[1] ۔ فہرست مخطوطات اردو جلد اوّل ص ۷۳

اورنگ آبادی المتخلص بہ ہمرنگ عفا اللہ عنہ وعن والدیہ واحسن الیہ والیہما کہ جب دیکھا میں اکثر تفسیریں کلام اللہ کی زبان عربی اور فارسی میں واقع ہیں اور کم علمی بعض اہل ہند کی دریافت سے معنی ان کے مانع۔ اگرچہ بعض عزیزوں نی (عزیزوں نے) زبان دکنی ہندی آمیز میں تفسیر جزآخر کی لکھی ہیں لیکن بسبب الفاظ دکنی کی لطف زبان ہندیکا پورا نہیں پاتا اور دل یاروں بکا واسطی مطالعہ اوس کی رغبت کم لاتا۔ اس واسطی خاطر قاصر میں اس فقیر کی آیا کہ تفسیر جزآخیر کی زبان ہندی میں کہ بالفعل اورنگ آباد کی لوگوں کا محاورہ اہی لکھی اور بعض فوائد کہ دوسری تفسیروں میں نہیں ہیں۔ کتب معتبرہ سے جمع کر کر اس میں داخل کرے کہ عوام اہی باوجود قلت بضاعت کے فائدہ تمام اٹھادیں اور اس فقیر کی دعا و مغفرت سی یاد لادیں

تااسی ہو وسیلۂ عقبی
بلکہ سب کو مفید روز جزا

بعد تقدیم استخاری کی اور استعانت حضرت باری کی جو ہر سورۃ کی فضیلت اور نفع اور خاصیت اور ختم اور تعبیر اور بعض سورۃ کی فضیلت اور خاصیت .... وَمِنَ اللّٰهِ التَّوْفِيْقُ وَبِيَدِهٖ اَزِمَّةُ التَّحْقِيْقِ۔[1]

اگرچہ تفسیر "چراغ ابدی" عَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ کے پورے پارے کی تفسیر ہے جہاں تک کہ کتب خانہ سالار جنگ کے مخطوط کا تعلق ہے وہ پورے "عَمَّ"

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (ڈاکٹر سید حمید شطاری) صفحات ۲۴۹، ۲۵۲

کے پارے کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس میں صرف مندرجہ ذیل گیارہ سورتیں شامل ہیں۔

(۱)	سُوْرَہْ	وَالنّٰزِعٰتِ	(۷)	سُوْرَہْ	الطَّارِقُ
(۲)	سُوْرَہْ	تَکْوِیْر	(۸)	سُوْرَہْ	اِنْفِطَارُ
(۳)	سُوْرَہْ	عَبَسَ	(۹)	سُوْرَہْ	الاَعْلٰی
(۴)	سُوْرَہْ	الغَاشِیَۃُ	(۱۰)	سُوْرَہْ	التَّطْفِیْف
(۵)	سُوْرَہْ	اَلْفَجْرُ	(۱۱)	سُوْرَہْ	اَلِانْشِقَاق
(۶)	سُوْرَہْ	اَلْبُرُوْج			

تفسیر کی نوعیت بھی جدا ہے۔ ہر سورہ کی تفسیر اس کی آیتوں کی ترتیب سے کرنے کی بجائے اس میں مضمون کی مناسبت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ لیکن نہ معلوم کس بنیاد پر مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اس کو مکمل پارہ عم کی تفسیر بتایا ہے اور کہا ہے کہ "یہ تفسیر سورہ اَلْحَمْدُ سے شروع کی گئی ہے۔ اس کے بعد سورہ ناس ہے۔ اسی طرح ہوتے ہوئے سورہ عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ پر تفسیر ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہاشمی صاحب کے پیشِ نظر کوئی دوسرا نسخہ رہا ہے اور انہوں نے اسی پر قیاس کر کے کتب خانہ سالار جنگ کے مخطوطہ کے متعلق یہ تفصیلات بیان کر دی ہیں۔ اگر اصل مخطوطہ سامنے ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ہاشمی صاحب جیسا محقق اس نوع کی غلطی کرتا۔

جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ تفسیر زیرِ نظر کے ہر مخطوطہ میں ترقیمہ موجود ہے جن سے ہر مخطوطہ کا سنہ کتابت معلوم ہو جاتا ہے لیکن مخطوطہ نمبر ۱۸۱ کے ترقیمہ میں سہواً سنہ ۱۱۴۳ھ درج ہو گیا ہے جو غالباً ۱۲۴۳ھ ہے۔

مخطوطہ نمبر ۱۸۰ میں دیباچے کے بعد متعدد ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ مثلاً ذکر تعوذ، اس میں استعاذہ کی فضیلت اور ضرورت بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد تفسیر استعاذہ ہے پھر "ذکر تسمیہ" اور "تفسیر تسمیہ" ہے۔ بعدہٗ ذکر سورہ فَاتِحَہْ" اور "سورہ فَاتِحَہْ کی تفسیر" بیان کر کے قرآن مجید کی ترتیب کے مطابق سورہ "نَبَاءَ" سے سورہ "ناس" تک کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ ہر سورہ کی تفسیر سے پہلے اس سورہ کے پڑھنے کے فیوض و برکات قلمبند کیے گئے ہیں۔

اس مخطوطہ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آیتوں کا لفظی ترجمہ کر کے اس کے ساتھ تفسیر کو اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں۔ اور ترجمے کو تفسیر سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ترجمہ کہیں تفسیر سے پہلے کہیں تفسیر کے بعد اور کہیں درمیان میں۔ کہیں کہیں تفسیر کے مفہوم کو دلنشیں اور موثر بنانے کے لیے مفسر نے اپنے اشعار دیے۔ نمونہ کے لیے سورہ فاتحہ کی تفسیر ملاحظہ ہو:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" تمام حمد یعنی ثنا کرنا اوپر خصلتیں نیک کی زبانی اور شکر کرنا اوپر نعمتیں بے عوض کی حق ہے جس حامد سے ہوئی طرف محمود کی۔ یہ سب ثابت ہے خاص اللہ تعالیٰ کے تئیں کہ وہ لائق ہے اس چیز کے اور حقیقت رکھتا ہے اس چیز کی۔ اور سوائے اوس کے لائق نہیں کہ سراہا جاوے سات ان صفتوں کمال کے۔ "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ایسا اللہ کہ مالک ہے اوپر پرورش کرنے والا ہے کل عالم کا۔ کسیکو روزی ظاہر سے پرورش کرتا ہے اور کسیکو روزی باطن سے اور کسیکو سات طاعت کے پرورش کرتا ہے اور کسیکو سات محبت کے اور کسیکو سات فرقت کے۔ اور کسیکو سات وحدت کے۔ اگر ہر ایک کوئی اوپر یافت نعمت بہ شکر ہی نعمت کا بجا لاوے اور زیادتی نعمت کی طلب کرے تو حق تعالیٰ کرم اپنے سے واسطے شکر شاکر کی نعمت زیادہ کرتا ہے، اہلِ طاعت کو مرتبہ محبت کا دیتا ہے۔ اور اہلِ محبت کو رتبہ معرفت کا اور اہلِ معرفت کو درجہ وحدت کا

عنایت کرتا ہے۔ اس کے بعد "عَالَمِیْنَ" کی مختلف اقوال سے تشریح کی گئی ہے۔

"اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" رحمٰن رزق دینے والا دنیا میں تمام کافرانام کو علی العموم اور رحیم معاف کرنے والا آخرت میں تمام مومنوں کی علی الخصوص۔ کہ ... اسی واسطے دعا میں کہا جاتا ہے کہ یَارَحْمٰنَ الدُّنْیَا وَرَحِیْمُ الآخِرَۃِ۔ یَارَحْمٰنُ رَحْمَتْ کرنے والا طرف خلق کے علی العموم اور رحیم رحمت کرتے والا طرف خلق کے علی الخصوص کے ہے اور معنی رحمت کے چاہنا خدائے تعالی کا نیکی کو طرف لائق اوس نیکی کے ہیں یا معنی رحمت کے ترک کرنا عذاب کو مستحق سے عذاب کے۔ اور نیکی کرنا طرف اس کی جو لائق کے نہیں ہے ہیں۔

"مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" مالک ہے روزِ جزا کا اور قادر ہے اور پیدا کرنے ذاتیں عدم سے طرف وجود کے کہ سوائے اس کے دوسرا قادر نہیں یا جزا دینے والا ہے روزِ جزا دینے کی بندوں کو موافق اعمال اور احوال انہوں کے کہ جزا مطیعون کی جنت ہے اور جزا محبوں کی قربت اور جزا عارفوں کی وصلت ہے اور جزا موحدوں کی تجلّی خاص (اس سلسلہ میں مختلف اقوال پیش کیے گئے ہیں)

...... "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" تجھے ایک پوجتے ہیں اور پوجتے ہیں ہم۔ اور خاص بندگی اور فرمانبرداری تیری کرتے ہیں ہم (عبادت کے بارے میں خلوص کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔) ...... پس قول بغیر فعل کے وبال ہے اور عبادت بے اخلاص کے بدحال قطعہ:

جو کوئی تیرے کوچۂ الفت میں در آوے
کافر ہے جو پھر دیکھے در و بام کسی کا
ہمرنگ بجز یار کے اس دل میں خبردار
مت غیر کو آنے دی نہیں کام کسی کا

"وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" اور خاص تجھی یاری چاہتے ہیں ہم۔ عبادت اور بندگی

کرنیں کہ تجھے بغیر شرک اور ریا اور عجب اور رعونت کی پوجیں ......

صاحب تفسیر نے تمہید میں اس تفسیر کے قلم بند کرنے کی یہ غایت بتائی ہے کہ دکنی تفاسیر کی زبان اہل اورنگ آباد کے لیے نامانوس سی ہے اس لیے انھوں نے یہ تفسیر اورنگ آباد کے محاورے میں لکھی ہے تاکہ اس علاقے کے رہنے والے اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھیں اور سمجھ سکیں۔

چونکہ اورنگ آباد شمالی ہند اور دکن دونوں سے یکساں طور پر متاثر ہوا تھا اس لیے ان دونوں کے ارتباط سے ایک گنگا جمنی زبان بن گئی۔ اور اورنگ آباد کی زبان کی یہ خصوصیت آج تک برقرار ہے۔ ہمرنگ نے اپنی تفسیر میں اورنگ آباد کی زبان کی ان ہی خصوصیات کو سمویا ہے۔ اہلِ دکن کے برخلاف وہ علامت فاعلی "نے" کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ بعض جگہ وہ غلط بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے اس شعر میں۔

نام میں چاہا رکھوں ایسا کہ نکلے تاریخ
فکر کر دل نے اٹھا بول "چراغِ ابدی"

دورِ قدیم میں "نے" کا استعمال قطعی طور پر مسلّم نہیں ہوا ہے اور قواعد نویسوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جمع بنانے کے بھی انھوں نے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔ مثلاً کہیں وہ واو۔ نون سے جمع بناتے ہیں اور کہیں الف۔ نون سے۔ اکثر موقعوں پر اسماء جمع مذکر کی جمع "ی ن" سے بنائی ہے جیسے پہاڑیں۔ میدانیں وغیرہ۔ ان بے اعتدالیوں کے باوجود ان کی زبان خاصی سلیس اور رواں ہے۔ خطی نسخوں کی کثرت اور ملک کے مختلف حصوں میں ان کی تسوید سے اس کی خاص و عام میں مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز عبارت میں جہاں قرآن حکیم کی آیات کے تراجم ہیں وہاں احتیاط سے ترجمہ کیا ہے لیکن اس قدر لفظی بھی نہیں بنایا کہ آج کے قاری کو اس میں الجھن ہو

البتہ بعض اور تفاسیر کی طرح اس میں عاشقانہ اشعار کو معرفت کا رنگ
دیا ہے جو بعض ثقہ حضرات کو پسند نہیں۔ لیکن ایک خاص دور میں اس علاقے
کے مخصوص لہجہ کی جھلکیاں اس میں موجود ہیں۔

تفسیر قرآن مجید

یہ تفسیر مخطوطہ کی شکل میں ہے۔ مخطوطہ کا نمبر ۸۶۸ ہے اور یہ ادارہ ادبیات
اردو حیدرآباد دکن کی تحویل میں ہے۔ مخطوطہ کا عنوان تو تفسیر قرآن مجید ہے
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورے قرآن مجید کی تفسیر ہوگی۔ لیکن اس عنوان
سے جو چیز دستیاب ہے وہ صرف پارۂ عَمَّ کی تفسیر ہے جو سورہ نَبَاءَ
سے شروع ہو کر سورہ نَاس پر ختم ہوتی ہے۔ آخر میں سورہ فَاتِحَہ کی تفسیر
ہے۔ ممکن ہے مفسر کا ارادہ پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا ہو اور چونکہ پارہ
عَمَّ میں چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں جن میں بیشتر عقائد بیان کیے گئے ہیں۔ نیز
یہ سورتیں اکثر نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں جس کی وجہ سے عوام و خواص سب
ان سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے پہلے اس پارہ کی تفسیر لکھ دی ہو۔ بعد میں
دیگر مصروفیات یا اجل نے مہلت نہ دی ہو اور کام آگے نہ بڑھ سکا ہو۔

اتفاق سے اس تفسیر میں نہ دیباچہ ہے نہ ترقیمہ اس لیے نہ مفسر کے نام کا
پتہ چل سکا نہ سنہ تصنیف معلوم ہو سکا۔ اور نہ یہ پتہ چل سکا کہ مفسر کا تعلق
شمالی ہند سے ہے یا دکن سے۔ صرف اندازِ تحریر اور قیاس کی بنا پر اتنا کہہ سکتے
کہ مفسر کا تعلق دکن سے ہے۔ اور یہ تفسیر تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں
لکھی گئی تھی۔ چونکہ تفسیر میں جگہ جگہ اشعار سے کام لیا گیا ہے اس لیے یہ امر
بعید از قیاس نہیں ہے کہ مفسر ایک اچھا شاعر بھی تھا۔

تفسیر زیرِ نظر کا آغاز سورہ نَبَاءَ کی شانِ نزول سے ہوا ہے۔ ابتدائی

چند سطریں ذیل میں درج ہیں۔

"ہر گاہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دعوت ظاہر کی اور قرآن خلق اللہ
کتئیں سنائی اور روزِ قیامت کا خوف بتائی اور کفار نبوت میں
حضرت کی اور نزول میں قرآن کی اور بعثت میں موت کی آپس
میں اختلاف کر پیغمبر سے پوچھتی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمایا ہے
"عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ" کس چیز سی سوال کرتی ہیں کافراں یعنی
یعنی کافراں قریش کی۔۔۔۔۔"

جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے کہ مفسر شاعر بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے
ثبوت میں چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

سورہ نَبَاءَ کی پہلی چھ آیتیں دے کر اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اس کی
تفسیر بیان کی گئی۔ پھر مزید تشریح کے لیے یہ قطعہ لکھا گیا۔

(آیات) عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ۔۔۔۔۔۔ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ

قطعہ

باقی نہ رہے کس کی خبر بے خبری پر — ستار وہ خود آوے گا جب پردہ دری پر
مانع سے کہا راز انو کا رہے مخفی — باطن میں جو ہیں اپنے مقر بے ہنری پر

اب نثر میں سورہ فاتحہ کی تفسیر ملاحظہ ہو:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" تمام تعریف اول سے آخر تک
سزاوار ہے۔ اللہ تعالیٰ کتئیں ایسا اللہ کہ پرورش کرنے ہارا ہے
تمام عالم کا۔ اَلرَّحْمٰنِ بخشنے ہارا ان کا دوسری بار بعد فنا
ہونے دنیاں کے۔ اَلرَّحِيْمِ بخشنے ہارا رحمت سے دوسری
بار بہشت میں داخل کرنے ہارا۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

مالک مختار ہے روزِ محشر کا جو چاہے حکم کرے اِیَّاکَ نَعْبُدُ تیرے تئیں بندگی کرتے ہیں ہم کہ لائق عبادت کے ہے توں۔ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اور خاص تیری مدد توفیق بندگی چاہتے ہیں۔ ہم کہ صاحبِ اعانت ہے توں۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ہدایت فرما ہمارے تئیں راہ مضبوط دینِ اسلام صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ایسے راہ نعمت دیں۔ ایمان بخشیا توں ہم پر فضل سے اپنے سات فایدہ ہدایت نبوت اور رسالت کے۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ نہ راہ ان شخصوں کا غضب کیے گئے ہیں تیرے حکم کوں عدول کرنے سے وَلَا الضَّالِّیْنَ اور نہ راہ ان گمراہوں کا جو تیرے حبیب کی رسالت کے قائل نہیں۔

آمین۔ یعنی ایسا ہی ہو یجیو۔ قول فرشتوں کا ہے۔ تمت تمام شد

اس تفسیر کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ اس میں مفسر نے عام قاری کی نفسیات اور فہم کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ ترجمہ اور تفسیر کو اس طرح ادا کر دیا ہے کہ قاری کے ذہن میں کوئی الجھن نہ رہے اور وہ لمبی چوڑی تشریحات میں پھنس کر مطلب سمجھنے سے محروم رہ جائے۔ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر مفسر نے کہیں تو آیتوں کا صرف ترجمہ دے دیا ہے۔ کہیں ترجمہ کے ساتھ ساتھ ایک آدھ تفسیری جملے کا اضافہ کر دیا۔ اور کہیں صرف تفسیر بیان کر دی ہے۔ غرض جیسی ضرورت سمجھی ویسا طرز اختیار کیا ہے۔

سورہ ناس کے ترجمہ اور تفسیر میں مفسر نے حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کا تتبع کیا ہے۔

بعض جگہ تو مفسر نے بڑی حکمت و دانائی سے کام لیا ہے اور ان کے طرز سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے زمانہ بلکہ آئندہ زمانہ

زمانہ کے متقضیات کا بھی خیال رکھا ہے۔ مثلاً سورہ اَلْعَادِیَاتِ کی تفسیر بیان کرنے کے بعد اسی مفہوم کو اشعار میں بیان کیا ہے پھر ارتکازِ دولت اور دورانِ زر کے قرآنی نظریہ کی وضاحت کر دی ہے۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ (۱۰۰ : ۸)

ترجمہ:۔ اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔

تفسیر: انسان بنا بر دوستئ مال کی ہر آئینہ سخت ہے بخل اس کا نہایت پہنچا ہی۔ شیخ الاسلام کہتے ہیں کہ اگر مال کتیں دوست رکھتا ہی تو دی یعنی خیر کرتا تا کچھ دیویں اور واسطے وارثوں کی مت رکھ کہ داغِ حسرت دل پر تری باقی رکھیں۔"

اشعار

مال وہ بہتر کیسکی سکام آئی	خرچ کر محتاج کوئی آرام پائی
خیر میں دی خرچ کر ہر حسب حال	جمع کرتی ہیں لبا سنگ وسفال
دمع اس کا خرچہ کو کہا نیکا ہی	جمع کرتا طور و کہا نیکا ہی
دیکھئ دنیاں بلاسے دین بھی	خاک اس کہانی یو تیرے گوشت بھی
بندگی کر کہا، گوارا ہی بچی	باغ دیں کا بھی نظارہ ہی کبھی

نثر میں کسی قدر پرانا پن اور الجھاؤ ہے۔ نظم کافی صاف، سلجھی ہوئی اور رواں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر زبان کی طرح اردو میں شعر و شاعری اور نظم لکھنے کا رواج بہت پہلے ہو گیا تھا۔ نثر کی طرف توجہ بہت بعد میں ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظم اور شاعری کی زبان تو منجھ منجھا کر کافی ترقی یافتہ شکل اختیار کر گئی۔ اور نثر میں نکھار بہت بعد میں ہوا۔

تفسیر تنزیل یا فوائد البدیہہ

باباقادری حیدرآبادی

یہ دونوں نام سیّد باباقادری حیدرآبادی کی تفسیر قرآن مجید کے ہیں۔ ناموں کے فرق کے علاوہ دونوں میں یہ بھی فرق ہے کہ پہلے یہ تفسیر، تفسیر تنزیل کے نام سے لکھی گئی پھر درس و تدریس کے سلسلے میں تفسیر تنزیل کے توضیح طلب امور کی جو توضیح و تشریح کی وہ اس تفسیر میں داخل کر کے مصنّف و مفسّر سیّد باباقادری نے اس نظرثانی شدہ ایڈیشن کا نام فوائد البدیہہ کر دیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق[1] نے ناموں کے اس فرق کے سبب اور اپنی اس غلط فہمی کی وجہ سے کہ انھوں نے تفسیر تنزیل کو بارھویں صدی ہجری اور فوائد البدیہہ کو تیرھویں صدی ہجری کی تصنیف سمجھا، ان کو دو الگ الگ تفسیریں قرار دیا اور ان کے مصنّفین کو بھی مختلف شخصیتیں سمجھا۔ لیکن تفسیر تنزیل کے مخطوطات اور فوائد البدیہہ کے مخطوطہ میں بعض ایسے شواہد موجود ہیں جن سے یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ ان دونوں کے لکھنے والے ایک ہی بزرگ باباسید قادری ہیں۔ البتہ تفسیر تنزیل اس تفسیر کا ابتدائی ایڈیشن ہے اور فوائد البدیہہ نظرثانی شدہ ایڈیشن ہے۔

تفسیر ہذا کے مصنّف سید باباقادری حیدرآبادی کے ایک ذی وجاہت خاندان کے چشم و چراغ تھے جو شریعت و طریقت اور علم و فضل میں نہایت ممتاز تھا۔ ان کے والد سیّد شاہ یوسف ابن سیّد محمد عبداللہ قادری نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں ایک صاحبِ شریعت و طریقت بزرگ تھے۔

---

[1] قدیم اردو۔ کراچی ۱۹۶۱ء ص ۱۲۹

سیّد شاہ محمد یوسف کے دو بیٹے تھے۔ ایک تو یہی باباسیّد قادری جن کا پورا نام سیّد محمد درویش باباقادری تھا۔ اور دوسرے ان کے بڑے بھائی سیّد شاہ عبداللہ قادری تھے جن کی عرفیت قطبی صاحب تھی۔[1]

سیّد شاہ محمد یوسف شیخ طریقت اور صاحبِ تصانیف کثیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ ریاست کے معاملات میں بھی دخیل تھے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۲۳۰ھ کے لگ بھگ ہوا۔ اور تدفین وبیر پورہ کے متصل بودے شاہ (بہود علی شاہ صاحبؒ) کی کھڑکی کے پاس قبرستان میں ہوئی۔ زیر نظر تفسیر کے دیباچے میں سیّد شاہ یوسف کے متعلق مرقوم ہے۔

عَلَّامَتُهُ الْعَصْرِ الْجَامِعِ بَيْنَ عُلُوْمِ ظَاهِرٍ وَالْبَاطِنِ وَ
صَاحِبِ التَّصَانِيْفِ فِي الْمَعْقُوْلِ وَالْمَنْقُوْلِ وَالتَّصَوُّفِ[2]

سیّد شاہ عبداللہ قادری المعروف بہ قطبی صاحب کے بارے میں ڈاکٹر زور محبوب الزمن اور گلزار آصفیہ کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

"قطبی صاحب اپنے والد کے علاوہ ایک اور بزرگ شاہ خاموش کے بھی خلیفہ تھے۔ یہ شاہ خاموش صاحب شاہ اسرار اللہ کے مرید تھے اور ہمیشہ خاموش رہا کرتے تھے۔ درویش فانی و فقیر حقانی تھے۔ ان کا مکان دروازہ چادر گھاٹ کے اندر واقع تھا۔ اس عہد کے مورخوں نے ان کو شاہ خاموش اول کے لقب سے یاد کیا ہے۔"[3]

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک (ڈاکٹر سیّد حمید شطاری) ص ۲۷۷

[2] مخطوطات تفسیر تنزیل (نمبر ۶۶، ۶۷، ۹۰ د ۲، ۸۵۲) دیباچہ

[3] محبوب الزمن صفحہ ۳۹۷ اور گلزار آصفیہ صفحہ ۳۸۷ بحوالہ تذکرہ مخطوطات جلد سوم۔ ادارہ ادبیات اردو (۵۲)

مولوی نصیر الدین ہاشمی سیّد بابا قادری کے بارے میں لکھتے ہیں :

"سیّد بابا قادری کے والد کا نام سیّد شاہ محمد یوسف قادری تھا۔ بابا قادری کو باپ ہی سے خلافت ملی تھی۔ وہ نہ صرف ایک صوفی تھے بلکہ عالم بھی تھے۔ شریعت اور طریقت دونوں کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ آصف جاہ ثالث سکندر جاہ کی بہن خیر النساء بیگم کو سیّد بابا قادری سے بڑا خلوص تھا۔ وہ ان کی معتقد تھیں خیر النساء کی فرمائش سے کئی کتابیں لکھیں، جن میں سے ایک شمائل النبی بھی ہے۔"[1]

شمائل النبی کا ترجمہ سیّد بابا قادری نے ۱۲۵۷ھ میں شروع کیا ۱۲۶۶ھ میں اختتام کو پہنچایا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ۱۲۶۶ھ تک بقیدِ حیات تھے۔

تفسیر تنزیل اور فوائد البدیہہ ہنوز مخطوطات کی شکل میں ہیں۔ تفسیر تنزیل کے کلّی اور جزوی پانچ مخطوطات دریافت ہوئے ہیں اور فوائد البدیہہ کا صرف ایک مخطوطہ موجود ہے۔

تفسیر تنزیل کے ایک مخطوطہ سے جس کے حوالے سے بابائے اردو مولوی عبد الحق صاحب نے اس تفسیر پر بحث کی حسب ذیل امور کا پتہ چلا ہے۔

(۱) تفسیر تنزیل کے مصنّف سیّد بابا قادری ہیں۔

(۲) معاونین کے نام یہ ہیں۔

(۱) حاجی میاں محمد علی (۲) محمد عبد الغفور خان

---

[1] ہندو قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں (مولوی نصیر الدین ہاشمی) مقالہ نصیر الدین ہاشمی، سہ ماہی اردو۔ جنوری ۱۹۵۴ء ص ۲۷

(۳) کاتبوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) محمد مسافر (اصل نام غلام محی الدین) (۲) محمد واجد علی

(۴) تفسیر کا سنہ آغاز ــــــــــ ۱۱۴۰ ہجری

(۵) تفسیر کا سنہ تکمیل ــــــــــ ۱۱۴۷ ہجری

لیکن سنوں کے معاملہ میں بابائے اردو سے سہو ہوا۔ ظاہر ہے کہ جب سیّد بابا قادری تیرہویں صدی ہجری کے بزرگ تھے اور ان کی تصنیف شمائل النبی کا ترجمہ ۱۲۶۶ھ میں مکمل ہوا تو تفسیر کا سنہ آغاز اور سنہ تکمیل بھی ۱۲۴۰ھ اور ۱۲۴۷ھ ہونا چاہیے۔

اس قیاس کی تائید و تصدیق تفسیر تنزیل کے اس نسخے سے بھی ہوتی ہے جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

تفسیر تنزیل

مصنّف

سیّد بابا قادری

معاونین

(۱) حاجی میاں محمد علی صاحب

(۲) محمد عبد الغفور صاحب

(۳) محمد مسافر صاحب خوش نویس

(۴) محمد واحد علی صاحب خوش نویس

تاریخ ابتداء تصنیف سنہ ۱۲۴۰ ہجری

تاریخ تکمیل ۲۵ ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۷ ہجری۔[1]

---

[1] تفسیر تنزیل (کتب خانہ آصفیہ (جلد پنجم) ترقیمہ)

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے ترقیمے کی حسب ذیل عبارت درج کی ہے۔

"خدائے تعالیٰ نے جیسا کہ اس سورے (ناس) کے تئیں پانچ ناس پر تمام کیا۔ اس تفسیر تنزیل کو بھی پانچ شخصوں پر تمام کیا۔ اول یہ تفسیر یعنی مصنف سید بابا قادری دوم حاجی میاں محمد علی سوم محمد عبدالغفور خاں۔ یہ دونوں اس امر میں بہت کوشش رکھتے تھے۔ چہارم محمد مسافر جوان صالح اور لائق خوش مزاج اور خوش نویس اور پنجم محمد واحد علی کہ یہ دو شخص تصنیف کے لکھنے والے تھے کہ خدائے تعالیٰ ان دونوں شخصوں کے لکھنے سے تفسیر تمام کروایا۔"

"خدائے تعالیٰ قرآن شریف کے تین حروف بے سے شروع کیا اور ختم قرآن کا حرف سین پر ہوا۔ ان دو حرفوں کے تئیں مرکب کرو تو لفظ "بس" کا حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ان دونوں حرفوں کے بیچ میں تمام قرآن ہے۔ بس کرتا ہے تیرے تئیں۔"

"(فرد) اول و آخر قرآن زچہ با آمد و سین یعنی اندر رہ دین رہبر تو قرآن بس اور تصنیف بھی ——— تفسیر کی پانچ سال میں تمام ہوئی کس واسطے کہ سن چالیس میں شروع ہوئی اور سن سنتالیس میں تمام ہوئی۔ دو سال کامل ناغہ ہوئے۔ تمام شد تفسیر تنزیل بتاریخ بیست و پنجم شہر ذی قعدہ در سن یک ہزار یک صد و چہل و ہفت ہجر النبوی۔"[1]

"فوائد البدیعہ" کے نام سے تفسیر تنزیل کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ دکن میں ہے۔ یہ تین جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں دیباچے کے بعد سورہ فاتحہ

[1] قدیم اردو ص ۱۷۸

اور اس کے بعد سورہ بقرہ سے بارہویں جزو کے تقریباً دو رکوع تک ترجمہ و تفسیر ہے۔ دوسری جلد کا آغاز پہلی جلد کی اختتامی آیت سے اٹھارہویں جزو کی سورہ نور کی چند آیتوں تک ہے۔ تیسری جلد میں قرآن مجید کے باقی حصہ کا ترجمہ و تفسیر ہے۔ اس طرح فوائد بدیعہ پورے قرآن کریم کی تفسیر ہے۔ اس تفسیر کا دیباچہ ذیل میں درج ہے:

"امابعد فیقول الفقیر الحقیر بلا بضاعت سید بابا القادری الحیدر آبادی بن سیدی و مرشدی و علامۃ العصر الجامع بین علوم الظاہر والباطن و صاحب التصانیف فی المعقول والمنقول والتصوف سید شاہ محمد یوسف القادری بن سید شاہ محمد اسکنہم اللہ المجبوبہ خبانہ الی فداخذہ الخرفتہ من اخی المعنی حضرت شاہ عبداللہ القادری المتعارف بہ قطبی صاحب لقمنا اللہ بہ دعمرہ الہی کبر الاکبیر روزے چند بتدریس و وعظ اشتغال داشت کہ بعضے از دوستاں صمیمی سید لعل شاہ و سید قلندر بخش متوطن سرہند از اولاد حضرت بندگی اسمٰعیل قدس سرہ خصوصاً مرزا محمد بیگ بن مرزا حاجی بیگ خاں و مرزا محمد علی (باعث کہ شدن (؟)) باعث شدند کہ علمائے پیشیں علی قدرہم تفاسیر عربی و فارسی تالیف فرمودہ اند اما کہ ہم مایان مغلوب المقصود از ادراک آں قاصر باید کہ تفسیر بعنوان ترجمۂ کلام مجید بزبان ہندی در تحریر آید کہ فائدہ وغیرہ از قصص مرتب الاحوال کردد۔ لہذا وفور اشتیاق ایشاں نمودہ خواست کہ آنچہ در فہم ناقص آید بزبان ہندی ترجمہ کلام ربانی و بعضے کلام شانِ نزول مفید بہ قلم آرد۔ لہذا مستدعی از ناظران عالی فطرت آنست کہ ہر جا کہ

خطا و سہو واقع شود قلم اصلاح برآں جاری دارند و از طعن معاف فرمائند۔ پس شروع کردم ایں کتاب فی شہر ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۰ اربعین و مائتین بعد الالف من الہجرۃ المبارکۃ۔ در عہد نواب مستطاب سکندر رنزاد فریدون عشر نواب سکندر جاہ بہادر ادام اللہ ملکہ و متع المسلمین بطول بقائہ ....

...... و نام نہاد تفسیر را فوائد البدیہہ۔[1]

واضح رہے کہ یہی دیباچہ تفسیر تنزیل کا ہے جس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ فوائد البدیہہ، "تفسیر تنزیل" ہی کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ہے کوئی جداگانہ تفسیر نہیں، دوم یہ کہ تفسیر تنزیل ۱۲۴۰ھ میں شروع کی گئی تھی ۱۱۴۰ھ میں نہیں۔

چونکہ "فوائد بدیہہ"، "تفسیر تنزیل کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ہے لہذا مصنف و مفسر نے بعض مقامات پر مزید وضاحت کے لیے تفسیر میں کچھ الفاظ بدل دیے ہیں تاکہ ابہام باقی نہ رہے۔ اور عوام کو سمجھنے میں سہولت ہو۔ نمونے کے لیے چند آیتوں کے اجزاء اور بعض الفاظ قرآن کی دونوں تفسیر میں پیش ہیں:

الفاظ یا جزو آیت	تفسیر تنزیل	فوائد بدیہہ
أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ	دروازہ ہر شئی کا	دروازے تمام چیزوں کے
حَتَّىٰ	تب، تئیں	تا وقتیکہ
رَبِّ الْعَالَمِينَ	پروردگار عالم کا ہے	پروردگار کہ پرورش کرنے والا تمام عالم کا

[1] فوائد بدیہہ۔ مخطوطہ نمبر ۱۳۹ (کتب خانہ آصفیہ)

الفاظ یا جزو آیت	تفسیر تنزیل	فوائد بدیہہ
سَمْعِكُمْ	تمہارے سننے کو	شنوائی کتیں تمہارے
أَبْصَارَكُمْ	تمہاری آنکھوں کوں	بصارت کتیں تمہاری[1]

سورہ نبا کی چند ابتدائی آیات کی تفسیر ملاحظہ ہو تاکہ دوسروں کے مقابلہ میں سید بابا قادری کی زبان کا صحیح اندازہ کیا جاسکے۔

"جس وقت کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دعوت ایمان کے آشکارا کیے اور قرآن شریف پڑھی اور قیامت کے روز سے ڈرائی بلکہ کفار حضرت کے نبوت اور نبوت کے آنے میں اختلاف کیے اور آپس میں ایک دوسرے سے سوال کرتے تھی یا پیغمبر سے اور صحابہ سے پوچھتے تھی جیسا کہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔ عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ کس چیز سے سوال کرتے ہیں کفار عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ خبر عظیم سے یعنی قرآن سے الَّذِي هُمْ اسے خبر کہ وہ کفار فِيهِ مُخْتَلِفُونَ بیچ اوس خبر کے اختلاف کرنی والی ہیں۔ یعنی قرآن شریف کتیں سحر اور شعر اور کہانت کی نسبت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حکایتاں اول گزری ہوئی ہیں۔ اور یہ قرآن دل سے بنایا ہوا ہے۔"[2]

تفسیر اذا جاء

اس نام کا ایک مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات میں موجود ہے۔ یہ

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (ڈاکٹر سید حمید شطاری) ص ۳۱۰

[2] تفسیر تنزیل مخطوطہ (۲) کتب خانہ سالار جنگ۔

چوبیس صفحوں کا ایک رسالہ ہے جس کے صرف تین ابتدائی صفحات میں ترجمہ اور تفسیر ہے اور باقی صفحات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری ایام کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ مخطوطہ میں نہ تفسیر کا نام درج ہے نہ سنہ تفسیر۔ البتہ کاتب کا نام (امین الدین) اور ترقیمہ میں کتابت کا سنہ دیا گیا ہے۔ ترقیمہ کی عبارت حسب ذیل ہے۔

"تمام شد تفسیر سورہ اِذا جاءَ بخط مرید بندہ سرافگندہ عاصی خاکسار کمترین امین الدین بتاریخ بست ونہم ذی الحجہ سنہ ۱۲۰۷ھ بہ پاس خاطر حافظ منصب علی صاحب تحریر یافت۔"

اس تفسیر کا مقابلہ جب تفسیر تنزیل یا فوائد البدیہہ مصنفہ سید بابا قادری حیدر آبادی میں شامل اِذا جاءَ کی تفسیر سے کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تفسیر اس کی ہو بہو نقل ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ تفسیر بھی سید بابا قادری حیدر آبادی کی ہی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر تنزیل کی مقبولیت اور اِذا جاءَ کے فضائل کے پیش نظر حافظ منصب علی صاحب نے ثواب دارین حاصل کرنے کی غرض سے اور تفسیر اِذا جاءَ کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کیلئے تفسیر تنزیل سے سورہ نصر کی تفسیر اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے مندرج حالات نقل کر لیے۔ پھر اس مسودہ کا مبیضہ امین الدین صاحب سے تیار کرا لیا۔ اس سے لوگوں کو یہ سہولت ہو گئی کہ تفسیر تنزیل سے جو پورے قرآن کی تفسیر ہے، رجوع کرنے کی بجائے ان کی نقل کردہ تفسیر اِذا جاءَ سے استفادہ کر سکیں۔

ترقیمہ میں کتابت کا سنہ ۱۲۰۷ھ دیا گیا ہے جو یقیناً غلط اور سہو

کتابت ہے۔ اس لیے کہ جب یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ تفسیر، تفسیر تنزیل کے متعلقہ حصہ کی نقل ہے اور تفسیر تنزیل سنہ ۱۲۴۰ھ میں شروع ہو کر سنہ ۱۲۴۷ھ میں اختتام کو پہنچی تو اس کی نقل اس کے لکھے جانے سے ۳۵۔۴۰ سال پہلے کیسے ہو گئی۔ صحیح سنہ ۱۲۷۰ھ ہو گا اور اکائی اور دہائی کے ہندسوں کے الٹ جانے سے ترقیمہ میں سنہ ۱۲۰۷ھ ہو گیا۔ اس قیاس کو غیر حقیقی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس قسم کی غلطیاں آج کل بھی ہو جاتی ہیں۔

اس قیاس کو کہ "تفسیر اِذا جاءَ" نقل ہے "تنزیل" کے متعلقہ حصہ کی اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ کتب خانۂ آصفیہ میں تفسیر تنزیل سے نقل کیے گئے دو مخطوطے "تفسیر پارۂ عمّ" کے نام سے موجود ہیں اور اس میں اس بات کا اشارہ بھی پایا جاتا ہے کہ یہ کوئی علیٰحدہ تفسیر نہیں ہیں بلکہ تفسیر تنزیل ہی سے نقل کیے گئے ہیں۔ ان دونوں مخطوطوں کی درج ذیل عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔

"خدائے تعالیٰ نمازاں بھی پانچ فرض کیا۔ صبح، ظہر، عصر، مغرب، عشاء۔ خدائے تعالیٰ جبکہ اس سورہ کتیں (سورہ ناس) پانچ ناس پہ تمام کیا۔ اوّل یہ تفسیر لکھی مصنف سید بابا قادری دوئم حاجی محمد علی، سیوم عبدالغفور خاں۔ یہ دونوں شخص اس امر میں نہایت کوشش رکھتے تھے۔ چہارم محمد مسافر نام غلام محی الدین جوان صالح اور لائق خوش مزاج اور خوش نویس۔ اور پنجم محمد واحد علی کہ یہ دو شخص تصنیف کے لکھنے والے تھے کہ خدائے تعالیٰ ان دونوں شخصوں کے لکھنے سے تفسیر تمام کروایا....."

تفسیر سورہ نصر کے سلسلے میں مفسر نے سورہ کی آخری آیت کے ترجمہ

کے بعد یہ معلومات قلم بند کی ہیں۔

"جس وقت یہ سورہ نازل ہوا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ سُن کر روئے۔ حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وصحبہ وسلم پوچھے کہ "اے عباس تم کس واسطے روتے ہو" حضرت عباسؓ عرض کیے "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ وصحبہ وسلم اس سورہ کے نازل ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے تئیں دنیا سے سفر کرنے کا حکم ہوا ہے" فرمائی رسول خدا صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وسلم کہ "اے عباس تم حق ہے" پس حضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ وصحبہ وسلم جبریل اسے کہے کہ "اے جبریل ع۔م۔ میری تیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس سورے سے میری موت کی خبر دیتا ہے" جبریل۔ ع۔م۔ عرض کیے کہ "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وصحبہ وسلم غمگین مت ہو۔ وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی اور البتہ آخرت بہتر ہے واسطے تمہاری دنیا سے" پس حضرت صلی اللہ علیہ والہ وصحبہ وسلم کی آخرت کے کام میں زیادہ کوشش کرتے تھے۔ اکثر تسبیح اور حمد اور استغفار کرتے تھے"

ہمیشہ سے یہ سنتے چلے آرہے ہیں کہ "سورۂ نصر" رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سُن کر حضرت صدیق اکبرؓ روئے تھے۔ یہاں یہ واقعہ حضرت عباسؓ سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اور بہت سی روایتوں کی طرح یہ روایت بھی خلافتِ عباسیہ کے دور میں وضع کی گئی ہوگی۔ وہی روایت کسی ذریعہ سے ان مفسرین کو معلوم ہوگئی ہوگی۔ اور انھوں نے صحیح روایت کو چھوڑ کر کسی وجہ سے یہ موضوع روایت لے لی ہوگی۔ اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے آپؐ کی آخری

سنہ وفیات اور آپؐ کی وصیتوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف احادیث اور روایات سے مدد لی گئی ہے۔ پھر رحلت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات تفصیل سے بیان کرنے کے بعد سورہ نصر پڑھنے کے فوائد اور اس کے ثواب کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس عبارت پر رسالہ ختم کر دیا گیا ہے۔

"جو شخص کہ سورت کتیں خواب میں پڑھا تو خدائے تعالیٰ اس کو دشمنوں پر فتح دے گا۔ اور تمام مشکلات اس کے حل ہوئیں گے اور بعضے کہتے ہیں کہ یہ خواب دلالت کرتا ہے موت کے نزدیک ہونے پر فقط"

سورہ نصر کا ترجمہ لفظی ہے اور آیتوں کافی شرح وبسط کے کی گئی ہے ملاحظہ ہو:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ .... فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۠

(ترجمہ وتفسیر) پیغمبر صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ وصحبہ وسلم کے بھیجنے میں خدائے تعالیٰ کی یہ حکمت تھی کہ مکارم اخلاق کو تمام کرنا اور بنا کلمہ توحید کی مضبوط کرنا اور دین اسلام کو ظاہر کرنا اور خلایق کو ہدایت کرنا جس وقت کہ یہ امور بوجہ احسن تمام ہوئے تو خدائے تعالیٰ اپنے رسول صلعم پر یہ آیت نازل کیا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ۔ آج کے روز کامل کیا میں واسطے تمہارے واتممت علیکم نعمتی اور تمام کیا میں نے اوپر تمہاری نعمت کیتیں میری یہ آیت عرفات میں نازل ہوئی تھی جس وقت کہ حضرت صلی اللہ علیہ والہ وصحبہ وسلم حجتہ الوداع میں خطبے میں تمام مناسکِ حج بیان فرمائے اور کہے کہ میرے تمام مناسک حج سیکو شاید کہ سال آئندہ میسر نہ ہوگا۔ پس

جبریل علیہ السلام یہ سورہ لائے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ جس وقت کہ آئی مدد خدائے تعالیٰ کی کہ تمہارے تئیں قریش پر فتح دیا۔ وَالْفَتْحُ اور فتح مکہ تمہارے تئیں اور فتح تمام شہروں کی تمہاری امت کے تئیں وَرَاَیْتَ النَّاسَ اور دیکھے ہو تم اے محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وسلم لوگوں کے تیں یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ داخل ہوتے ہیں بیچ دینِ اسلام خدائے تعالیٰ کے اَفْوَاجًا گروہ گروہ ——— یہ سورہ نازل ہونے کے بعد جماعت جماعت ایمان لاتے تھے جیسا کہ بنی اسد اور بنی قرلیلہ اور بنی مروہ وغیرہ۔ حضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم کے جنابین آکر مشرف ہوتے تھے۔ فَسَبِّحْ، پس تسبیح کرو تم اے محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وسلم بِحَمْدِ رَبِّکَ سات حمد پروردگار تمہارے۔ یعنی (کہو) سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ، عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ یہ سورہ نازل ہونے کی بعد ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیں دیکھتی تھی کہ ہر نماز کے بعد فرماتے تھے سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَاسْتَغْفِرْہُ۔ اور طلب مغفرت کرو تم اے محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم اوس خدا سے یعنی واسطے کسر نفسی سے کمینے عمل کا اقرار کر دیا استغفار کرو واسطے امت اپنی۔ تحقیق وہ خدائے تعالیٰ کَانَ تَوَّابًا ہے توبہ قبول کرنے ہارا مغفرت والوں سے۔

تفسیر تصریح وتفسیر پارہ عم یَتَسَاءَلُوْنَ وتفسیر پارہ عم وتبارک

مولوی حافظ میر شجاع الدین حسین

یہ ایک ہی تفسیر کے تین مخطوطے تین مختلف ناموں سے دستیاب ہیں۔ ان ناموں کے علاوہ کاتبوں نے سرورق پر اس کا نام "تفسیرُ الحمدُ" بھی لکھ دیا

ہے۔ یہ غالباً اس لیے کیا گیا ہے کہ عوام پارہ عم کو عموماً الحمد کا پارہ کہہ دیتے ہیں۔ لہذا اس کو "تفسیر الحمد" کہہ کر کاتبوں نے گویا عوام کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن مفسر نے اس کو تفسیر تصریح کے نام سے موسوم کیا ہے۔

زیرِ نظر تفسیر کے لکھنے والے مولوی حافظ میر شجاع الدین حسین ہیں۔ موصوف حیدرآباد دکن کے ایک بڑے عالم صوفی اور صاحبِ تصنیف بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے اجداد اکبر بادشاہ کے زمانہ میں برِصغیر میں وارد ہوئے تھے۔ بعد میں ان کے والد بزرگوار مولوی کریم اللہ نے برہان پور میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں شاہ ہاشم برہان پوری کی اولاد میں ایک خاتون سے شادی کر لی تھی۔ مولوی شجاع الدین حسین ان ہی خاتون سے سنہ ۱۱۷۸ ہجری مطابق ۱۷۶۵ عیسوی میں بمقام برہان پور پیدا ہوئے۔ لیکن ایک ہی سال بعد والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ان کی پرورش اور تربیت کا بار ان کی والدہ پر پڑ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برہان پور علم وفضل کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مولوی شجاع الدین حسین صاحب کو بڑے بڑے علماء وفضلا سے استفادہ علمی کا موقع ملا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حج وزیارت کے فریضہ کی ادائیگی کی۔ واپس آکر حیدرآباد میں توطن اختیار کر لیا۔ چارمینار کے قریب جامع مسجد میں قیام کیا اور وہیں طلبہ کو درس دینے لگے۔ یہ زمانہ راجا چندو مل اور نواب شمس الامرا کے اقتدار کا تھا۔ یہ دونوں حضرات علم اور علماء کے قدردان تھے۔ لہذا انھوں نے مولوی شجاع الدین حسین صاحب کی کافی پذیرائی کی۔ اور مسجد کے کمرے ان کے شاگردوں کے قیام کے لیے درست کرا دیے۔

مولوی شجاع الدین صاحب، شاہ رفیع الدین قندھاری سے بیعت تھے۔ ان ہی سے خلافت ملی۔ درس وتدریس اور رشد وہدایت کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف سے بھی شغف تھا۔ کئی کتابیں اردو میں لکھیں۔ ان ہی میں

تفسیر تشریح بھی ہے۔ یہ پارہ عم کی اردو میں تفسیر ہے جس کا ایک مخطوطہ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن میں بھی ہے۔ اس کے سرورق پر سرخ روشنائی سے یہ عبارت درج ہے:

"این کتاب الحمد تفسیر مولوی میر شجاع الدین صاحب برائے خاطر امام الدین صاحب سید عبداللہ مکان نوشتہ دادہ شد"

اس کے نیچے سیاہ روشنائی اور کسی اور کے قلم سے یہ عبارت مرقوم ہے۔

"این کتاب الحمد تفسیر مولوی میر شجاع الدین صاحب (مولوی) ملک سید عبداللہ ولد سید یوسف الامیر غفر اللہ ولوالدیہ آمین"

ان دونوں عبارتوں میں تفسیر کا نام "کتاب الحمد" درج ہے جب کہ ترقیمہ میں اس کو تفسیر تقریح کہا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ترقیمہ: "بفضلہ تعالیٰ تفسیر تقریح میر شجاع الدین صاحب والامناقب برزبان ہندی فرمودہ اند اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالْمِنَّۃَ این تفسیر الحمد وبتاریخ یازدہم سفر المبارک بروز سہ شنبہ دووقت پہر روز و نیک ساعت در زمانہ نواب مستطاب معلی الالقاب سپہر رکاب نواب نصیر الدولہ بہادر چراغ آصفی رئیس دکن فرخندہ بنیاد حیدر آباد باتمام رسید وخط خام کیثف وکمترین سید عبداللہ ولد سید حسیب صاحب برائے خاطر حضرت امام الدین صاحب نوشتہ دادہ شد"

ترقیمہ سے کئی باتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ کتاب کا اصل نام "تفسیر تقریح" ہے جو خود مفسر کا دیا ہوا ہے۔ کاتب نے عوام کے سمجھانے کو تفسیر الحمد کر دیا ہے۔ اس کی تکمیل ۱۱ر صفر کو منگل کے دن ہوئی اور یہ دور حکمرانی نواب ناصر الدولہ کا تھا۔ سنہ مذکور نہیں۔ لیکن بابائے اردو مولوی عبدالحق نے سنہ اختتام ۱۲۴۸ھ دیا ہے۔ تقویم میں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۱ر صفر ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۰ر

جولائی ۱۸۳۲ء کو منگل کا دن تھا۔ لہٰذا سنہ ۱۲۴۸ھ ہی وہ سنہ ہے جو ترقیمہ میں درج ہونا چاہیے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفسیر کے مکمل ہونے کی تاریخ نہیں ہے بلکہ اس کتابت کی تکمیل کی تاریخ ہے جس کا ترقیمہ ہے۔

اس قیاس کی تصدیق ایک اور مخطوطہ کے ترقیمہ سے ہوتی ہے۔ یہ مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زیر نظر تفسیر ماہ رجب کی چاندرات سنہ ۱۲۴۷ ہجری کو مکمل ہوئی۔ اس مخطوطہ کا ترقیمہ ذیل میں درج ہے۔

ترقیمہ

"بتاریخ سلخ (چاندرات) ماہ رجب المرجب سنہ ۱۲۴۷ ہجری تمام شد۔ تمت تمام شد تفسیر حضرت مولانا میر شجاع بتاریخ ہشتم محرم الحرام سنہ ۱۲۵۷ ہجری روز چہار شنبہ یکنیم پاس روز برآمدہ بود۔ تحریر یافت بخط فقیر حقیر شیخ محمد عرف کالے خاں ساکن بلدہ فرخندہ بنیاد حیدر آباد برائے خود قلمے نمود"

تفسیر تقریح کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مفسر نے تفسیر کو زیادہ پھیلایا نہیں تاہم زبان کافی صاف اور بامحاورہ ہے۔ انداز بیان سلجھا ہوا ہے اور مضمون عام فہم ہے۔ سورہ نبأ کے ابتدائی حصہ کی تفسیر ذیل میں درج ہے۔ اس سے اس کی خوبی کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں آشکارا لوگوں کو اسلام کی طرف بولانے (بلانے) لگے۔ سب کافران (کافر) تعجب سے آپس میں پوچھنے لگے کہ نیا دین اور نیا قرآن کیا ہے؟ کسی نے کہا شعر ہے۔ کسی نے کہا سحر ہے، کسی نے کہا اگلے قصے ہیں۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ

اونکے حال سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خبردار کیا (کہ) عَمَّ
یَتَسَاءَلُوْنَ کس چیز سے آپس میں ایک کو ایک پوچھتے
ہیں کہ کافر آپ ہی۔ حق نے ایسا فرمایا عَنِ النَّبَاءِ الْعَظِیْمِ
الَّذِیْ خبر بڑی ہے کہ وہ قرآن ہے۔ ھُمْ فِیْہِ الیا قرآن کہ
وہ کفار اوس میں مُخْتَلِفُوْنَ اختلاف کرتے ہیں۔ کوئی کچھ کہتا
ہے اور کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ تحقیق
جلد ہی جانیں گے۔ جب قیامت آئے گی کہ پیغمبر خدا کے تھے اور
قرآن خدا کا کلام۔ ثُمَّ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ پھر تحقیق جلد ہی
جانیں گے کہ بُرا کیا جو ایمان نلائی ہم (بُرا کیا ہم نے جو ایمان
نہ لائے) اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِھَادًا۔ آیا نہیں کیے (کیا)
ہم نے زمین کو بچھونا کہ سب اوس پر ٹھہریں وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا
اور پہاڑوں کو میخیں۔ جب زمین کو پیدا کیا وہ پانی پر ہلتی تھی۔
پھر پہاڑوں کو میخیں اوس پر رکھا تب زمین ٹھہری وَخَلَقْنٰکُمْ
اَزْوَاجًا اور پیدا کیے ہم نے تمہیں جوڑے جوڑے کو تم سے
اولاد ہووے۔ یا بھانت بھانت جیسا کالے گورے اونچے
نیچے اچھے برے وَجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا اور کیے (کیا)
ہم نے نیند کو رات کا لباس کہ سب کو اندھاری سے ڈھانپتے
ہی۔ (ڈھانپتی) وَجَعَلْنَا النَّھَارَ مَعَاشًا اور کیے (کیا)
ہم نے دن کو معاش کا وقت کہ اوس میں روزی پیدا کرو اور
پھرو چلو، پکاؤ کھاؤ......"

اتنی طویل عبارت میں محض چند الفاظ ایسے ہیں جن کا استعمال آج کل کے
محاورہ کے مطابق نہیں ہے۔ ورنہ ایسی سادہ زبان کو کام میں لایا گیا ہے۔

کہ ہر شخص اس کو بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ نہ صرف قدیم زبان کے الفاظ استعمال
کیے گئے ہیں اور نہ عربی، فارسی کے الفاظ کی بھرمار ہے۔ عبارت مختصر اور
سلجھی ہوئی ہے۔ کام کی باتیں بیان کر دی گئی ہیں۔ کسی بات کو ترجیح دینے کی کوشش
نہیں کی گئی۔ یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہ ایک دکنی نژاد شخص کی زبان ہے۔
اور اب سے پورے ایک سو باٹھ سال پہلے کی اردو کا نمونہ ہے۔

تفسیر زَادُ الْآخِرَت (منظوم)

قاضی عبد السلام بدایونی

تفسیر "زَادُ الْآخِرَۃ" کے مصنف قاضی عبد السلام بدایونی بن عطاء الحق
ہیں۔ "زَادُ الْآخِرَت" اس تفسیر کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۴۴ھ کے عدد برآمد
ہوتے ہیں۔ گویا یہ منظوم تفسیر ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء میں لکھی گئی۔

مفسر موصوف قاضی عبد السلام ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۷ء میں بدایون میں
پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا اسم گرامی عطاء الحق تھا۔ چچا مولوی بہاء الحق،
ملا عبد العلی بحر العلوم کے شاگرد تھے۔ اس نسبت سے ان کے علمی مرتبہ کا بخوبی
اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قاضی عبد السلام نے ان ہی فاضل چچا سے تحصیل علم
کی۔ بعدہٗ حضرت آلِ احمد عرف اچھے میاں مارہروی کے دست حق پرست پر
بیعت کی اور خلافت پائی۔ ان کو تصنیف و تالیف سے بھی لگاؤ تھا۔ نہایت
پُرگو شاعر تھے۔ سلام تخلص تھا۔ ان کی کئی تصانیف منظوم ہیں۔ تفسیر قرآن بھی
نظم میں لکھی۔ اس منظوم تفسیر کے اشعار کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے۔ دیگر
تصنیفات و تالیفات حسب ذیل ہیں۔

اخبار الابرار (فارسی میں تصوف کے موضوع پر ایک اچھی کتاب ہے)
شرح دلائل الخیرات (فارسی) رسالہ علم الفرائض (فارسی) طوفان عشق (فارسی)

قاضی عبدالسلام کا انتقال ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں ہوا کسی شاعر نے مادہ تاریخ وفات کو اس شعر میں نظم کیا ہے[1]۔

گفت ہاتف گزشت از سر جاں ÷ قاضی عبدالسلام عباسی

۱۲۹۲-۳=۱۲۸۹ھ

قاضی عبدالسلام کی دیگر تصانیف فارسی میں ہیں۔ صرف تفسیر زاد الآخرت اردو میں ہے۔ یہ تفسیر مولوی محمد محمود بخش کی تحریک اور امداد و اعانت سے لکھی گئی۔ وہ اس وقت کالپی ضلع جالون کی منصفی درجہ اول پر فائز تھے۔ پھر اس تفسیر کو مطبع نولکشور نے ۱۲۸۵ھ دو جلدوں (چار حصوں) میں چھاپا۔ غالباً اپنی نوعیت کی یہ پہلی کوشش تھی۔

تفسیر کا طریقہ یہ رکھا ہے کہ پہلے آیت لکھی پھر اس کے نیچے اشعار میں تفسیر بیان کی۔ نمونے کے طور پر ذیل میں سورہ یوسف کی چند آیتوں کی تفسیر پیش ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ

[وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان (دلیل اور حجت ـــــــ رب کی برہان سے مراد خدا کی سجھائی ہوئی دلیل ہے) نہ دیکھ لیتا]۔

اور کیا زن نے قصد یوسف کا ‏ ‏ ‏ اور یوسف نے قصد زن کا کیا

کرتی زن تھی مخالفت کا عزم ‏ ‏ ‏ اور یوسف مدافعت کا عزم

جو نہ ہوتا کہ دیکھی اوستی دلیل ‏ ‏ ‏ اپنے پروردگار کی بی قبیل

پیش آتا مخالفت کے ساتھ ‏ ‏ ‏ ای زلیخا پہ ڈالتا وہ ہاتھ

[1] تذکرہ علمائے ہند (اردو) مرتبہ و ترجمہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری ص ۲۹۹

لیک ہم نے دکھایا اس کے تئیں ‏ ‏ ‏ نور عصمت کا ای رسول امیں

یا نبوت کا نور دکھلایا ‏ ‏ ‏ کہ وہ محبت سی اوس کی باز آیا

یا برائی زنا کی دکھلائے ‏ ‏ ‏ تاکہ مائل وہ اس کی تئیں آئے

یا نظر آئی اونکے تئیں جبریل ‏ ‏ ‏ یا کہ دکھائی اون کو اسرائیل*

یا کہ سن کر ای غیب کی آواز ‏ ‏ ‏ رہ گئی اس مخالفت سے باز

لیکن جب موضوع کی نوعیت کو سامنے رکھ کر اس کا جائزہ لیا جائے تو مفسر کی اس سعی کو لاحاصل نہیں کہا جائے گا بلکہ ان کی اس کوشش کو دل کھول کر سراہنا پڑے گا۔ غالب، مومن اور ذوق اُن اصناف میں طبع آزمائی کر رہے تھے جن کو ان کے پیشرو کافی بلندیوں پر پہنچا چکے تھے۔ قاضی عبدالسلام صاحب کا تجربہ بالکل نیا تھا۔ پھر یہ کوئی تخیلی شے نہیں تھی جس میں قوتِ متخیلہ سے کام لے کر شاعر رنگینی و رعنائی پیدا کر سکتا ہے بلکہ یہ مضامین قرآن کا معاملہ تھا جہاں ایک طرف تو سادہ حقائق بیان کرنا جن میں نہ مبالغہ آرائی کی گنجائش اور تخیل کی بلند پروازی کا کوئی دخل۔ خالق کے کلام کی تشریح و تفسیر بیان کرنا، ہر قدم پر لغزش کا خطرہ۔ شاعر کو ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ پھر اشعار کی تعداد دیکھیے، دو لاکھ! اتنے اشعار کہنا ہی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ غالب، مومن اور ذوق کو بھی اگر اس پُرخار وادی سے گزرنا پڑتا تو یقین ہے کہ وہ بھی آبلہ پائی سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکتے۔ ذوق نے جن اشعار میں پند و نصائح کی ہیں ان کا نمونہ یہ ہے۔

نام منظور ہے توفیق کے اسباب بنا ‏ ‏ ‏ پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

* حضرت یعقوب کا لقب

اسی طرح اگر قادر نامہ غالب کا نتیجۂ فکر ہے تو اس کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

جس نے قادر نامہ سارا پڑھ لیا　　اس کو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

دونوں عظیم شعراء کے ان اشعار میں ادبیت اور شاعرانہ لطافت کا نشان تک نظر نہیں آئے گا۔ دراصل خیالی مضامین میں لطافت و شعریت پیدا کی جاسکتی حقائق اور پند و نصائح میں ان کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا قاضی عبدالسلام کی اس پیشکش کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اور ان کی اس کوشش کو سراہنا چاہیے۔ انھوں نے خود سے اپنے لیے زمین تیار کی اور اس پر یہ فلک بوس عمارت تعمیر کی ہے اس معاملہ میں انھیں جو اولیت کا درجہ حاصل ہے وہ ان کے لیے انتہائی فخر و افتخار کا موجب ہے۔

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ (ایسا ہوا تاکہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کریں)

اس طریقی سی ایستودہ شعار　　بھی اوس کو دیا ثبات و قرار
تاکہ پھیریں برائی اوس سے ہم　　اور وہ بے حیائی اوس سے ہم
ای بچایا سر دیانت سے　　اوسکو سید کی اوس خیانت سے (ای بیگم)
اور بھی رکھا زنا سے باز　　کرنی پایا نہیں وہ دست دراز

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (درحقیقت وہ ہمارے چُنے ہوئے بندوں میں سے تھا)

کہ وہ بندوں چنی گیولسی ہے　　خالصوں اور مخلصوں سی ہے
جب وہ پہونچا کمال کو اصرار　　کرگئی یوسف اوس جدی فرار
پس بحکم مفتح الابواب　　پہونچی جس در پہ کھا گیا وہ شتاب
پر زلیخا کو کہاں نہ صبر و سکوں　　خواہش دل پہ اپنی تھی مفتوں

درِ عبرت نہیں کھلا اوس پر　　ان کی در پی ہوئی وہ تالب در[1]

واضح رہے کہ جس زمانہ میں قاضی عبدالسلام صاحب نے یہ منظوم تفسیر لکھی تھی وہ غالب، مومن اور ذوق کا دور تھا۔ اردو شاعری بالخصوص غزل اندک کی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ اس کیفیت کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو ادبی نقطۂ نظر سے قاضی عبدالسلام کی یہ طویل نظم پست معیار کی نظر آئے گی شاعرانہ لطافت و دلکشی تو دور کی چیز ہے، زبان کے اعتبار سے بھی یہ زیادہ اچھی نہیں کہی جاسکتی۔ سچ پوچھیے تو ایک صدی بیشتر کی زبان سے بھی اس کا رتبہ بہت پست ہے۔ بلاض مواقع پر تو الفاظ کا استعمال بھی زیادہ موزوں نہیں۔

تفسیر سورہ یوسف (منظوم)

حکیم محمد اشرف کاندھلوی

سورہ یوسف کی یہ منظوم تفسیر حکیم محمد اشرف کاندھلوی نے لکھی تھی۔ حکیم صاحب مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے بھتیجے اور داماد اور مفتی صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا امام الدین کے صاحبزادے تھے۔ حالات مشائخ کاندھلہ میں لکھا ہے کہ امام الدین والد اور بھائی کے سامنے عین شباب میں انتقال فرما گئے۔ رجب ۱۲۰۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت مفتی صاحب نے اپنی تحریرات میں جابجا ان کی ذکاوت، ذہانت اور علمی قابلیت کا اعتراف کیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے مخصوص شاگردوں میں سے تھے۔ اور حضرت مفتی صاحب سے بھی استفادہ کیا تھا۔۔۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب فرمایا کرتے تھے۔ "میں نے عمر بھر میں مولوی امام الدین سے زیادہ

---

[1] بحوالہ "قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (ڈاکٹر سید حمید شطاری) صفحات ۳۸۷، ۳۸۸

ذہین اور عالی طبع نہیں پایا۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہمیشہ ان کی رسا، دور اور پرداز ذہن کو اس سے بلند و بالا پایا۔" مولانا امام الدین صاحب نے ایک لڑکا مولانا حکیم محمد اشرف یادگار چھوڑا۔

نہ مولانا امام الدین کا سنہ پیدائش معلوم ہے اور حکیم محمد اشرف کا سنہ ولادت کہیں مذکور ہے۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ مولانا امام الدین مفتی الٰہی بخش سے چھوٹے تھے اور وہ ۱۲۰۰ھ میں عین شباب میں فوت ہوئے نیز مفتی صاحب کا سنہ پیدائش ۱۱۶۲ھ ہے لہٰذا ان سب امور سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ مولانا امام الدین ۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوتے تھے اور حکیم محمد اشرف جو ان کے اکلوتے صاحبزادے تھے۔ ۱۱۹۰ھ کے بعد پیدا ہوئے ہوں گے۔

مولانا حکیم محمد اشرف نے تحصیلِ علم اپنے یگانۂ عصر اور عالم اجل تایا حضرت مفتی الٰہی بخش سے کی۔ وہ مفتی صاحب کے ممتاز اور مایہ ناز شاگردوں میں تھے۔ اس لیے وہ بھی معقولات پر پورا عبور رکھتے تھے۔ علم طب میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے اور نبض شناسی میں سب سے زیادہ فائق تھے۔ علم طب میں ایک ضخیم کتاب "بحر العلاج" تصنیف کی جو تمام امراض کے معالجہ پر مشتمل ہے۔ تفسیر سورہ یوسف کے علاوہ مثنوی غنیمت کے مقابلہ میں ایک فارسی مثنوی بھی تصنیف کی۔ اور بھی بعض کتابیں لکھیں جو ضائع ہوگئیں۔ عمر کے آخری حصّہ میں قصبہ خانپور ضلع بلند شہر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ۱۲۴۷ھ میں وفات پائی۔ ان کی شادی مفتی الٰہی بخش صاحب کی صاحبزادی بی بی وزیراً سے ہوئی تھی۔ صرف ایک صاحبزادہ مولوی حکیم محمد مشرف یادگار چھوڑا جس کا انتقال ۱۳۰۹ھ میں کاندھلہ میں ہوا۔[1]

---

[1] حالات مشائخ کاندھلہ، تالیف مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی ادارہ اشاعت دینیات حضرت نظام الدین نئی دلی۔ سنہ طباعت ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۰؛ صفحات ۲۴ تا ۲۷۔

مولانا حکیم محمد اشرف صاحب کی شہرت تفسیر سورہ یوسف کی وجہ سے ہوئی۔ رواں صدی عیسوی کے اوائل تک میں یہ تفسیر کافی مقبول تھی۔ شریف اور دیندار گھرانوں میں بچوں اور بچیوں کو خاص طور پر پڑھائی جاتی تھی مگر اب یہ ایک تاریخی شے بن گئی ہے اور اس کے سنہ تصنیف تک کا صحیح علم پڑھے لکھے لوگوں تک کو نہیں ہے۔ ڈاکٹر سیّد حمید شطاری کتب خانہ سالار جنگ کے ایک نسخے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ نسخہ سنہ ۱۲۶۴ ہجری میں چھپا تھا چنانچہ ترقیمے سے اس کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

ترقیمہ :

> اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہ تفسیر سورہ یوسف علیہ السّلام تصنیف حکیم محمد اشرف صاحب متوطن قصبہ کاندہلہ متصل محرم الحرام کی پندرہویں کو سنہ ۱۲۶۴ ہجری، بارہ سو چونسٹھ بندہ گمر (پر) گناہ محمد عبداللہ مجید پوری عفی اللہ عنہ کے اہتمام سے چھپ کر اختتام کو پہنچی۔"[1]

اس کے بعد شطاری صاحب رقم طراز ہیں :

لیکن کتاب کے سرورق پر بخط جلی یہ لکھا ہے :

> "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہ کتاب مستطاب تفسیر سورہ یوسف در سنہ ۱۲۰۶ھ نبویہ باہتمام محمد عبداللہ مجید پوری عفی عنہ در جزیرہ معمورہ بمبئی حلیہ طبع پوشیدہ۔"[2]

ان دونوں تحریروں میں تفسیر کی طباعت کے سنہ میں جو تضاد پایا جاتا ہے اس کی ایک توجیہ تو شطاری صاحب نے یہ کی ہے کہ :

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (شطاری) ص ۳۹۰

[2] ایضاً ص ۳۹۰

"۱۲۰۶ ہجری کا سنہ کتابت کی غلطی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔
ترقیمے میں مندرج سنہ ۱۲۶۴ ہجری صحیح ہوگا۔"[1]

لیکن ان کے نزدیک دوسری توجیہہ یہ ہو سکتی ہے "یا یہ کہ سنہ ۱۲۰۶ ہجری میں یہ کتاب پہلی مرتبہ چھپی ہے اور سنہ ۱۲۶۴ ہجری میں دوسری مرتبہ۔"[2] حکیم محمد اشرف کاندہلوی مفسّر کے حالات و کوائف کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو پہلی توجیہہ کو صحیح ماننا پڑے گا۔ اس لیے کہ سنہ ۱۲۰۶ ہجری میں خود حکیم صاحب کی عمر ۱۴، ۱۵ سال سے زیادہ نہیں ہوگی اور اس وقت ان کا دورِ طالب علمی چل رہا ہوگا۔ پھر سنہ ۱۲۰۷ ہجری کی مطابقت ۹۲ - ۱۷۹۱ء سے ہوتی ہے۔ اس وقت تک برِصغیر میں کوئی مطبع بھی قائم نہیں ہوا تھا۔ ایسی صورت میں محمد عبداللہ مجید پوری عفی عنہ نے اس تفسیر کی طباعت کا انتظام کہاں کیا ہوگا۔

ڈاکٹر شطاری صاحب کا یہ کہنا بھی درست نہیں معلوم ہوتا کہ:

"ترقیمے کی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ سنہ ترجمہ بھی ۱۲۶۴ ہجری ہے۔"[3]

اوّل تو ترقیمے کی عبارت میں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ مترشح ہوتا ہو کہ سنہ ترجمہ ۱۲۶۴ ہجری ہے۔ پھر جب مفسر کا انتقال سنہ ۱۲۴۷ ہجری میں ہو چکا تھا تو ترجمہ ۱۲۶۴ ہجری میں کیسے ہوا ہوگا۔

ان توضیحات کے بعد بابائے اردو کا یہ قیاس مع الفارق معلوم ہوتا ہے کہ سنہ تفسیر ۱۲۶۸ ہجری ہے۔

غرض اس حقیقت کی روشنی میں کہ مفسّر علام حکیم محمد اشرف کاندہلوی

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (شطاری) ص ۳۹۱
[2] ایضاً ص ۳۹۱ [3] ایضاً ص ۳۹۱

کا انتقال ۱۲۴۷ھ مطابق ۳۲ - ۱۸۳۱ء میں ہوا۔ یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ تفسیر سورہ یوسف تیرہویں صدی ہجری کے نصف اول یا انیسویں صدی عیسوی کے پہلے ربع میں ہوئی۔ ڈاکٹر سیّد حمید شطاری نے زبان کی روانی اور صحت کی طرف جو ایک ہلکا اشارہ کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ واقعی زمانۂ تحریر کے لحاظ سے تفسیر زیرِ نظر کی زبان بہت صاف، رواں اور سلجھی ہوئی ہے۔ اس دور کے ولی اللہٰی سلسلے کے اور علماء کی زبان بھی اتنی صاف اور شگفتہ ہے کہ اس پر موجودہ دَور کی زبان ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں کے والد اولاد حسن قنوجی کے دو تین رسالے نظر سے گزرے جو اردو میں لکھے گئے تھے۔ ان کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کی زبان ڈیڑھ سو سال سے زیادہ پرانی ہے۔

تفسیر سورہ یوسف کو ترتیب دینے میں مفسّر نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے فرمایا ہے:

"طریقہ یہ رکھا ہے کہ عنوان میں قرآن کی آیت ہے اور نیچے اسکا اردو ترجمہ نثر میں۔ اس کے بعد نظم میں اس کی تفسیر۔"
مثلاً آیت وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ
نیچے نثر میں ترجمہ:
اور چھوڑا یوسف کو اپنے اسباب پاس پھر اوس کو کھا گیا بھیڑیا۔
اور تو باور نہ کرے گا ہمارا کہنا اگرچہ ہم سچے ہوں۔"[1]

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (شطاری) ص ۳۹۱

آیت مندرجہ بالا کی منظوم تفسیر

بٹھا ہم نے یوسف کو کپڑوں کے پاس — گئے دوڑتے سب کے سب بے حواس
کہ اتنے میں بھیڑیا آ اسے کھا گیا — یقیں ہوگا تجھ کو کب اس بات کا
اگرچہ ہم آپس میں ہیں راست گو — ولے اس کو کب راست جانے ہے تو
یہ آیت کے معنے ہوتے ہیں یہاں — اب آگے سنو اس کی ہے داستاں
سنا جب کہ یعقوب نے یہ کلام — ہوا کام گویا کہ اس کا تمام
گرا کھا کے غش اور گیا دل دھڑک — غشی میں رہا صبح سے شام تک
لگی رونے اولاد اس کی تمام — کہا سب نے بے جا ہوا ہم سے کام
کیا قتل بھائی کو اور باپ کو — گنہگار ہم نے کیا آپ کو
قیامت کو کیا دیں گے اس کا جواب — خدا جب کہ لیوے گا ہم سے حساب
یہ کہہ کہہ کر روتے تھے چھوٹے بڑے — اور آگے تھے یعقوب ان کے پڑے
جو دیتے تھے جنبش نہ ہلتے تھے وہ — کسی طرح سے نہ سنبھلتے تھے وہ
کہا بعض نے ایک بارہ سے گم — ہوا اس کا بیٹا یہ دیکھو ہو تم
عجب اس کی حالت ہے مرتا ہے یہ — نہ بولے ہے نے سانس بھرتا ہے یہ

وہ جس کی فقط ایک اولاد ہو
وہ مرجائے تو پھر کیوں نہ برباد ہو

تفسیر القرآن

سر سیّد احمد خاں

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں سات سمندر پار سے آئی ہوئی انگریز قوم کی فتح اور مجاہدین کی شکست کے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ اس کے اثرات برِصغیر میں بسنے والی ہر قوم پر پڑے۔ مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی تہذیب، ثقافت، معاشرت اور معیشت اور ان کے علوم و فنون سب ہی پر مغرب کے اثرات مرتب ہوئے۔ یہاں تک کہ قرآن کریم کی تفسیر بھی ان اثرات کی زد سے نہ بچ سکی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخری ربع میں سر سیّد نے قرآن کی جو تفسیر لکھی وہ بڑی حد تک اس رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ سر سیّد کو ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اس کو سمجھنے کیلیے ان کے حالاتِ زندگی جاننا بہت ضروری ہے۔ اسے اس پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت یوں بھی ہے کہ عیسائی مشنری اسلام اور مسلمانوں پر علی الاعلان حملے کر رہے تھے اور ان کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اور قرآن و حدیث کے مضامین کی تلبیس کر رہے تھے۔

سر سیّد دہلی کے ایک ذی وجاہت سیّد خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے گھر کا ماحول دینی اور رہن سہن مشرقی انداز کا تھا۔ اس دور کے علماء اور مشائخ سے خاص عقیدت تھی۔ سر سیّد جو ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ وہ مرزا جان جاں مظہر کے خلیفہ حضرت شاہ غلام علی کا ذکر نہایت عقیدت و احترام سے کرتے ہیں اور اپنے خاندان کے شاہ صاحب سے تعلقات کا ذکر بڑے والہانہ انداز سے کرتے ہیں۔ سر سیّد کی تعلیم بھی مشرقی انداز پر ہوئی تھی۔ انھوں نے دلّی کالج میں تعلیم پائی اور مولانا مملوک العلی نانوتوی کے سامنے

زانوئے شاگردی نہ کیا ــــــ چنانچہ وہ اپنے استاد کے علم و فضل کے بیحد
مداح و معترف تھے۔ چونکہ بانیٔ دار العلوم دیوبند کے بھی وہی استاد رہے
اس لیے یہ بات غلط نہیں کہ دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ بعض
وجوہ سے سرسید تعلیم مکمل نہ کر سکے لیکن چونکہ غیر معمولی طور پر ذہین و ذکی الطبع
تھے اس لیے نجی طور پر انھوں نے اپنی علمیت میں بے حد اضافہ کر لیا اور تھوڑی
ہی عمر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو گئے۔ اس وقت بھی دو باتوں میں
کوئی فرق نہیں آیا۔ نہ انھوں نے اپنی معاشرت بدلی اور نہ مطالعۂ کتب کو
ترک کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے تحقیق اور تصنیف و تالیف کے
کاموں کو بھی جاری رکھا۔ ان کا تحقیقی شاہکار "آثار الصنادید" اسی دور
کی تخلیق ہے۔ اس کتاب میں دہلی کے آثارِ قدیمہ کے بارے میں معلومات حاصل
کرنے کے لیے سرسید نے جو کاوش کی ہے وہ ان کا بہت بڑا اور اہم کارنامہ
ہے۔ مشاہیر کے حالات معلوم کرنے میں بھی انھوں نے نہایت تحقیق و تفتیش
سے کام لیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں بڑی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے۔ اس
کتاب میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ کافی مسجع و مقفیٰ ہے۔ غرض ۱۸۵۷ء سے
پہلے انھوں نے ہر کام مشرقی انداز میں کیا ہے۔ سرسید احمد خاں اور مولانا قاسم
نانوتوی ایک ہی سرچشمۂ فکر سے فیضیاب تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کا سب سے المناک اور غم انگیز پہلو یہی
تھا کہ سپاہی کی تلوار نہیں ٹوٹی تھی بلکہ اس کا جذبۂ حریت فنا ہو گیا تھا اور اسکی
سرفروشی کی تمناؤں کا قافلہ لٹ گیا تھا۔ ایک بہت بڑا سانحہ یہ تھا کہ ولی اللہی
جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک گروہ حق کے اس جادۂ قویمہ پر
استوار رہا جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حکمت بالغہ
نے متعین کیا تھا۔ اس گروہ کے رہنما مولانا قاسم نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند تھے

دوسرا گروہ سرسید احمد خاں کا تھا جنھوں نے برٹش استعمار اور ہندوؤں
کی دشمنی میں پسے ہوئے مسلمانوں کو بچانے کے لیے حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے
ہوئے مسلمانوں کی اس حالتِ زار کے اصل اسباب تلاش کرنے اور ان کے حل
پیش کرنے کا ارادہ کیا۔ سرسید احمد خاں اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب مسلمان حکومت
سے ٹکر لے کر اور جدید علوم و فنون سے کنارہ کشی کر کے اپنا قومی وجود برقرار
نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ اس راز کو پا لینے کے بعد عملی اقدام کرنے کا فیصلہ کیا کہ سیاسی
میدان میں انگریز حکومت سے مفاہمت کی پالیسی اختیار کی جائے۔

انگریزی حکومت نے فتح حاصل کر کے سرسید کو تو خوب نوازا۔ ان کو خلعت
عطا کیا، وظیفہ دیا اور بعد میں سر کے خطاب سے نوازا۔ لیکن مسلمانوں کا وہ
قتل عام کیا کہ چنگیز خاں اور ہلاکو کے واقعات کو گرد کر دیا۔ ماشاء اللہ متمدن
اور مہذب قوم تھی۔ قتل کے وہ وہ طریقے اختیار کیے جو ہلاکو اور چنگیز خاں کے
فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھے۔ وہ غیر مہذب تو تلوار سے ایک ایک کر کے قتل
کرتے تھے۔ انھوں نے جمنا کی ریتی پر مظلوموں اور بے گناہوں کو کھڑا کر کے
ایک باڑھ میں سو سو، دو دو سو کو ختم کر دیا۔ وہ دقیانوسی لوگ تو مقتولوں کے
سروں کے مینار بناتے تھے۔ ان روشن خیال حضرات نے پوری پوری لاشوں کو
درختوں کی شاخوں پر لٹکا کر زاغ و زغن کے لیے ضیافت کا سامان کیا ــــ
ہفتوں اور مہینوں یہ سلسلہ چلا۔

سرسید نے ایک طرف یہ لرزہ خیز مناظر دیکھے، دوسری طرف وہ قوم کی
جانب سے طنز و تعریض کا ہدف بنے۔ ان دونوں باتوں سے بددل ہو کر انھوں نے
ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ انگریزی حکومت اپنے دل کی بھڑاس نکال ہی چکی تھی۔
اس لیے سرسید کو ہجرت سے باز رکھنے کے لیے ان کے کتابچے "اسباب بغاوتِ ہند"
پر عام معافی کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد مسلمان قوم کو معاشی طور پر تباہ کرنا

شروع کر دیا۔ جب اس پر احتجاج ہوا تو سرسیّد کو مشورہ دیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو مغربی علوم سیکھنے کی طرف راغب کریں۔ اس کے لیے ان کو انگلستان لے جا کر آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیاں دکھائیں اور مشورہ دیا کہ مسلمانوں کے لیے اسی قسم کا کالج قائم کریں۔ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ مسلمانوں کے علوم دقیانوسی ہو گئے ہیں اور موجودہ ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتے لہٰذا ان میں کچھ مغربی افکار و خیالات کی رنگ آمیزی کی جائے۔

انگریز کی ہدایت کے مطابق انگلستان سے واپس آکر ۱۸۷۵ء میں سرسیّد نے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم (ایم۔ اے۔ او کالج) کی بنیاد رکھی۔ اور اس میں وہی نصابِ تعلیم مقرر کیے جو مغربی جامعات میں ہوتا ہے جس کی وجہ سے دوسری قوموں کی درس گاہوں سے ہٹ کر اس میں کوئی انفرادیت قائم نہ ہو سکی۔ پھر اس مرکزِ علمی کا سربراہ انگریزی حکومت کا مسلّط کردہ کوئی انگریز ہوتا تھا اور عملاً اس کے افکار و خیالات پر وہاں کا نظام مبنی تھا۔ لوگ اس نظام کو سرسیّد کا نتیجۂ فکر سمجھ کر اس میں تبدیلی کا مشورہ دیتے تھے۔ مگر وہ مجبور تھے۔ اس لیے کہ ان کے اختیارات بہت محدود تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود سرسید کے خاص رفقاء کا ان سے اختلاف ہو گیا اور شبلیؔ کی مخالفت تو اس حد تک بڑھی کہ وہ قطع تعلق کر کے چلے گئے۔

سرسیّد کے دورۂ انگلستان کا اثر خود ان کے اپنے افکار و خیالات پر بھی ہوا اور وہاں کی مادی ترقی سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ اسلام کے بعض بنیادی عقائد کو بھی مادیت کی عینک سے دیکھنے لگے۔ لیکن اس معاملہ میں ان کے بعض قریبی ساتھیوں کی تائید حاصل نہ ہو سکی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ میگزین کے اکبر الہ آبادی نمبر میں "اکبر پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے اس حقیقت کو ان الفاظ

میں بیان کیا تھا۔

"سرسیّد جس طرح اور جس حد تک مغربیت سے متاثر تھے اس سے نہ حالیؔ کو اتّفاق تھا نہ شبلیؔ کو نہ نذیر احمد کو۔ یہ عجیب اتّفاق ہے کہ یہ تینوں مولوی تھے۔ لیکن پچاس سال بعد معلوم یہی ہوا کہ جہاں تک مغربیت سے احتیاط برتنے کا سوال تھا سرسیّد اور امیر علی دونوں سے یہ طبقہ زیادہ صاحبِ نظر نکلا۔"

سرسیّد کے ان خیالات کا اظہار ان کی تفسیر میں ہونا ضروری تھا، وہ ہوا ان کے سب سے زیادہ مدّاح و معتقد ساتھی حالیؔ تک کو بھی اس تفسیر کے بارے میں یہ کہنا پڑا:

"سرسیّد نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض مقامات پر ان سے رکیک لغزشیں ہوئی ہیں۔"

تفسیر خواہ کسی درجہ کی ہو لیکن یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ سرسیّد حق اور انصاف کے دامن کو کسی طرح ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے اور خود کو انسان ضعیف البیان قرار دے کر اپنی غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف کر لیتے تھے۔ انھوں نے لاہور میں اسلام پر ایک لیکچر دیا تھا اس کے درج ذیل حصّہ کو حالی نے "سرسیّد کی مذہبی خدمات" کے زیرِ عنوان مقالہ میں نقل کیا ہے۔ سرسید نے فرمایا:

"میں معصوم نہیں ہوں اور نہ معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ میں ایک جاہل آدمی ہوں۔ اسلام کی محبت سے میں نے یہ کام کیا ہے جس کے میں لائق نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ اس میں غلطی ہو مگر آئندہ علماء اس کی صحت کر دیں گے اور اسلام کو مدد دیں گے۔ میرے خیال میں مخالفین اور متشککین فی اسلام کے مقابلے میں اسلام کی تائید اسی طریقہ پر ہو سکتی ہے اور کسی طریقہ پر نہیں ہو سکتی۔"

اس عبارت سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہر کام میں سرسیّد کا جذبہ صادق ہوتا تھا۔ یقیناً تفسیر القرآن کے لکھنے میں بھی یہی جذبہ اور یہی نیت کارفرما رہی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی سہو ہوا ہے تو اس کو "اَلْاِنْسَانُ مُرَکَّبٌ مِنَ الْخَطَاءِ وَالنِّسْیَانِ" کے اصول کے تحت نظر انداز کیا جانا چاہیے۔ تفسیر لکھنے میں سرسیّد نے مغرب کے مذہبی حلقوں کی طرح عقل، نیچر اور تجربہ و مشاہدہ پر بہت زور دیا ہے۔ اس کی اصل وجہ تو وہی مغربیت کا اثر ہے جس کا صدر میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ دوسرا سبب قدیم مفسرین کی عجائب پرستی اور اسرائیلیات پر ضرورت سے زیادہ انحصار کے خلاف ردِّ عمل معلوم ہوتا ہے۔

"تفسیر القرآن میں پورے قرآن کی تفسیر نہیں ہے بلکہ سورہ اَنْبِیَاءُ تک کی تفسیر ہو سکی ہے۔ اس کے باوجود چھ جلدیں سرسیّد کی زندگی میں چھپ چکی تھیں۔ ساتویں لکھی جا چکی تھی مگر چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ۱۸۹۸ء میں سرسیّد نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور تفسیر نامکمل رہ گئی۔ پہلی جلد ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی تھی[1] جس سے یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہیں کہ اس کام کے لیے سرسیّد نے حیاتِ مستعار کے پورے اٹھارہ سال صرف کیے۔ اور یہ کام ستائش کی تمنّا اور صلہ کی پرواہ کیے بغیر محض اسلام کی محبّت میں کیا گیا۔

نمونہ کے لیے سورہ فاتحہ کا ترجمہ اور تفسیر ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(ترجمہ) خدا کے نام سے جو بڑا رحم والا ہے۔ بڑا مہربان ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ...... غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝

[1] تفسیر القرآن از سرسیّد، مطبوعہ مفید عام پریس، آگرہ۔

(ترجمہ) سب بڑائیاں خدا ہی کے لیے ہیں جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے (۱) بڑا مہربان اور بڑا رحم والا (۲) حاکم ہے انصاف کے دن کا (۳) تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے ہم مدد چاہتے ہیں (۴) ہم کو سیدھی راہ پر چلا (۵) ان لوگوں کی راہ پر جن پر تو نے بخشش کی ہے (۶) نہ ان کی راہ پر جن پر تیرا غصّہ ہوا ہے۔ اور نہ بہکنے والوں کی راہ پر۔

(تفسیر) "اس سورہ میں کچھ تو خدا کی تعریف ہے اور کچھ دعا۔ بس گویا بندوں کی زبان سے کہی گئی ہے۔ اور بلاشبہ بندوں کو خدا سے اس طرح التجا کرنی زیبا ہے۔"

"دعاء جب دل سے کی جاتی ہے ہمیشہ مستجاب ہوتی ہے مگر لوگ دعا کے مقصد اور استجابت کا مطلب سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جس مطلب کے لیے ہم دعا کرتے ہیں، دعا کرنے سے وہ مطلب حاصل ہو جائے گا اور استجابت کے معنی اس مطلب کا حاصل ہونا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلطی ہے حصولِ مطلب کے جو اسباب خدا نے مقرر کیے ہیں وہ مطلب تو انہی اسباب کے جمع ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر دعا نہ اس مطلب کے اسباب میں سے ہے اور نہ اس مطلب کے اسباب کو جمع کرنے والی ہے بلکہ وہ اس قوت کو تحریک کرنے والی ہے جس سے رنج و مصیبت اور اضطرار میں جو مطلب نہ حاصل ہونے سے ہوتا ہے تسکین دیتی ہے۔ اور جبکہ دعا دل سے اور اپنے تمام فطری قویٰ کو متوجہ کر کے کی جاتی ہے اور خدا کی عظمت اور اس کی بے انتہا قدرت کا خیال اپنے دل میں جمایا جاتا ہے تو وہ قوت تحریک میں آتی ہے۔ اور ان تمام قوتوں پر جن سے اضطرار پیدا ہوا ہے اور اس مصیبت کا رنج برانگیختہ ہوا ہے، ان سب پر غالب ہو جاتی ہے۔ اور صبر و استقلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اسی کیفیت کا دل میں پیدا ہو جانا مستجاب ہوتا ہے۔"

"اسی امر کا اشارہ آنحضرت صلعم نے ان لفظوں میں فرمایا ہے کہ اَلدُّعَاءُ

مُخُّ الْعِبَادَةِ "یعنی دعا خالص عبادت ہے۔ اور اس سے بھی واضح کر کے فرمایا کہ "اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ" یعنی دعا عبادت ہی ہے۔ پھر فرمایا کہ تمہارا پروردگار کہتا ہے کہ "اُدْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ" یعنی مجھ کو پکارو یا میری عبادت کرو۔ میں تمہارے لیے اس عبادت کو قبول کروں گا۔" (مشکوٰۃ)

"پس دعا سے مطلب کا حاصل ہونا موعود نہیں بلکہ عبادت کا جو نتیجہ ہے وہ موعود ہے دعا کے ساتھ۔ کبھی مطالب حاصل ہو جانا اتفاقیہ بات ہے جو اس کے اسباب جمع ہونے سے حاصل ہو جاتا ہے۔"

تفسیر فتح المنّان

معروف بہ تفسیر حقّانی

مولوی ابو محمد عبد الحق دہلوی

یہ اردو زبان میں قرآن مجید کی ایک مشہور تفسیر ہے اور مستند تفسیروں میں اس کا شمار ہے۔ مفسّر مولوی ابو محمد عبد الحق دہلوی ہیں۔

مولانا عبد الحق حقّانی بھی ڈپٹی نذیر احمد کی طرح دہلوی مشہور ہو گئے۔ ورنہ بقول قاری فیوض الرحمٰن "ان کا اصل وطن گمتھلا ضلع انبالہ (مشرقی پنجاب) تھا۔ وہیں وہ ۲۷ رجب ۱۲۶۷ھ (۲۸ مئی ۱۸۵۱ء) کو پیدا ہوئے۔"[۱] انھوں نے خود اپنا شجرۂ نسب یہ لکھا ہے۔

"ابو محمد عبد الحق بن محمد امیر بن شمس الدین بن نور الدین ابن خواجہ جعفر بن خواجہ سلیم بن مظفر الدین احمد بن شاہ محمد تبریزی۔"[۲]

درس نظامی کی بلند پایہ کتابیں مولانا لطف اللہ بن اسد اللہ علی گڑھی سے پڑھیں۔

---

[۱] قاری فیوض الرحمٰن "مشاہیر علماء" لاہور ۱۹۷۶ء ص ۲۵۷

[۲] تفسیر فتح المنّان المشہور بہ تفسیر حقّانی ۱-۲ مکتبۃ الحسن، لاہور ص ۱۲۸

حدیث مولانا عالم علی نگینوی سے پڑھی۔[۱] مولانا حکیم سیّد عبد الحیؒ "نزہۃ الخواطر" میں لکھتے ہیں کہ "ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ میں حاصل کی۔ پھر کانپور پہنچے اور مولانا عبد الحق بن غلام رسول حسینی سے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر مراد آباد جاکر صحاح ستہ میں سے کچھ کتابیں مولانا عالم علی نگینوی سے پڑھیں۔ پھر دہلی جاکر مولانا سیّد نذیر حسین محدث سے استفادہ کیا۔"[۲]

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مدرسہ فتحپوری دہلی میں تدریس پر مامور ہوئے۔ اور کافی مدّت تک درس و افادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہیں سکونت اختیار کرلی۔ اور وہیں شادی بھی ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلوی مشہور ہو گئے۔ کافی عرصہ بعد تدریس کو ترک کر کے تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ حیدرآباد دکن سے بغیر خدمت کے وظیفہ مل گیا۔ آخری عمر میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ۵۰۰ روپے ماہوار تنخواہ پر تقرر ہو گیا۔ لہٰذا بسلسلہ ملازمت کلکتہ چلے گئے۔ انگریزی حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ (۲۳ جون ۱۹۰۷ء) کو رہگرائے عالم بقا ہوئے۔

مولانا حکیم سیّد عبد الحیؒ تحریر فرماتے ہیں "بحث و مباحثہ میں قوی تھے۔ ملاحت اور حلاوت پائی جاتی تھی۔ خوش مزاج تھے۔ کتابیں تصنیف کیں جن سے ہند میں ان کی شہرت پھیل گئی۔ ان کی تصانیف میں اصول فقہ کی کتاب حسامی کی تعلیق "نامی"۔ عقائد الاسلام اصول دین میں (اردو) البیان فی علوم القرآن (اردو) فتح المنّان فی تفسیر القرآن (اردو) کئی بڑی اور ضخیم جلدوں میں جو تفسیر حقّانی کے نام سے مشہور ہے۔"[۳]

---

[۱] معارف قرآن۔ تالیف ڈاکٹر حافظ قاری فیوض الرحمٰن۔ مکتبہ مدینہ ۱۷۔ اردو بازار لاہور ص ۲۴۷۔ [۲] نزہۃ الخواطر حیدرآباد دکن، ۱۹۷۰ء جلد ۸، ص ۲۳۲

[۳] ایضاً، ص ۲۳۲

تفسیر فتح المنان جو تفسیر حقانی کے نام سے مشہور ہے مولانا عبدالحق حقانی کی سب سے اہم تصنیف ہے اور اسی کی بناء پر آپ کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ یہ تفسیر آٹھ جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں تین باب ہیں جن کو مختلف مضامین کے اعتبار سے کئی کئی فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مثلاً باب اول میں پہلی فصل "الوہیت و وحدانیت اور نبوت و رسالت" سے متعلق ہے۔ دوسری فصل معجزات کے بیان میں ہے اور تیسری فصل میں ملائکہ کا بیان ہے۔ باب دوم میں آٹھ فصلیں ہیں اور باب سوم میں پانچ فصلیں ہیں۔ اور اس پوری بحث کو جو ان تین ابواب میں کی گئی ہے مقدمہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگرچہ ہر باب دلائل و براہین کی روشنی میں کی گئی ہے اور روایت و درایت دونوں سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن افراط و تفریط سے پرہیز کیا گیا ہے اور دوسروں کو بھی ان سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ مقدمہ ختم کرنے سے پہلے فرماتے ہیں: "الغرض افراط و تفریط دونوں بری ہیں۔ پس جس تفسیر میں روایت اور درایت دونوں عمدہ اور صحیح ہیں وہ تفسیر بھی عمدہ اور صحیح ہے۔ اور جس میں ان دونوں میں قصور ہے اسی قدر اس کی کتاب میں فتور ہے۔" اس کے بعد لکھتے ہیں "تفاسیر صدہا ہیں۔ اگر ان کے نام لکھوں تو ایک دفتر بھی بس نہ کرے۔ چنانچہ کشف الظنون میں بے شمار نام درج ہیں مگر میں یہاں چند تفاسیر کو بیان کرتا ہوں۔"

اس کے بعد تفسیر ابن جریر طبری سے شروع کر کے سر سید احمد کی تفسیر القرآن تک اٹھائیس نہایت اہم اور مشہور تفاسیر کے نام اور مختصر لفظوں میں ان کی خصوصیات بیان کر دی ہیں۔ چونکہ سر سید نے اپنی تفسیر میں عقلیت پسندی کا حد سے زیادہ اظہار کیا تھا اس لیے مقدمہ میں ان کا تعاقب کیا ہے اور ان کی انتہا پسندی کی مخالفت کی ہے۔ ساتھ ہی ان مفسرین پر بھی تنقید کی ہے جو روایت پرستی کے دائرے سے نکلنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے۔ دونوں کو اعتدال کا راستہ اختیار

کرنے کی ترغیب دی ہے۔

دوسری جلد کا آغاز خطبہ سے ہوا ہے جس میں حمد و صلوٰۃ کے بعد تفسیر کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ خطبہ کسی قدر طویل ہے لیکن اس میں مفسّر نے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ عہدِ صحابہ کے بعد سے ہی مسلمانوں نے علومِ قرآنی کو مدوّن کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں جتنا کچھ لکھا حضرت آدمؑ کے زمانہ سے کسی قوم نے بھی اپنی الہامی کتاب پر اس کا دسواں حصّہ بھی نہیں لکھا تھا۔ یہ اسی غیر معمولی انہماک اور توجہ کا نتیجہ ہے کہ قرآن مجید ہر قسم کی تحریف سے بچا ہوا ہے۔

مفسّر نے بیان کیا ہے کہ علومِ قرآنی کی نشر و اشاعت کا ثمرہ یہ ہوا کہ ہر طرف اسلام کا نور پھیل گیا۔ ہندوستان میں بھی صدیوں تک دین اور علومِ دین کا چرچا رہا۔ یہاں تک کہ سات سمندر پار سے فرنگی اس سرزمین میں وارد ہوئے تو وہ اپنے ساتھ الحاد اور گمراہی کے سامان بھی لائے۔ مسلمانوں کے باہمی تفرقہ سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے ان میں بھی بگاڑ پیدا کر دیا اور ایک ایسے گروہ نے ان میں جنم لیا جو برائے نام مسلمان ہے ورنہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے روگردانی اختیار کیے ہے۔ یہ گروہ دوسروں پر بھی اپنا اثر ڈال کر ان کو خراب کر رہا ہے۔ اس لیے مفسّر موصوف نے ضروری سمجھا کہ قرآن کریم کی اردو میں تفصیلی تفسیر لکھیں۔ تاکہ مسلمان قوم دین کے اصولوں کو سمجھے اور اپنے دین کی طرف مائل ہو۔[1]

یہیں سے مفسر نے تفسیر کا آغاز کیا اور مضامینِ قرآن کو ہر اعتبار سے سمجھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ جس انداز سے اور جتنے شرح و بسط سے یہ تفسیر لکھی گئی ہے اس سے پہلے اردو میں اس نمونے کی کوئی تفسیر نہیں ملتی۔ اس میں ترکیب نحوی درجہ

---

[1] تفسیر حقانی جلد دوم ص ۴۰۲

آیات، حل لغات وبیانِ نکات، اظہارِ خلاصہ، مراد وشانِ نزول سبھی چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ نیز مخالفین دینِ اسلام کے الزامات اور دہریوں اور نیچریوں کے اعتراضات کے معقول جوابات دیے گئے ہیں [1]

تفسیر دراصل دوسری جلد سے شروع ہو کر آٹھویں جلد تک چلتی ہے اور اسی پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس آٹھویں اور آخری جلد میں پارہ عم کی تفسیر ہے۔

تفسیر حقانی کی طباعت ۱۳۰۵ھ سے شروع ہو کر ۱۳۱۸ھ میں ختم ہوئی۔ پہلی جلد ۱۳۰۵ھ میں مطبع جامع الاسلام دہلی محلہ بلی ماراں میں چھپی۔ دوسری جلد کی طباعت دہلی میں ۱۳۰۷ھ میں ہوئی پھر تیسری سے لے کر ساتویں جلد تک ۱۳۱۲ھ تک چھپیں۔ اور آٹھویں جلد کی طباعت ۱۳۱۸ ہجری میں ہوئی۔

چونکہ تفسیر حقانی میں سابقہ مفسرین کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اور افراط و تفریط سے بچنے کو ایک مستحسن فعل قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے شدت پسند حضرات اس روش کو برداشت نہیں کر سکے اور انھوں نے اس تفسیر پر کئی اعتراضات کیے۔ لیکن غیر جانبدار ہو کر دیکھا جائے تو ان اعتراضات میں کوئی وزن محسوس نہیں ہوگا۔ اعتراض تو ہر چیز پر کیا جا سکتا ہے لیکن اس اعتراض کی کوئی مضبوط بنیاد ہونی چاہیے۔ اور دلائل و براہین سے اس میں زور پیدا کیا جانا چاہیے۔ اس اعتبار سے جب ہم ان اعتراضات کو جانچتے ہیں تو وہ قطعاً بے بنیاد اور کمزور دکھائی دیتے ہیں۔ بعض معترضین نے جھلاہٹ میں آکر مفسر علام کی ذات پر بھی رکیک حملے کیے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نے "بطلان الاعلان" میں لکھا ہے۔

"مفسر تفسیر حقانی جو عبدالحق اور اس کے بعد ابو محمد عبدالحق بنا ہے دراصل مسمی نتھو ولد گولا ہیرا۔ نو مسلم۔ باشندہ گنھل۔ سائس پیشہ۔

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۴۳۵

قوم رانگھڑ ہے [1]"

ایک جملہ سے اعتراضات کی حقیقت و اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

بہرحال ان باتوں سے صرفِ نظر کر کے دیکھا جائے تو دورِ حاضر کی تفاسیر میں "تفسیر حقانی" سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد اردو زبان میں جتنی تفسیریں لکھی گئیں ان سب کو اسی سے روشنی ملی۔ اور اگرچہ ہر مفسر نے اپنا مخصوص نقطۂ نظر سامنے رکھا ہے لیکن اصول و ضوابط میں سب نے اس کی پیروی کی ہے۔ تفسیر حقانی کی اس اولیت و فضیلت کو اکثر علماء نے تسلیم کیا ہے اور کئی حضرات نے اس کی تعریف کی ہے۔ چند تبصرے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید حمید شطاری تحریر فرماتے ہیں۔

"مولوی عبدالحق نے ترجمہ و تفسیر دونوں میں بڑی دقتِ نظر کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی زبان بہت شستہ و رفتہ ہے اور بہت بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے اسلوب بیان میں جگہ جگہ داخلیت کی جھلک بھی آگئی ہے۔ اس سے ادبیت تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن علمی عبارت میں جس حزم و احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ادبی اسلوب سے ذمہ دارانہ اظہار کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسلوب کی اس فنی کوتاہی کے باوجود مفسر کی قدرتِ بیان قابلِ تعریف ہے۔ اس علمی کارنامے کا تعلق اس زمانہ سے ہے جبکہ سرسید کے ہاتھوں جدید اردو نثر کا آغاز ہوا تھا۔ خود سرسید نے بھی تفسیر قلمبند کی ہے لیکن ان دونوں تفاسیر کے تقابلی مقابلہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے کیا بلحاظ زبان اور کیا بلحاظ انداز و اسلوب سرسید کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ سرسید خود صاحبِ طرزِ نثر نگار تھے اور جدید اردو

نشر کا آغاز ان ہی کی مرہونِ منت ہے۔"[1]

دائرہ معارف اسلامیہ میں ہے

"تفسیر حقانی نے بڑی شہرت پائی۔ تفسیر حقانی ترجمہ آیات، بیان شانِ نزول، ترکیب نحوی، تفسیر، تفصیل و حواشی پر مشتمل ہے۔ مسائلِ تصوف۔ واعظانہ انداز اور مناظرانہ اسلوب کی وجہ سے کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔" (دائرہ معارفِ اسلامیہ ج ۴ ص ۵۳۵)

مولانا سیّد معروف شیرازی لکھتے ہیں۔

"اس کے علاوہ اس تفسیر میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو عام تفسیر میں پائی جاتی ہیں۔ اس کا شمار اردو کی درجہ اوّل کی تفاسیر میں ہوتا ہے۔" (قرآن نمبر ص ۴۰۱)[1]

مولانا شاہ محمد سراج الیقین لکھتے ہیں۔

"جناب مولانا عبدالحق دہلوی۔ آپ اکابر و مشاہیر علماء میں ہیں. غیر مذاہب سے مناظرہ میں آپ کو بہت ہی کمال حاصل ہے. تفسیر فتح المنّان المشہور بہ تفسیر حقانی آپ ہی کی تصنیف ہے۔ نہایت جامع اور عمدہ تفسیر ہے. بڑی صراحت اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ لکھا ہے۔ اور خوب ہی تحقیق و تدقیق کی ہے۔ اور سیّد احمد خاں نے قرآن مجید کے معانی اور مطالب میں جو تحریف اور غلطیاں کی ہیں ان کا خوب ہی محققانہ جواب دیا ہے۔ اس تفسیر کے مطالعہ سے حظ تام حاصل ہوتا۔ خداوند تعالیٰ مولانا ممدوح کو اس کی جزائے خیر دارین میں مرحمت فرمائے۔"

---

[1]۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر صفحات ۴۶۱ و ۴۶۲

(مولانا شاہ محمد سراج الیقین۔ "شمس العارفین"، لاہور ص ۸۷)۔[1]

"تفسیر حقانی" کے انداز اور اسلوب بیان کو جاننے کے لیے سورہ فاتحہ کی پہلی تین آیتوں کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے جو کُل جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے جو نہایت رحم کرنے والا ہے۔ جزاء کے دن کا مالک ہے۔

ترکیب

اَلْحَمْدُ مبتدا اللہ ثابت کے متعلق ہو کر اس کی خبر ہوئی رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اس کی صفت اول (گو یہ نکرہ ہے مگر معنی کے لحاظ سے معرفہ ہے کیونکہ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سوائے خدا کے اور کسی پر صادق نہیں آتا)۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ صفت و موصوف اس کی صفت دوم مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ مضاف و مضاف مل کر اس کی صفت سوم۔ یہ موصوف اپنی تینوں صفات سے مل کر ثابت کے متعلق ہو کر مبتداء کی خبر ہوئی اور خبر و مبتدا مل کر جملہ اسمیہ ہوا۔ گو مقام انشاء حمد جملہ فعلیہ چاہتا ہے۔ مگر چونکہ خبر حمد ہی انشاء حمد ہے۔ دوام و ثبات کے لیے جملہ اسمیہ لایا گیا۔

تفسیر

ان تینوں آیتوں میں خدائے تعالیٰ بہت سی حکمتیں رعایت رکھ کر اس تقرب کو بتلاتا ہے کہ جس کی طرف بِسْمِ اللّٰهِ میں اشارہ تھا بِسْمِ اللّٰهِ میں لفظ اللہ سے ہیبت اور رحمٰن و رحیم سے رغبت دلا کر اپنی ذات پاک کی طرف

---

[1] تعارف قرآن صفحات ۲۲۵، ۲۲۶

متوجہ ہونا مجملاً بتایا تھا۔ لیکن اس اصول اور تقرب کا کوئی طریقہ صراحتاً مذکور نہ ہوا تھا کہ وہ کیونکر اس کی طرف متوجہ ہو اور کون سی روحانی سڑک پر چل کر شہرِ مقصود تک پہنچے۔ آیا کسی درخت پر الٹا لٹکے یا دنیا کے تمام طیبات چھوڑ کر لنگر لنگوٹا باندھ کر کسی مندر یا دریا یا تالاب کے کنارے بیٹھا کرے یا کسی گرجا میں باجا بجا کر کوئی راگ یا بھجن گایا کرے۔ یا پیالہ لے کر گھر گھر بھیک مانگتا پھرے یا کوئی اور جتن کرے جس سے اس محبوبِ عالم، معبودِ حقیقی کا وصال اور جمال باکمال نصیب ہو تاکہ کمال حقیقی اور سعادت عظمیٰ ملے۔ سو اس وادیٔ پرخار اور بحرِ ذخار میں سیکڑوں بھٹک کر رہ گئے۔ اور بڑے بڑے حکیموں اور فلسفیوں کی کشتیاں غرق ہو گئیں۔

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار　　　　کہ پیدا نہ شد تختۂ بر کنار

اس لیے رحمٰن و رحیم نے اپنی رحمت سے الہام کے ذریعہ سے اس مشکل کو حل کر دیا اور اپنی طرف آنے کا رستہ سہل کر دیا کہ اے طالبانِ راہِ نجات وا جویندگان آبِ حیات تم اپنی زبان سے یوں کہو، ان الفاظ کے رنگ معانی سے اپنی روح کو رنگین بنا دو۔ کیونکہ جب تم ان الفاظ کے معنی کو خوب دل میں جما دو۔ اور خیال میں لاؤ گے تو تمہاری روح کی تمام کثافت اور ظلمت اور بہیمیت دور ہو جائے گی۔ پس جب آئینہ کا زنگ دور ہوا تو اسی وقت آفتاب جہاں تاب کا عکس پڑ کر پُر نور ہوا۔

تفصیل

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان دراصل روح ہے کہ جس کو نفس ناطقہ بھی کہتے ہیں۔ اور جو اس جسم سے پیشتر تھی اور اس کی مفارقت کے بعد بھی رہے گی۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جس میں یہ تین وصف نہ پائے جائیں وہ ہر قسم کی حمد کا مستحق نہیں تو عبادت اور استعانت کا تو کیا استحقاق ہے۔ پس اسی لیے اس کلام کے بعد وہ

کلام ذکر کیا جو اس کا نتیجہ ہے ـــــ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔[۱]

تفسیر بیان القرآن

مولانا محمد اشرف علی تھانوی

اس تفسیر کا شمار اردو میں لکھی جانے والی مقبول ترین تفاسیر میں ہوتا ہے۔ اس کے لکھنے والے برِصغیر کے مشہور عالمِ دین شیخ طریقت اور صاحبِ تصانیف کثیرہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں۔ ان کا تعلق قصبہ تھانہ بھون کے ذی وجاہت فاروقی خاندان سے تھا۔ والد محترم کا اسم گرامی عبدالحق تھا۔ مولانا اشرف علی صاحب کی ولادت ۱۲ ربیع الاول ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۹ مارچ ۱۸۶۳ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مولانا فتح محمد تھانوی سے حاصل کی۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر تکمیل علومِ دین مولانا محمد یعقوب نانوتوی سے کی۔ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں فارغ التحصیل ہو کر کانپور میں بطور معلم اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اسی سال پہلا حج کیا۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے غائبانہ طور پر پہلے بیعت کر چکے تھے۔ مکہ معظمہ پہنچ کر تجدیدِ بیعت کی اور باقاعدہ ان کے مرید ہو گئے۔ ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۹۰ء میں دوسرا حج کیا اور کئی مہینے مکہ معظمہ میں قیام کر کے مرشد سے فیض روحانی حاصل کیا اور خلافت سے سرفراز ہوئے ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں مرشد کے ایما پر کانپور کو خیرباد کہا اور مستقلاً تھانہ بھون میں مقیم ہو گئے۔ وہاں رہ کر عرصہ دراز تک علمی و روحانی فیض پہنچاتے رہے۔ آخر کار ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹ جولائی ۱۹۴۳ء کو واصل رحمتِ حق ہوئے۔

مولانا اشرف علی تھانوی سے جتنا علمی اور روحانی فیض برِصغیر کے مسلمانوں کو پہنچا اتنا بہت کم علمائے دین سے پہنچا ہوگا۔ ملک کے طول و عرض میں آپ کے

---

[۱] تفسیر حقانی جلد دوم صفحات ۱۲ ــ ۲۲

مرید اور عقیدت مند پھیلے ہوئے تھے۔ آپ میں تورع اس درجہ تھا کہ باپ کی آمدنی کو مشتبہ سمجھتے ہوئے ان کے ترکہ میں سے آپ نے ایک حبہ تک نہیں لیا۔ سب کچھ چھوٹے بھائی کو دے کر اپنے لیے الگ ایک چھوٹا سا مکان بنوا لیا اور سادی زندگی اس میں گزار دی۔ جب تک آپ حیات رہے قصبہ پر ایک گونا روحانی فضا چھائی رہی۔ آپ کے اثر سے بدعتوں کا بڑی حد تک خاتمہ ہو گیا۔ آپ نے وعظ و تذکیر کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بڑے پیمانہ پر کیا۔ آپ کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ آپ نے اپنی تصانیف کے ذریعہ دین کی تعلیم کو ہر طبقہ تک پہنچایا۔ آپ سے پہلے خواتین کے لیے دینی لٹریچر تقریباً نابید تھا۔ آپ نے ان کے لیے بھی عام فہم اردو زبان میں کتابیں لکھ کر ان کو دینی تعلیم سے روشناس کیا۔ آپ کا سب سے اہم کارنامہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ اور تفسیر ہے۔ عوام کے لیے صحیح ترجمہ اور آسان و مختصر تفسیر کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے آپ نے ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء میں اس کام کا آغاز کیا۔ خود تفسیر بیان القرآن کے خطبہ میں فرماتے ہیں:

"یہ ابجد خوانِ مکتبِ قرآنی مظہرِ مدعا ہے کہ بہت روز سے خود بھی اور احباب کے اصرار سے بھی گاہ گاہ خیال ہوا کرتا تھا کہ کوئی مختصر تفسیر قرآن مجید کی لکھی جاوے جو ضروریات کو حاوی اور زوائد سے خالی ہو۔ مگر تفاسیر و تراجم کی کثرت دیکھ کر اس کو امر زائد سمجھا جاتا تھا۔ اسی اثناء میں نئی حالت یہ پیش آئی کہ بعض لوگوں نے محض تجارت کی غرض سے نہایت بے احتیاطی سے قرآن کے ترجمے شائع کرنے شروع کیے۔ جن میں بکثرت مضامین خلافِ قواعدِ شرعیہ بھر دیے جن سے عام مسلمانوں کو بہت مضرت پہنچی۔ ہر چند کہ چھوٹے چھوٹے رسالوں سے ان کے مفاسد پر اطلاع دے کر ان

مضرتوں کی روک تھام کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر چونکہ کثرت سے ترجمہ بینی کا مذاق پھیل گیا ہے۔ وہ رسالے اس غرض کی تکمیل کے لیے کافی ثابت نہ ہوئے۔ تاوقتیکہ ابنائے زمانہ کو کوئی ترجمہ بھی نہ بتلایا جاوے جس میں مشغول ہو کر ان تراجم متبدعہ سے بے التفات ہو جاویں۔ ہر چند کہ تراجم و تفاسیر محققین سابقین کے بالخصوص خاندانِ عزیزیہ کے ہر طرح کافی و وافی ہیں مگر ناظرین کی حالت و طبیعت کو کیا کیا جاوے کہ بعض تفاسیر میں عربی یا فارسی نہ جاننے کی مجبوری۔ بعض تراجم میں اختصار یا زبان بدل جانے کا عذر مانع دلچسپی ہوا۔ تامل و مشورے سے بھی ضرورت ثابت ہوئی کہ ان لوگوں کو کوئی نیا ترجمہ دیا جائے جس کی زبان و طرزِ بیان و تقریر مضامین میں ان کے مذاق و ضرورت کا حتی الامکان پورا لحاظ رہے۔ اور ساتھ ہی اس کے کوئی ضروری مضمون خواہ جزو قرآن ہو یا اس کے متعلق ہو رہ نہ جائے۔ چند روز تک یہ رائے صورت تجویز و پیرایہ تذکرہ میں رہی۔ آخر جب احباب کا تقاضا زیادہ ہوا اور خود بھی اس کی ضرورت روزانہ مشاہدہ و معائنہ میں آنے لگی آخر بنام خدا محض توکلاً علی اللہ پھر اس اطمینان پر کہ اگر میں کسی قابل نہ ہوں تو کیا ہوا بزرگانِ عصر اصلاح فرما کر اس کو دیکھنے کے قابل کر دیں گے۔ آخر ربیع الاول ۱۳۲۰ھ میں اس کو شروع کرتا ہوں۔"[1]

---

[1] مکمل بیان القرآن (۱۳۵۳ھ) جلد اوّل شائع کردہ میر محمد کتب خانہ آرام باغ۔ کراچی ص "ب"

اس تمہید کے بعد مولانا نے ان امور کی وضاحت کی جو ترجمہ اور تفسیر میں ملحوظ رکھے گئے۔ ترجمہ کو آپ نے آسان اور قابلِ فہم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ خاص محاورات کے استعمال سے اجتناب برتا گیا ہے۔ اور کتابی زبان کو کام میں لایا گیا ہے۔ نفس ترجمہ کے علاوہ کوئی اور بات بتانی ہوئی تو اس کو "ف" بنا کر بڑھا دیا گیا ہے۔ مختلف مفسرین کے اقوال میں اس قول کو لیا گیا ہے جس کو ترجیح معلوم ہوئی۔ مطلب قرآنی کی تقریر بر حسب ضرورت کر دی گئی ہے اختلافات کی صورت میں مذہب حنفی کو لیا گیا ہے۔ ترجمہ میں عوام کا خیال رکھا گیا تھا لیکن خواص کے فائدہ کے لیے عربی میں حاشیہ دے دیا گیا ہے۔

جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے اس میں بیس امور کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ جن کو خطبہ کے آخر میں "ذکر بعض امور مرعیہ ملتزمہ در تحریر تفسیر ہذا" کے عنوان کے تحت مختصراً بیان کر دیا گیا ہے۔

تفسیر بیان القرآن ۱۲ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ یہ تفسیر سب سے پہلے ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء میں دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اضافے اور نظر ثانی کے بعد اس کا ایک ایڈیشن ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۵ء میں تھانہ بھون سے اور پھر ۱۳۵۹ھ میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ تاج کمپنی کی اس طرف خاص توجہ رہی ہے۔ چنانچہ اس کمپنی سے اس ضخیم تفسیر کا اختصار بھی چھاپ دیا گیا ہے۔[1]

تفسیر بیان القرآن کو عموماً پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر سید حمید شطاری اس سے خوش نہیں ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب عقیدہ کا اختلاف ہو۔ ان کے اس فقرہ سے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر صفحات ۲۷۴ تا ۲۷۵

"ان کی اکثر و بیشتر تصانیف سے توہب کا رنگ نمایاں ہے"۔

پھر اپنے اس فقرہ کی وضاحت کے لیے بہشتی زیور کا ایک طویل اقتباس دیا ہے جس کے اوّل اور آخر کے جملوں کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"تبرکات کی زیارت کے وقت اکٹھا ہوں ...... یہ سب گناہ کی باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے بچاویں"۔[1]

عقیدہ اور نظریات میں اختلاف ہونا بُری بات نہیں لیکن اس کی بنیاد پر مولانا کی زبان اور ان کے طرز بیان کو اعتراضات اور مطاعن کا ہدف بنانا، ناقابلِ فہم ہے۔

بہرحال ڈاکٹر شطاری کے اظہارِ ناراضگی سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ذیل میں ان چند علماء کی آرا پیش کی جاتی ہیں جنھوں نے اس تفسیر کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ "حضرت کا ترجمہ قرآن پاک تاثیر، سہولت بیان اور موضوع مطالب میں اپنا آپ مظہر ہے"۔ (یادِ رفتگاں)

مولانا محمد تقی عثمانی رقم طراز ہیں:

"اردو زبان میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر "بیان القرآن" اپنے مضامین کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ اور اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب انسان تفسیر کی ضخیم کتابیں کھنگالنے کے بعد اس کی طرف رجوع کرتے ہیں"۔

(مولانا محمد تقی عثمانی "علوم القرآن"، کراچی ص ۵۰)

مفسر قرآن مولانا احمد سعید دہلوی لکھتے ہیں:

"یہ ترجمہ اور تفسیر بڑی تحقیق کے ساتھ لکھی گئی اور یقیناً اردو زبان

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر صفحات ۲۷۴ تا ۲۷۵

یں اس سے معتبر اور صحیح کوئی تفسیر ہندوستان میں نہیں ہے۔"

(مولانا احمد سعید، ایمان کی باتیں ص ۲۳۴)

قاضی محمد زاہد الحسینی لکھتے ہیں:

"جامع اور مکمل تفسیر بیان القرآن اس زمانہ میں تفسیر کے اساتذہ کے لیے بھی مشعلِ راہ ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی دینی، علمی اور روحانی بصیرت کا شاہکار ہے۔"

(معارف القرآن لاہور، ۱۳۹۸ھ ص ۳۷)

مولانا محمد مالک کاندھلوی تحریر فرماتے ہیں:

"حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی کی تفسیر بیان القرآن بھی ایک بلند پایہ اور محققانہ تفسیر ہے جو متقدمین کے علوم کا لباب اور جوہر ہے۔ عجیب موثر انداز اور پاکیزہ اسلوب ہے۔ مطالب قرآن کی توضیح و تفصیل کی گئی ہے۔"

(مولانا محمد مالک، منازل العرفان، لاہور ص ۳۰۴)

مفسّر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی رقمطراز ہیں:

"اب چند سال سے مسلسل مشغلہ اس بے عالم و نااہل کی خدمت قرآنی کا ہے۔ اپنا تجربہ یہ ہے کہ دوسرے حضرات کے ہاں اکثر اوراق پر اوراق الٹ جانے سے بھی وہ گہر سے نکتے نہیں ملتے جو مفسّر تھانوی کے چند سطروں کے اندر میسّر آجاتی ہیں۔"

(مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں کراچی ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء ص ۲۸)

مولانا شاہ سراج الیقین لکھتے ہیں:

"ترجمہ دیوان حافظ اور تفسیر بیان القرآن آپ کی بے عدیل تصانیف ہیں۔"

(شمس العارفین لاہور ص ۸۲)

جناب محمد عالم کا کہنا ہے:

"تفسیر بیان القرآن ۱۲ جلد مع ترجمہ دہلی مجتبائی پریس ۱۹۲۵ء تاج کمپنی لاہور نے اس ضخیم تفسیر کا اختصار بھی چھاپ دیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی تفسیر ہذا کو اردو تفسیروں کا سردار گردانتے ہیں۔ مولانا انور شاہ مرحوم نے ایک مرتبہ فرمایا: "میں سمجھتا تھا کہ یہ تفسیر عوام کے لیے لکھی گئی ہے لیکن اس سے علما بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔"

(محمد عالم: قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر: قرآن نمبر ص ۸۶۳)[1]

نمونہ کے لیے سورہ فاتحہ کا ترجمہ اور تفسیر ذیل میں درج ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

ترجمہ: شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ جو مالک ہیں روزِ جزا کے۔ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں۔ بتلا دیجیے ہم کو رستہ سیدھا۔ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔ نہ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا۔ نہ ان لوگوں کا جو رستہ سے گم ہو گئے۔

۱۔ بحوالہ تعارف قرآن صفحات ۲۶۲-۲۶۶

نمونہ: سورہ فاتحہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۔ سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے۔ ف مخلوقات کی الگ الگ جنس ایک ایک عالم کہلاتا ہے۔ مثلاً عالم ملائکہ، عالم انسان، عالم جن۔ اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۔ جو مالک ہیں روزِ جزا کے۔ ف روزِ جزا سے مراد قیامت کا دن ہے۔ کہ اس دن میں سب اپنے کیے ہوئے کا بدلہ پاویں گے۔ اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ ۔ آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کرتے ہیں۔ ف یہ بندے کی سے جنابِ باری میں خطاب ہے۔ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۔ بتلا دیجیے ہم کو رستہ سیدھا۔ ف مراد دین کا راستہ ہے صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ ۔ رستہ ان لوگوں کا جس پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔ ف مراد دین کا انعام ہے۔ ان انعام والوں کا پتہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں دوسری جگہ بتلا دیا ہے۔ کہ وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ہیں۔ وہ آیت یہ ہے کہ وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ ۔ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ ۔ نہ رستہ ان کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا۔ اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے۔ ف راہِ ہدایت کے چھوڑنے کی دو وجہ ہوا کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی پوری تحقیقات نہ کرے۔ ضالین سے مراد ایسے لوگ ہیں۔

دوسری وجہ یہ کہ باوجود تحقیقات کے اس پر عمل نہ کرے مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ سے مراد ایسے لوگ ہیں۔ کیونکہ اچھی طرح جان بوجھ کر خلاف کرنے میں زیادہ ناراضی ہوا کرتی ہے۔[1]

تفسیرِ قادری

المعروف بہ کشف القلوب

مولانا محمد عمر حسینی قادری

تفسیرِ قادری حیدرآباد دکن کے ایک عالم اور بزرگ مولانا سید شاہ محمد عمر حسینی قادری کے مواعظ کا مجموعہ ہے جو ۱۳۱۹ھ سے ہر ماہ رسالہ کی شکل میں شائع ہوتے رہے۔ مفسرِ علام مولانا محمد عمر حسینی قادری ایک ذی وجاہت سید خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ سید محی الدین حسینی شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ میں بغداد سے ہندوستان تشریف لائے اور برہان پور میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کے پوتے سید حیدر علی حسینی برہانپور سے حیدرآباد دکن منتقل ہو گئے۔ وہ مفسرِ علام کے پردادا تھے۔ وہیں ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء میں مولانا محمد عمر حسینی قادری کی ولادت ہوئی۔ تعلیم و تربیت اپنے بڑے بھائی محمد صدیق حسینی محبوب اللہ سے حاصل کی۔ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل ان سے کی۔ بعض علوم و فنون کے لیے کچھ اور اساتذہ کے سامنے بھی زانوئے شاگردی تہ کیا۔ قراءۃ سبعہ و عشر اور حفظِ قرآن کے علاوہ شعر و سخن میں بھی کمال حاصل کیا۔ مختلف سلسلوں میں خرقۂ خلافت بڑے بھائی خواجۂ دکن محمد صدیق حسینی سے ملا۔ غرض تکمیلِ علوم و سلوک کے بعد آپ نے درس و تدریس

---

[1] مکمل بیان القرآن صفحات ۱ تا ۳

اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ اور کافی عرصہ تک خلقِ خدا کو فیض پہنچا کر ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں رہگزرائے عالم بقا ہو گئے۔ قادری چمن میں آسودہ ہیں۔

مولانا محمد عمر حسینی قادری تصنیف و تالیف کے کام سے شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ نظم و نثر میں آپ کی کئی کتابیں ہیں جن میں سے ایک کتاب "فرائض القادریہ" ہے جو علم المیراث پر اور نظم میں ہے۔ "تاریخ العروس الحاوی تہذیب النفوس" کا مسجّع و مقفّیٰ اردو میں ترجمہ "رہبر طریقت" کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ ترجمہ بہجۃ الاسرار رسالہ تحفہ فاروقیہ ہے جو مطبع بریلی سے شائع ہوا ہے۔ اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے رسالے اور درسی کتابیں تحریر فرمائیں۔ لیکن آپ کا اہم کارنامہ تفسیر قادری ہے۔

جیسا کہ صدر میں بتایا جا چکا ہے، تفسیرِ قادری مولانا محمد علی عمر حسینی قادری کے مواعظ کا مجموعہ ہے: آپ کا قاعدہ تھا کہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد مکہ مسجد (حیدرآباد دکن) میں قرآن مجید کے ایک رکوع کی تفسیر نہایت موثر اور دلنشین انداز میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ چودھویں سیپارے تک تو یہ سلسلہ وعظ کی شکل میں چلتا رہا۔ اس کے بعد بعض حضرات کو خیال ہوا کہ ان مواعظ کو تحریری شکل میں محفوظ کر لیا جائے۔ لیکن چونکہ پہلے چودہ پاروں کی تفسیر کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا اس لیے اس کو تحریری شکل دینا ممکن نہ ہوا۔ اس لیے اس سلسلہ کو پندرھویں پارہ سے شروع کیا گیا۔ تفسیر کا یہ سلسلہ اٹھائیسویں پارے تک پہنچا تھا اور اشاعت سورہ فتح کے کچھ حصہ کی ہونے پائی تھی کہ حضرت مولانا کا انتقال ہو گیا۔ تاہم آپ کے صاحبزادے سید محمد بادشاہ حسینی قادری کے زیرِ ادارت باقی حصہ بھی شائع ہو گیا۔ اس طرح تفسیر کا کام تکمیل کو پہنچ گیا۔ چونکہ شروعات ۱۳۱۹ھ میں ہوئی تھی اس لیے تفسیر کا تاریخی نام "تفسیر کشف القلوب" ہو گیا۔

تفسیرِ قادری کے مقدمہ کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ .... میرے اللہ تیرے کلام پاک کے طفیل سے مجھے سیدھی راہ قائم رکھ اور اس کے سمجھنے اور سمجھانے کی توفیق عنایت فرما۔ اما بعد۔ یہ فقیر سراپا تقصیر ابو الوفا عمر تخلص خلیق کان اللہ لہ عرض کرتا ہے کہ ایک مدت سے قرآن مجید کا عاشق ہے۔ اسی کی تلاوت اسی کا درس اسی کا بیان ہے۔

فَیَا بَکْ حُزْنِیْ لَا یُفَارِقُ مُہْجَتِیْ وَفِیْہَا شِفَا لِلَّذِیْ اَنَا کَاتِمُ

چند سطور کے بعد سبب تفسیر کے تعلق سے لکھا ہے کہ:

"اب تحریر تفسیر نصف آخر سے شروع ہوئی اس لیے یہ عاصی کئی سال سے مکہ مسجد حیدرآباد دکن میں بعد نماز جمعہ قرآن مجید ہی کا بیان ابتدا سے کر رہا تھا۔ اس مشورہ کے بعد پارہ سبحان الذی شروع ہونے والا تھا یہی رائے قائم ہوئی کہ اس جزء سے قصہ معراج بھی تقریر کے ساتھ تحریر کی بھی ابتدا کی جائے اور اللہ سے امید رکھی جائے کہ اسے قبول فرما کے ہمارے لیے باقیات صالحات کر دے۔

الحمد للہ کہ یہ کام شروع ہوا"

اسی سلسلہ میں کسی قدر آگے چل کر لکھتے ہیں:

"جس کسی بد مذہب کی نئی تصنیف دیکھنے میں آئی اس کا تار تار الگ کر دکھایا اور اصلی باعث تفسیر لکھنے کا یہی ہوا۔ کیونکہ جن مذاہب کا تفاسیر قدیمہ میں مذکور ہے بعض وہ مذہب اس وقت نہیں بلکہ اس کی جائے نئے نئے فرقے پیدا ہو گئے ہیں اس لیے تفسیر میں بھی ان کے رد کی ضرورت ہوئی"

اس کے بعد ان تفاسیر کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اس تفسیر میں مدد لی گئی ہے۔ آخر میں ایک مفسّر کے لیے چند ضروری اور مفید ہدایتیں بھی درج کی گئی ہیں اور تفسیر قادری کے ترجمے اور تفسیر کے تعلق سے بھی چند باتوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ مثلاً زبان جو استعمال کی گئی ہے اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ:

"اس میں ترجمے کی طرف پہلے توجہ کی گئی ہے اور جہاں تک ہو سکا محاورہ اور الفاظ دونوں کا خیال رکھا گیا ہے لیکن عربی زبان اس قدر وسیع ہے کہ ترجمہ کے لیے اردو زبان میں الفاظ نہیں ملتے۔ پھر کلام الٰہی جو معدن فصاحت و بلاغت ہے اس کا ترجمہ اسی طرح ہے۔ گویا حسین آدمی کی تصویر، کہ صورت تو ہے لیکن جان نہیں۔ آدمی کے لیے جس طرح جان ہے۔ کلام کے لیے فصاحت و بلاغت ہے۔ پھر بلاغت بھی وہ کہ تمام فصحائے عرب سے اسی کلام عربی میں ادا نہ ہو سکی تو ترجمہ میں وہ بلاغت کس طرح باقی رہے گی۔ . . . . . . غرض لفظ و معنی دونوں کا خیال رکھ کر ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں ہمارا محاورہ لفظوں کے مطابق نہ ہوا تو اس وقت میں بہت دشواری پیش آئی۔ آخر تحرّی سے جس جانب ترجیح معلوم ہوئی اسی کو اختیار کیا اور تفاسیر معتبرہ سے بہت کچھ چھان بین کی گئی۔ پھر بھی جو غلطی صادر ہو گئی ہو تو ناظرین تفسیر سے امید ہے کہ اس سے آگاہ فرمائیں۔ تا مستقل طور پر ترجمہ چھپنے کے وقت اس کی رعایت رکھی جائے۔[1]

ان وضاحتوں اور عذر و معذرت کے بعد ترجمہ و تفسیر کا کام شروع کیا گیا

[1] مقدمہ "تفسیر قادری" بحوالہ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک۔ (ڈاکٹر سید حمید شطاری) صفحات ۵۰۶ - ۵۱۱

پہلے متن کے نیچے ترجمہ ہے اور اس کے بعد تفسیر۔ چونکہ سورہ بنی اسرائیل سے اس تفسیر کا آغاز ہوا ہے اس لیے نمونہ کے طور پر اسی کا ابتدائی حصّہ نقل کیا جاتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بڑا رحم والا ہے سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ ۔ (۱۵-۱)

ترجمہ: وہ پاک ہے جو اپنے بندہ (سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مصاحب ہو کر تھوڑی سی رات میں مسجد محترم (مکّہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا کہ ہم نے گرداگرد اس کے برکت دی۔

تفاسیر: اس قصّے کو لفظ سُبۡحٰنَ سے شروع کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ کوئی وہمی و خیالی آدمی اہل تشبیہ و تجسیم سے یہ نہ خیال کرے کہ خداوند عالم کسی جہت اور حد و مکان میں محدود ہے بلکہ اوس کے اعتبار کرتے سب مکانوں کی نسبت ایک ہی ہے اور وہ سب جا موجود ہے ہاں جو قرآن میں اپنی خصوصیت بعض مکان سے بتلایا ہے۔ ہم اوس کی مراد پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ تاویل سے گھبراتے ہیں۔ گو متاخرین نے اس کو اختیار کیا ہے لیکن سلف و متقدمین کا وہی مذہب رہا۔ اور لفظ سُبۡحٰنَ میں یہ بھی ایک نکتہ ہے کہ کوئی اوس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ جھٹلائے۔ اس قصۂ معراج میں جو جسم عنصری سے ہوا ہے تاویلیں نہ کرے۔ خدا سے شرمائے وہ لے گیا ہے۔ یہ خود تو نہیں گئے۔ تا منکروں کو چوں و چرا کا موقع باقی نہ رہے۔ سبحان اللہ خدائے قادر کے فعل پر بھی عیب لگاتے ہو۔ اپنا سا اوس کو بھی مجبور بتاتے ہو۔ اسری (اور سرے کے معنی ہیں۔ رات کو

گیا لیکن لیلاً کو یہاں اوس کا ظرف کیا۔ تا وہم مجاز دور ہو جاوے اور جو سیر نہار پر کبھی کبھی اطلاق ہوتا ہے اوس کا خیال نہ آئے۔

(لِعَبْدِہٖ) بای مصاحب عَبْدِہٖ میں بڑھایا۔ اس میں یہ نکتہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ ہو کے اس کو سیر دکھلایا۔ غیروں کی سیر کا جب بیان آیا هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ فرمایا یعنی وہی ہے جو تم کو بحر و بر میں چلاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ سے کیسی خصوصیت اور کیسا علاقہ ہے۔ اس واسطے دعا میں بھی اکثر آپ یوں فرماتے ہیں۔ یہ دعا زبان پر لاتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ یعنی یا اللہ تو ہی سفر میں مصاحب ہے۔ پھر یہ معراج تو خاص سفر ہے اس میں مصاحبت کی خصوصیت بھی سب سے بڑھ کر ہے۔

(اسری لعبدہ) میں ایک اور نکتہ یہ ہے کہ آپ کی بندگی کی نسبت اور سیر کی اضافت بھی اپنی ہی طرف کی......"

حالانکہ مولانا سید محمد عمر حسینی قادری نے تفسیر کے مقدمے میں ترجمے کی زبان کے تعلق سے خصوصیت کے ساتھ یہ وضاحت کی ہے کہ "ترجمہ لفظی بھی ہے اور بامحاورہ بھی۔ یعنی جہاں لفظی ترجمہ کوئی نحوی الجھاؤ نہ پیدا کرتا ہو اور عربی الفاظ کے مقابلے موزوں اردو لفظ مل جاتا ہو تو لفظی ترجمہ ہی کیا گیا ہے۔ اور جہاں بامحاورہ ترجمہ مفہوم کی ادائیگی میں زیادہ مدد دیتا ہو یا ادائی میں زیادہ دلچسپی پیدا کرتا ہو تو محاورہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔" لیکن جہاں تک کہ تفسیر کا تعلق ہے وہ چونکہ وعظ کی شکل میں بیان کی گئی ہے اس لیے اس میں نہ چستی و شگفتگی پیدا ہو سکی اور نہ علمی شان اور لطافت و متانت کا اظہار ہو سکا۔ بلکہ بعض جگہ تو شتر گربگی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ یعنی ایک جملہ کا انداز

تو عامیانہ سا ہو گیا ہے اور دوسرے کا ایسا عالمانہ کہ ایک معمولی استعداد کے قاری کی فہم سے ماورا۔ جیسے "اس قصۂ معراج میں جو جسم عنصری سے ہوا ہے تاویلیں نہ کرے۔ خدا سے شرمائے وہ لے گیا ہے یہ خود نہیں گئے۔"

احسن التفاسیر

مولوی سید احمد حسین

یہ تفسیر ریاست حیدر آباد دکن کے سابق تعلقہ دار مولوی سید احمد حسین نے لکھی ہے۔ مفسر کے زیادہ کوائف معلوم نہیں۔ تاہم قرائین سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق شمالی ہندوستان سے تھا۔ تفسیر کی طباعت کے سنین ۱۳۲۵ھ سے ۱۳۲۷ھ تک ہیں۔ اس لیے قیاس ہے کہ ان ہی سنوں کے درمیان یہ تفسیر لکھی گئی ہوگی۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ یہ کام نہایت عجلت میں کیا گیا ہے اسی لیے نہ لمبی چوڑی تمہید قائم کی گئی اور نہ نکات بیان کیے گئے۔ راست طریقہ پر سیدھے سادے انداز میں مفہوم بیان کر دیا گیا ہے۔ تفسیر میں بھی نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے اور عبارت آرائی کی بھی کہیں کوشش نہیں کی گئی۔ گویا عام قاری کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے خواص کو دوسرے چشموں سے اپنی تشنگی دور کرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

تفسیر کا انداز بالکل فطری ہے۔ یعنی پہلے آیت پھر اس کا ترجمہ اور پھر مختصر تفسیر۔ تفسیر کا آغاز حسب ذیل طریقہ پر کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"بعد حمد و صلوٰۃ کے شائقین تلاوت قرآن کو معلوم ہو کہ تفسیروں کی روایتوں کے موافق اکثر علماء کے نزدیک قرآن شریف کی قرأت سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کا

پڑھنا سنّت ہے[1] جس کے معنی شیطان مردود کی ہر طرح کی برائی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنے کی التجا کے ہیں۔ اس بات پر تو سب علماء کا اتّفاق ہے کہ سورہ نمل کی آیتوں میں حضرت سلیمان علیہ السّلام کے قصّے میں جو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ہے وہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے[2] لیکن اَلۡحَمۡدُ کی یا کسی اور سورہ کی آیتوں میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ایک آیت ہے یا نہیں اس میں سلف کا اختلاف ہے اور حدیثیں دونوں جانب ہیں۔ مگر نماز میں تکبیر اور سورہ فاتحہ کے مابین پکار کر بسم اللہ نہ پڑھنے کی حدیثیں زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ سوا سورہ فاتحہ کے اور سورتوں کی بحث اس کے باب میں حضرت عبداللہ بن عبّاس سے ابو داؤد میں بسند صحیح جو روایت ہے اس کا ماحصل اسی قدر ہے کہ قرآن شریف کے نازل ہونے کے وقت ایک سورہ کا ختم اور دوسری سورہ کا شروع معلوم ہو جانے کی غرض سے بِسۡمِ اللّٰہِ نازل ہوا کرتی تھی۔"

اس کے بعد سورہ فاتحہ کے نام اور شانِ نزول پر گفتگو کی گئی ہے۔ اور صحیح مسلم اور سنن نسائی کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت بیان کی گئی ہے۔ بعدہٗ سورہ فاتحہ کی الگ الگ آیتیں لکھ کر ان کے نیچے ترجمہ دیا گیا ہے اور پھر تفسیر بیان کی گئی ہے۔

---

[1] قرأت سے پہلے اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ پڑھنا واجبات میں سے ہے۔

[2] آیت یہ ہے۔ "اِنَّہٗ مِنۡ سُلَیۡمٰنَ وَ اِنَّہٗ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (سورہ النمل ۲۷: آیت ۳۰)

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ

سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہان کا۔

الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بہت ہی مہربان نہایت رحم والا

مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ — مالک انصاف کے دن کا

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ — تجھی کو ہم بندگی کریں

وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ — اور تجھی سے مدد چاہیں

اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ — چلا ہم کو راہ سیدھی

صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ — راہ اس کی جن پر تو نے فضل کیا

غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ۝

نہ جن پر غصّہ ہوا اور نہ بہکنے والے۔

تفسیر: "اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ حمد کے معنی زبان سے تعریف کرنے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ نازل فرما کر اپنے بندوں کو سکھایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف اس طرح کیا کریں۔ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ رب اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے جس کے معنی مربّی کے ہیں۔ یہ لفظ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی مخلوق کی شان میں بغیر نیت اور اضافت کے نہیں استعمال کیا جا سکتا۔ ہاں مخلوق کی شان میں اضافت کے ساتھ ساتھ استعمال ہو سکتا ہے۔ مثلاً ربّ الدّار کہہ سکتے ہیں جس کے معنی گھر کے مالک کے ہوں گے۔ عالمین، عالم کی جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا سب مخلوقات کو عالم کہتے ہیں۔ آسمان، زمین کی آبادی، جنگل دریا میں اللہ تعالیٰ کی طرح طرح کی مخلوقات ہیں جن سب کا مربّی و معبود اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لیے لفظ عالم کو جو خود جمع ہے پھر جمع کر کے فرمایا۔ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ صاحبِ رحمت کے معنوں میں

یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے نام ہیں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ کسی چیز
کا مالک وہ کہلاتا ہے جس کو اس چیز میں ہر طرح کے تصرّف کا
اختیار ہو۔ قیامت کے دن ہر طرح کی جزاء و سزا کا اختیار
خاص اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے۔ اس واسطے اپنے آپ کو اس دن کا
مالک فرمایا۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ۔ شروع سورہ سے یہاں تک حمد و
ثنا کا ذکر تھا۔ اور حمد و ثنا ممدوح کی غائبانہ حالت میں اعلیٰ
درجہ کی حمد و ثنا کہلاتی ہے۔ اسی لیے یہاں تک غائب کے صیغے
تھے۔ اس آیت سے دعا کی حالت شروع ہوتی ہے۔ اور دعا میں
حاضری مناسب ہے اس واسطے اللہ تعالیٰ نے طرزِ کلام کو بدل دیا۔
اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے معنی اس طرزِ کلام کے موافق یہ ہوئے کہ یا اللہ
سوا تیری ذات کے اور کسی کی عبادت ہم نہیں کرتے۔ کیونکہ تو نے ہی
ہم کو پیدا کیا اور تیری ہی ہدایت سے ہم کو عبادت کی توفیق ہوئی۔
وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اور یا اللہ ہماری قابلِ قبول عبادت میں
شیطان کو وسوسہ اور خواہشِ نفسانی ہر طرح سے ہارج ہے۔
اس لیے ہم تیری ذاتِ پاک سے قابلِ قبول عبادت کے ادا ہونے
کی مدد چاہتے ہیں۔ کیونکہ جس عبادت میں وسوسہ شیطانی کا دخل ہوگا
اس میں نمائش اور ریاکاری کا اور جس عبادت میں خواہشِ نفسانی
ہوگی اس میں بدعت کا اندیشہ اور نقصان بغیر تیری مدد کے
رفع نہیں ہو سکتا۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ مسند امام
احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت عبد اللہ بن مسعود سے بسند معتبر
روایت ہے جس میں خود صاحبِ وحی صلعم نے لفظ صراطِ مستقیم کی
تفسیر میں فرمایا ہے کہ صراطِ مستقیم سے مراد اسلام ہے۔ اس لیے اب

کسی دوسری تفسیر کی ضرورت نہیں۔ اس تفسیر کی بنا پر آخری سورہ
تک کی دعاء کا حاصل یہ ہے کہ یا اللہ جس طرح تو نے اپنے فضل سے
ہم کو اسلام کے راستے پر لگایا ہے اسی طرح تا قیامت ہم کو اسی
راستہ پر قائم اور ثابت قدم رکھ کیونکہ یہ راستہ انبیاء اور
ایسے کامل دین داروں کا ہے جن پر تو نے اپنی طرح طرح کی دین
و دنیا کی نعمتیں ختم کی ہیں۔ اور پچھلی امتوں کے جو لوگ راہِ راست سے
بہک گئے ہیں اور ان کی اسی گمراہی کے سبب تو ان سے ناراض اور
ان پر تیرا غصہ ہے۔ ان کی چال اور روش سے ہم کو بچا۔ حضرت
عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ حضرت
عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کی امت میں وہ لوگ ہیں جو اپنے دین پر
قائم رہے۔ مسلم وغیرہ کی صحیح روایتوں کے موافق سورہ فاتحہ کے
ختم کے بعد آمین کہنا سنّت ہے۔ امام مالک، شافعی اور امام
احمد کے نزدیک سورہ فاتحہ کا پڑھنا نماز کا ایک رکن ہے۔ بغیر
اس کے ان کے نزدیک نماز نہیں ہوتی۔ امام ابو حنیفہ اس کے
مخالف ہیں۔ دلیلیں جانبین کے مذہب کی فقہ کی کتابوں میں ہیں۔
اس سورہ کی اول کی آیتوں میں بندوں کی طرف سے بارگاہِ الٰہی میں
دعا ہے۔ اسی واسطے حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ
مجھ میں اور میرے بندوں میں اس سورۃ کی نصفا نصف کی تقسیم ہے۔
صحیحین وغیرہ میں جو حدیثیں ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ امام، مقتدی،
منفرد کسی کی نماز بغیر سورہ فاتحہ کے پڑھنے کے نہیں ہوتی۔*

* مرزا عبد الغفار مالک افضل المطابع و افضل الاخبار دہلی کے اہتمام
۱۳۲۷ھ میں شائع ہوئی۔

تفسیر ماجدی

عبدالماجد دریابادی

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ تفسیر اردو کے صاحبِ طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی کی لکھی ہوئی ہے اور تاج کمپنی نے بڑے اہتمام سے بڑھیا کاغذ پر اور نہایت اچھے گیٹ اپ کے ساتھ شائع کی ہے۔ درمیان میں بے حد خوبصورت خط اور بیل دار حاشیہ کے اندر قرآن کا متن مع ترجمہ ہے۔ اور چاروں طرف چوڑا حاشیہ دے کر تفسیر بیان کی گئی ہے۔ متن اور ترجمہ سمیت کُل تفسیر ۱۲۱۵ صفحات پر مشتمل صرف ایک ضخیم جلد میں ہے اور باوجودیکہ اختصار سے کام لیا گیا ہے لیکن

• اندازِ بیان اور جامعیت کی بناء پر یہ ایک جلد بعض اور مفسرین کی کئی کئی مجلدات سے زیادہ واضح اور پُر تاثیر ہے۔

مفسّر موصوف مولانا عبدالماجد دریابادی وسط مارچ ۱۸۹۲ء میں اپنے وطن دریاباد ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی عبدالقادر (۱۸۴۲ء تا ۱۹۱۲ء) اودھ کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ وہ اگرچہ نہایت دیندار اور تہجّد گزار انسان تھے تاہم زمانہ کے تقاضہ کے مطابق صاحبزادہ کو فارسی تعلیم گھر پر دلا کر انگریزی اسکول میں داخل کر دیا۔ سیتاپور ہائی اسکول سے ۱۹۰۸ء میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ اسکول میں عربی اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھی۔ استاد اچھے اور شفیق ملے۔ انھوں نے شفقت سے پڑھایا۔ اور انھوں نے توجہ سے پڑھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسکول میں عربی زبان میں خاصی استعداد ہو گئی۔ جس کو بعد میں اتنا بڑھایا کہ قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر لکھنے کے قابل ہو گئے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے کننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایف اے اور بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ کالج میں ان کے خاص اور دلچسپی کے مضامین

انگریزی، منطق اور فلسفہ تھے۔ یہ مضامین انگریز استادوں سے پڑھے اور مل کا فلسفہ زیرِ مطالعہ آیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا میلان الحاد کی جانب ہو گیا۔ اور اس کا اثر ان کی طبیعت پر کئی سال تک رہا۔ اس جوش اور جذبہ کے تحت انھوں نے فلسفہ اور نفسیات پر کئی کتابیں لکھیں اور دوسری زبانوں سے ترجمہ کیں۔ ان میں مبادیٔ فلسفہ ۲ جلد، فلسفۂ جذبات، فلسفۂ اجتماع، مکالمات برکلے (ترجمہ) اور تاریخ اخلاقِ یورپ (ترجمہ) بہت مشہور رہیں۔ یہ کتابیں انھوں نے جس دلنشین انداز میں لکھی ہیں اس سے اردو زبان کے سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ لیکن خود وہ کئی سال گمراہی میں مبتلا رہے۔ جس کو بعد میں وہ خود اپنا دورِ جاہلیت کہا کرتے تھے۔

کئی سال تک الحاد کی ظلمتوں میں گھرے رہے لیکن اللہ تعالیٰ کو انھیں ہدایت دینی تھی لہٰذا چند ایسی ہستیوں کی صحبت نصیب ہو گئی جو اسلام ہی کو ازلی اور ابدی حقیقت سمجھتے تھے۔ ان میں پہلی ہستی مولانا محمد علی کی تھی اور دوسری اکبر الٰہ آبادی کی اور تیسری مجدّدِ ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی۔ ان حضرات کے اثر نے ان کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف پہنچا دیا اور اس حد تک اصلاح ہوئی کہ شریعت کے ساتھ راہِ طریقت بھی طے کی اور مولانا تھانویؒ کے ایما سے حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے حلقہ مریدین میں داخل ہو گئے۔

ذریعہ معاش کے طور پر کچھ عرصہ ملازمت کی۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں دارالترجمہ حیدرآباد دکن سے منسلک ہو گئے۔ لیکن جلد ہی دل برداشتہ ہو کر ملازمت ترک کر دی اور وہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔ اس کے بعد زندگی کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزارا اور صحافت سے تعلق قائم کیا جو مرتے دم تک جاری رہا۔ پہلے ایک اصلاحی ہفت روزہ "سچ" نکالا۔ ۱۹۵۰ء میں اس کا نام بدل کر

"صدقِ جدید" کر دیا۔ یہ اخبار آخری وقت تک نہایت باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ اسی کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی بڑے پیمانہ پر جاری رہا اور بڑی معیاری کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ۶ر جنوری ۱۹۷۷ء کو ۸۵ سال کی عمر میں رہگزائے عالمِ بقا ہوئے۔ انتقال دریاباد ہی میں ہوا۔[1]

جیسا کہ صدر میں کہا جا چکا ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی کی زندگی لکھنے لکھانے کے لیے وقف تھی۔ چنانچہ انھوں نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں۔ ان سب ہی کو اردو ادب میں بلند مقام حاصل ہے لیکن جس چیز نے انھیں شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ دلوائی وہ انگریزی اور اردو میں ان کا کلام پاک کا ترجمہ و تفسیر ہے۔ اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ دلانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ بجائے خود کہنے کے ایک اور چوٹی کے عالم مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی رائے پیش کر دی جائے۔ وہ فرماتے ہیں:

"آپ کا سب سے بڑا کارنامہ جو بقائے دوام کا ضامن ہے وہ انگریزی اور اردو میں ترجمہ و تفسیر کلام مجید ہے۔ ابھی عمر کی درمیانی منزل میں تھے کہ آپ کو اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانوئ کے فیضِ صحبت و اثر سے قرآن مجید کے ساتھ ایسا شغف و انہماک پیدا ہوا کہ زندگی اس کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ اگرچہ وہ دوسرے کام بھی کرتے رہے لیکن ان کی حیثیت ضمنی تھی۔ ترجمہ و تفسیر کے سلسلہ میں مولانا نے مسلسل سالہا سال جو محنتِ شاقہ برداشت کی ہے اور جس ذوق و شوق اور انہماک سے یہ عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اس کا اندازہ کتاب

---

[1] تعارف قرآن صفحات ۲۲۱-۲۲۴

دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس ذیل میں مولانا نے عربی اور اردو زبان کی تفاسیر اور عربی و قرآنی لغات کا مطالعہ تو محنت اور وسعت سے کیا ہی تھا سب سے بڑی بات یہ ہے کہ چونکہ قرآن مجید میں اہلِ کتاب اور ان کی کتابوں کا کثرت سے تذکرہ ہے۔ پھر امم قدیمہ کے حالات و سوانح بھی جگہ جگہ بیان کیے گئے ہیں۔ اس بناء پر مولانا نے کتبِ قدیمی یعنی عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید کے پُرانے اور نئے ایڈیشن اور امم سابقہ کی تاریخ پر نہایت مستند اور محققانہ کتابوں کا وہ عظیم ذخیرہ بڑی محنت اور دل کی لگن کے ساتھ کہاں کہاں سے فراہم کیا۔ اس سلسلہ میں عبرانی زبان بھی سیکھی۔ پھر قرآن مجید سے متعلق جو کچھ یورپ میں لکھا گیا تھا اس کی کتابیں بھی برابر بہم پہنچاتے اور بڑے غور و خوض سے اس کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں فلسفہ اور سائنس کے نئے نئے نظریات اور افکار سے بھی واقف رہتے تھے۔ انھوں نے اپنی تفسیر میں ان سب چیزوں سے کام لیا۔ اور یہی مولانا کی تفسیر کی وہ انفرادی خصوصیت بن گئی، جس میں کوئی بھی ان کا سہیم و شریک نہیں ہے۔[1]

اسی کے ساتھ ساتھ ایک اور بڑے عالم یعنی مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی رائے بھی سن لیجیے۔ وہ کہتے ہیں:

"یہ تفسیر دورِ جدید کے صاحبِ طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے ہے۔ اس کی تین جلدیں ہیں۔[2] حدیث اور قرآنی آیات سے

---

[1] مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم اے نظرات: برہان دہلی۔ ج ۷۸ شمارہ ا۔ ص ۳-۴
[2] ان تین جلدوں کو ایک جلد میں بھی جمع کر دیا گیا ہے۔

اصلاحی نکات کے استنباط کا اچھا سلیقہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔ مرحوم رسمی عالم نہ تھے لیکن باوجود اس کے اپنی علمی صلاحیت سے بڑا کام لیا۔ قرآن کریم کی تفسیر تین جلدوں میں لکھی اور عربی داں طلبہ پر بڑا احسان کیا کہ دیگر تفسیر کی اصل عبارتیں سب نقل کر دیں۔[1] تفسیر ماجدی پر من الحیث المجموع دو ممتاز علماء کی آرا جاننے کے بعد اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض آیات کی تفسیر کو دیکھا جائے۔

ان میں سے ایک سورہ فاتحہ کی چوتھی آیت اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ہے۔ اس میں عبادت اور استعانت کے لیے جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے وہ ایسا ہے کہ اس سے شرک کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔ مگر بہت کم مفسرین اس کی طرف توجہ کرتے اور اس کی اس انداز سے تفسیر بیان کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے تو اس کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ دوسرے مفسرین بھی اس پر سے سرسری طور پر گزر گئے ہیں۔ مگر مولانا عبدالماجد نے نہایت مختصر الفاظ میں اس کو اس طرح سمجھایا ہے کہ جس کے دل میں ذرا بھی خوفِ خدا ہوگا وہ عبادت واستعانت میں کسی طرح کے حیلہ بہانے سے کام لے کر شرک کا مرتکب نہیں ہوگا۔ ملاحظہ ہو۔

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ۔

ترجمہ: ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور بس تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

تفسیر: (نہ کہ کسی اور سے اسے حاجت روا سمجھ کر اے اللہ) آیت کے جزو اول میں بیزاری اور تبری ہے شرک سے۔ اس آخری جز میں بندہ کی زبان سے اقرار ہے اپنی بے بضاعتی، بے قدری کا۔ اور اقرار ہے اپنے کو حفاظت اور نصرت کے لیے ہر طرح اللہ کے ہاتھ میں سپرد کر دینے کا

[1] تعارف قرآن ص ۲۱۸

فَالۡاَوَّلُ تَبَرُّءٌ مِّنَ الشِّرۡكِ وَالثَّانِیۡ تَبَرُّءٌ مِّنَ الۡحَوۡلِ وَالۡقُوَّةِ وَتَفۡوِیۡضٌ اِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ (ابن کثیر) نَعۡبُدُ کے معاً بعد نَسۡتَعِیۡنُ لانا گویا بندوں کی زبان سے یہ کہلانا ہے کہ ہم عبادت تک میں تیری ہی توفیق تیری ہی اعانت تیری ہی دستگیری کے محتاج ہیں۔ اِیَّاکَ کی تکرار توحید اور رد شرک کی اہمیت کو اور دوبالا کر رہی ہے۔ کَرَّرَ ذٰلِكَ لِلۡاِهۡتِمَامِ وَالۡحَصۡرِ (ابن کثیر) كَرَّرَ الضَّمِیۡرَ لِلتَّنۡصِیۡصِ عَلٰۤى اَنَّهُ الۡمُسۡتَعَانُ بِهٖ لَا غَیۡرُ (بیضاوی) آیت نے جڑ کاٹ دی ہے۔ ہر قسم کی مظہر پرستی اور مخلوق پرستی کی۔ شرک کی خفی سے خفی بھی راہیں بند کر دی ہیں۔ اور کوئی خفیف سی بھی گنجائش پیر پرستی، پیغمبر پرستی، فرشتہ پرستی وغیرہ کی نہیں چھوڑی۔ مرشد تھانوی نے فرمایا کہ سالک کا مقام اِیَّاکَ نَعۡبُدُ پر تمام ہو جاتا ہے۔ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ سے وہ طالب تمکین و رسوخ کا ہوتا ہے۔[1]

ایک اور مقام وَمَنۡ یَّقۡنُتۡ کے سیپارے میں آیات ۳۲، ۳۳ اور ۳۴ کی تفسیر ہے۔ ان ہی آیات میں آیت تطہیر بھی آگئی ہے۔ یہاں تخاطب ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور تذکرہ تمام تر امہات المومنین کا ہے۔ ایسی صورت میں قیاس اور عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ آیت تطہیر کا تعلق بھی امہات المومنین سے ہو لیکن تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ بعض مفسرین کو اس آیت کو کلیتاً حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور ان کی اولاد کے ساتھ مخصوص کر دیتے ہیں۔ اور بعض مفسرین تھوڑی رعایت برت کر (بطور طفیلیوں کے) امہات المومنین کو بھی شامل کر لیتے ہیں اور استدلال یہ پیش کرتے ہیں کہ

[1] القرآن الحکیم مع ترجمہ و تفسیر از مولانا عبدالماجد دریابادی۔ شائع کردہ تاج کمپنی لمیٹڈ ص ۴

امہات المومنین چونکہ خواتین ہیں اس لیے جہاں جہاں جمع مونث کی ضمیر یہ جمع مونث کے صیغے استعمال ہو رہے ہیں۔ ان حصوں کا تعلق تو ان سے ہے لیکن آیت تطہیر میں چونکہ دو جگہ جمع مذکر کی ضمیر "کُمْ" (عَنْكُمُ اور يُطَهِّرَكُمْ) کا استعمال ہوا ہے اس لیے اس آیت کا تعلق بعض مردوں سے ہے یا اس میں امہات المومنین کے ساتھ بعض مرد بھی شریک ہیں اور وہ ہیں حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اس قیاس کی بنیاد پر بعض مردوں کو بھی اس میں شریک کرنا ضروری ہے تو وہ کون سا قرینہ ہے جس کی بنیاد پر حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہی کو شریک کیا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد اور حضرات حسنینؓ نواسے تھے تو ان ہی رشتوں کی بنیاد پر حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوالعاصؓ کو اور رسول اللہؐ کے سب سے بڑے نواسے حضرت علیؓ ابن حضرت زینبؓ بنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چہیتی نواسی حضرت امامہؓ زوجہ حضرت علی کو بھی شامل کیا جائے۔ بعض مفسرین اور دیگر حضرات نے جب اس طرح بات بنتے نہ دیکھی تو ایک حدیث اور چادر تطہیر کا سہارا پکڑا لیکن قرآن کے واضح ارشاد کے مقابلہ میں ان دلائل میں کوئی وزن نہیں رہتا۔ بہرحال بحث کو زیادہ طول نہ دیتے ہوئے اس تفسیر پر غور کرنے کی ضرورت ہے جو مولانا عبدالماجد دریابادی نے بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو

يٰنِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ ....

يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ آيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (۲۲-۲۳-تا ۲۴)

ترجمہ: اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو جبکہ تم تقویٰ اختیار کر رکھو۔ تو تم بول میں نزاکت مت اختیار کرو کہ (اس سے) ایسے شخص کو خیال (فاسد) پیدا ہونے لگتا ہے جس کے قلب میں خرابی

ہے۔ اور قاعدے کے موافق بات کہا کرو اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو۔ اور جاہلیت قدیم کے مطابق اپنے کو دکھاتی مت پھرو اور نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ کا اور اس کے رسول کا حکم مانو:

"اللہ تو بس یہی جانتا ہے کہ اے (نبی کے) گھر والو تم سے آلودگی کو دور رکھے" اور تم کو خوب نکھار دے۔ اور تم اللہ کی ان آیتوں اور اس علم کو یاد رکھو جو تمہارے گھروں میں پڑھ کر سنائے جاتے رہتے ہیں۔

(آیت تطہیر) اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝

ترجمہ: "اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ اے (نبی کے) گھر والو تم سے آلودگی سے دور رکھے"

(وضاحت) اہل سنت کا اس میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ آیت کا سبب نزول ازواج النبیؐ ہی ہیں اور اہل بیت سے اولاً وہی مراد ہیں۔ البتہ گفتگو اس میں ہوئی ہے کہ آیا ان کے علاوہ بھی کوئی مراد ہے؟ سو محققین اہل سنت کا فیصلہ ہے کہ لفظ کے عموم میں ازواج نبی کے علاوہ بھی ہستیاں داخل ہیں۔ قال عکرمہ اِنَّهَا نَزَلَتْ فِيْ شَانِ نِسَاءِ النَّبِيِّ صلعم فَاِنْ كَانَ الْمُرَادُ اَنَّهُنَّ كُنَّ سَبَبَ النُّزُوْلِ دُوْنَ غَيْرِهِنَّ فَصَحِيْحٌ وَاِنْ اُرِيْدَ اَنَّهُنَّ الْمُرَادُ فَقَطْ دُوْنَ غَيْرِهِنَّ فَفِيْ هٰذَا نَظَرٌ فَاِنَّهُ قَدْ وَرَدَتْ اَحَادِيْثُ تَدُلُّ عَلٰى اَنَّ الْمُرَادَ اَعَمُّ مِنْ ذٰلِكَ (ابن کثیر) وَالَّذِيْ يَظْهَرُ مِنَ الْاٰيَةِ اَنَّهَا عَامَّةٌ فِيْ جَمِيْعِ اَهْلِ الْبَيْتِ مِنَ الْاَزْوَاجِ وَغَيْرِهِنَّ (قرطبی) اہل بیت کے جو متعارف معنی اردو میں چلے ہوئے

ہیں وہ بھی حدیث سے نکلتے ہیں لیکن یہاں ذکر صرف اصطلاحِ قرآنی کا ہے۔
قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی اہلِ بیت کا لفظ ایک پیغمبر کی زوجہ محترمہ کے
لیے آیا ہے[1] (ہود۔ ع۔ ۷۔۷۳)

---

[1] یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب حضرت لوط علیہ السلام کی امت کی بداعمالیوں کی وجہ سے اس پر عذاب نازل کرنے کے لیے فرشتے آئے۔ اس وقت وہ انسانوں کی شکل میں تھے۔ وہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہؑ کو بیٹے کی خوشخبری دینے کے لیے بھی آئے تھے۔ انھوں نے آکر حضرت ابراہیمؑ کو سلام کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا تم پر بھی سلام ہو۔ وہ فرشتوں کو معمولی مسافر سمجھتے ہوئے ان کی خاطرداری میں لگ گئے اور ایک تلا ہوا بچھڑا لاکر ان کے سامنے رکھا۔ لیکن انھوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ متوحش ہوئے۔ فرشتے بولے آپ ڈریے نہیں۔ ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اس کے بعد قرآن کی آیات ملاحظہ ہوں۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۔ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ۔ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝ (۱۱: ۷۱۔۷۳)

ترجمہ: اور ان کی بیوی کھڑی تھیں۔ پس وہ ہنسیں پھر ہم نے انھیں بشارت دی اسحٰق کی اور اسحٰق کے بعد یعقوب کی۔ بولیں۔ ہائے خاک پڑے کیا اب میں بچہ جنوں گی۔ درآنحالیکہ میں بوڑھی ہو چکی اور یہ میرے میاں بھی بالکل بوڑھے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ وہ بولے ارے تم تعجب کرتی ہو۔ اللہ کے کام میں اے خاندان والو تم پر تو اللہ کی (خاص) رحمت اور اس کی

معارف القرآن

مولانا مفتی محمد شفیع

اردو تفاسیر میں یہ نہایت مشہور، مقبول، جامع اور بلند پایہ تفسیر ہے۔ پیرانہ سالی اور صحت کی خرابی کے باوجود یہ تفسیر مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمت اللہ علیہ نے صرف پانچ سال کی قلیل مدت میں لکھ کر شائع کی۔ مفتی محمد شفیع صاحب دیوبند کے عثمانی شیوخ میں سے تھے اور شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمت اللہ علیہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ۱۸۹۷ء میں دیوبند میں پیدا ہوئے۔ چونکہ کئی پشتوں سے خاندان میں علم دین متوارث چلا آرہا تھا۔ مفتی صاحب کے والد ماجد مولانا محمد یٰسین خود دارالعلوم دیوبند کے شروع دور کے فارغ التحصیل تھے۔ اور فراغت کے بعد بھی مدت العمر اسی مرکزِ علم سے وابستہ رہے۔ اس لیے انھوں نے مفتی صاحب کو بھی دین کی تعلیم دلائی انھوں نے قرآن دارالعلوم کے اساتذہ حافظ عبدالعظیم اور حافظ نامدار خاں سے پڑھا۔ پھر اپنے والد محترم محمد یٰسین کی خدمت میں رہ کر ان سے اردو، فارسی، حساب، ریاضی اور ابتدائی عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں دارالعلوم کے درجہ عربی میں باقاعدہ داخلہ لے کر ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) برکتیں نازل ہوتی رہتی ہیں بےشک وہ تعریف کے لائق اور بڑی شان والا ہے۔
ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ یہاں تخاطب صرف حضرت سارہ زوجہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے لیکن خط کشیدہ حصہ میں ان کے لیے ایک جگہ جمع مونث کا صیغہ "تعجبین" (تم تعجب کرتی ہو) استعمال ہوا ہے۔ اور دوسری جگہ جمع مذکر کی ضمیر کم یعنی (عَلَيْكُمْ = تم پر)۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ استعمال اس وقت کے عربوں کے محاورہ کے مطابق ہے۔ اس کو زبان کے موجودہ قواعد کی روشنی میں جانچنا ٹھیک نہیں ہے۔

درسِ نظامی کی تکمیل کی۔ متوسط تعلیم عربی حضرت مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔ بعدہٗ علوم عربیہ کی تکمیل حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی، حضرت سید اصغر حسین صاحب حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا محمد اعزاز علی، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور حضرت مولانا محمد رسول خان صاحب رحمہم اللہ سے کی۔ ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں فنون کی چند کتابیں پڑھنا شروع کیں اور اسی سال سے دارالعلوم میں تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ایک سال تعلیم و تعلّم ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۹ء سے باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ بارہ سال بعد ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں صدر مفتی بنا دیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ کتابیں حدیث و تفسیر کی بھی زیرِ درس رہیں۔ یہ سلسلہ ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء تک چلا۔ اسی سال تحریکِ پاکستان کی جد و جہد اور کچھ دوسرے اسباب کی بناء پر دارالعلوم دیوبند کی خدمات سے سبکدوش ہو گئے۔[1]

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان وجود میں آگیا اور تقریباً آٹھ ماہ بعد شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے بلانے پر مئی ۱۹۴۸ء میں دہلی اور چند مقامات سے ہوتے ہوئے پاکستان آگئے اور بقول مفتی صاحب "کراچی غیر اختیاری طور پر اپنا وطن بن گیا۔ لیکن جن مقاصد کے لیے پاکستان محبوب و مطلوب تھا اور اس کے لیے سب کچھ قربان کیا تھا۔ حکومتوں کے انقلاب نے ان کی حیثیت ایک لذیذ خواب سے زیادہ نہ چھوڑی۔

[1] معارف القرآن جلد اول۔ شائع کردہ ادارۃ المعارف۔ دارالعلوم کراچی ۱۴ طبع جدید جون ۱۹۸۳ء۔ صفحات ۶۰-۶۱؛ میرے والد ماجد اور ان کے مجرب عملیات مرتبہ مفتی محمد شفیع۔ ناشر دارالاشاعت۔ مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی۔ صفحات ۵-۲۲ تعارف قرآن صفحہ ۱۷-۳۱

بلبل ہمہ تن خوں شد و گل شد ہمہ تن چاک[1]
اے وائے بہارے اگر ایں ست بہار

...ن یوسی کے باوجود مفتی صاحب نے اپنے مشن کو جاری رکھا۔ درس و تدریس اور ...تا کا کام بھی انجام دیا۔ اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ دینی علوم کی بھی خدمت کی۔ دارالعلوم دیوبند کے نمونے کا کورنگی میں ایک دارالعلوم قائم کیا جو ان کے رحلت کے بعد بھی ان کے لائق صاحبزادگان کی نگرانی میں نہایت خوبی سے چل رہا ہے اور ایک خلق اس سے فیضیاب ہو رہی ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں رہتے ہوئے درس و تدریس اور فتویٰ نویسی کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب نے تصنیف و تالیف کا کام بھی باقاعدگی سے انجام دیا اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے راہِ طریقت بھی طے کرنی شروع کر دی۔ بیس سال تک حضرت کی خدمت میں حاضری دیتے رہے اور اکتسابِ فیض کرتے رہے۔ ان ہی کے ایماء سے احکام القرآن پر عربی زبان میں دو جلدیں لکھیں۔ ان تمام باتوں کا یہ اثر ہوا کہ قرآن کریم کے ساتھ ایک خصوصی تعلق قائم ہو گیا جو پاکستان آنے کے بعد بڑھتا رہا۔ ۱۹۵۰ء سے آرام باغ کراچی کے متصل مسجد باب الاسلام میں درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جو سات سال میں مکمل ہو گیا۔ پھر ریڈیو پاکستان سے "معارف القرآن" کے نام سے ہفتہ وار درس نشر کیا جو عام مسلمانوں کی ضرورت کے مطابق احکام کی آیات کی تفسیر ہوتی تھی۔ یہ تفسیر سورہ ابراہیم تک پہنچی تھی کہ ریڈیو پاکستان کی نئی پالیسی کے تحت یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ لیکن بعد میں جنوبی افریقہ اور پاکستان کے بعض دیندار مسلمانوں کی فرمائش پر تیرہویں سیپارے تک کی

[1] معارف القرآن جلد اول صفحات ۶۲-۶۳۔

تفسیر شروع کرنے کا ارادہ کیا لیکن ابھی سورہ بقرہ کا کام شروع کیا تھا مفتی
صاحب سخت بیمار ہو گئے جس کی وجہ سے کام رک گیا۔ بستر علالت پر ہی شو...
۱۳۸۸ھ مطابق نومبر ۱۹۶۸ء میں پھر کام شروع کیا اور حالات کی ناسازگاری کے
باوجود ۲۱ شعبان ۱۳۹۲ھ مطابق ۳۰ ستمبر ۱۹۷۲ء بروز شنبہ تفسیر کا کام اختتام
کو پہنچا۔ بعد میں آپ کے لائق صاحبزادے مولانا محمد تقی عثمانی نے "علوم قرآن یا
علم تفسیر سے متعلق ضروری معلومات" کے عنوان سے ایک مقدمہ لکھ کر اس میں
کر دیا جس سے عام قاری کے لیے اس کی افادیت میں معتدبہ اضافہ ہو گیا۔
تفسیر معارف القرآن آٹھ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے اور بے حد مقبول ہے
مفتی صاحب مرحوم کا یہ کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک ان کے نام کو زندہ رکھے گا۔
اس تفسیر کی جامعیت کے بارے میں مفسر علام نے جو امور بیان فرمائے
ہیں وہ ان کی زبان میں بیان کر دینا مناسب ہوگا۔ فرماتے ہیں:
مذکورالصدر التزامات نے تفسیر معارف القرآن کو مندرجہ ذیل چیزوں کا
جامع بنا دیا ہے:

(۱) قرآن مجید کے دو مستند ترجمے۔ ایک حضرت شیخ الہندؒ کا جو دراصل
شاہ عبد القادر صاحب کا ترجمہ ہے۔ دوسرا حضرت حکیم الامت تھانویؒ
کا ترجمہ۔

(۲) خلاصۂ تفسیر جو دراصل بیان القرآن کا خلاصہ مع تسہیل ہے جس کو علیحدہ
بھی قرآن مجید کے حاشیہ پر طبع کر لیا جائے تو تھوڑی فرصت والوں کیلئے
فہم قرآن کا مستند اور بہترین ذریعہ ہے۔ اس نے ایک اور ضرورت کو
پورا کر دیا جس کی طرف مجھے اخی فی اللہ مولانا بدر عالم صاحب مہاجر

[1] معارف القرآن جلد اول ص ۳۰

مدینہ منورہ سے علامہ فرید وجدی کی ایک مختصر تفسیر حاشیہ قرآن پر
دکھلا کر توجہ دلائی تھی کہ کاش اردو میں بھی کوئی ایسی تفسیر ہوتی جو اس کی
طرح مختصر اور آسان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ آرزو بھی پوری فرما دی۔
یہ دونوں چیزیں تو اکابر علماء کی مستند اور معروف ہیں۔

(۳) تیسری چیز معارف و مسائل ہیں جو میری طرف منسوب ہیں اور میری محنت
کا محور ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہ اس میں بھی میرا اپنا کچھ نہیں سب اسلاف امت
ہی سے لیا ہوا ہے۔ آج کل کے اہل علم اور اہل قلم اکثر اس فکر میں رہتے ہیں
کہ اپنی کوئی تحقیق اور اپنی طرف سے کوئی نئی چیز پیش کریں۔ اس پر اللہ تعالیٰ
کا شکر گزار ہوں کہ اس سب کام میں میرا اپنا کچھ نہیں۔

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیچ ۔۔۔ بے عنایات خدا ہیچیم و ہیچ[1]

مفتی صاحب نے اس تفسیر کے لکھنے میں جتنی کاوش کی ہے اس کو ہر شخص سمجھ
سکتا ہے۔ لیکن اللہ والوں کی باتیں بھی عجیب ہوتی ہیں کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد
بھی انھوں نے کس آسانی سے کہہ دیا کہ "اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس
سب کام میں میرا اپنا کچھ نہیں"۔ کوئی دنیا دار ہوتا تو سب کچھ دوسروں سے نقل
کرنے کے بعد ان ہی کے ستر عیب گناتا اور اپنے متعلق دھڑلے سے کہتا

جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا

بہرحال مفتی صاحب نے یہ فقرہ لکھ کر اپنی بندگی اور عبودیت کا اظہار کیا
ہے۔ ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر کام پر اللہ کا شکر ادا کرے اس لیے
کہ "اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں"۔ تاہم تائید ایزدی سے
مفتی صاحب نے اس تفسیر میں جو انداز اختیار کیا ہے سچ پوچھیے تو وہ ان ہی کا حصہ

[1] معارف القرآن جلد اول ص ۲۱

ہے۔ انھوں نے تین مرحلوں میں تفسیر بیان کر کے اس کو ہر قاری کے لیے نہ صرف
قابلِ فہم بلکہ بے انتہا مفید بنا دیا ہے۔ پہلا مرحلہ ترجمہ کا ہے، دوسرا خلاصۂ تفسیر
کا اور تیسرا معارف و مسائل کا۔ ترجمہ مختصر، بامحاورہ، رواں اور شگفتہ ہے
جس کی وجہ سے قاری کو کسی ابہام سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ خلاصۂ تفسیر سے
ہر بات پوری طرح واضح اور منقح ہو کر ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ اور معارف و
مسائل پڑھنے کے بعد تو قاری کے لیے کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ ان امور پر تفصیلی
طور پر کچھ کہنا مشکل ہے، لہٰذا نمونہ کے لیے ذیل میں سورہ فاتحہ کی تفسیر پیش
کی جاتی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ .... غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ
وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۱تا۷﴾

ترجمہ: سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو پالنے والا ہے سارے جہان
کا، بے حد مہربان نہایت رحم والا، مالک روزِ جزا کا، تیری ہی
ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، بتلا ہم کو راہ
سیدھی، راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا، جن پر نہ تیرا غصہ
ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔

خلاصۂ تفسیر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں
ہر ہر عالم کے (مخلوقات الگ الگ جنس ایک ایک عالم کہلاتا ہے، مثلاً عالمِ
ملائکہ، عالمِ انسان، عالمِ جن) الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، جو بڑے مہربان نہایت
رحم والے ہیں۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ جو مالک ہیں روزِ جزا کے (مراد قیامت کا
دن ہے جس میں ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پاوے گا۔) اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں۔
اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ بتلا دیجیے ہم کو رستہ سیدھا (مراد دین کا راستہ
ہے) صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ، راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام
فرمایا (مراد دین کا انعام ہے) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ نہ راستہ
ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب ہوا اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے۔
(راہِ ہدایت چھوڑنے کی دو وجہ ہوا کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی پوری تحقیق ہی نہ کرے،
ضالین سے ایسے لوگ مراد ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تحقیق پوری ہونے کے باوجود
اس پر عمل نہ کرے۔ مغضوب علیہم سے ایسے لوگ مراد ہیں۔ کیونکہ جان بوجھ کر خلاف
کرنا زیادہ ناراضی کا سبب ہوتا ہے۔)

معارف و مسائل

تفسیر کا یہ مرحلہ سب سے زیادہ طویل ہے۔ چنانچہ سورہ فاتحہ میں اس کی وسعت
بڑے سائز کے چوبیس صفحات کو گھیرے ہوئے ہے اور اس لیے اس طویل بحث کو
ذیلی عنوانات کے تحت بیان کرنا پڑا ہے۔ یہ عنوانات اس طرح قائم کیے گئے ہیں۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ روزِ جزا کی حقیقت اور عقلاً اس کی
ضرورت مالک کون ہے۔ تَكْمِلَةُ الدِّرَايَةِ فِيْ تَفْصِيْلِ دَرَجَاتِ
الْهِدَايَةِ۔ صراطِ مستقیم کون سا راستہ ہے۔ صراطِ مستقیم کتاب اللہ
اور رجال اللہ دونوں کے مجموعہ سے ملتا ہے۔ فرقہ وارانہ اختلافات
کا بڑا سبب اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء انسان کا فطری فرض ہے۔ خود
اپنی مدح و ستائش انسان کے لیے جائز نہیں۔ لفظ رب اللہ تعالیٰ
کا خاص نام ہے۔ غیر اللہ کو رب کہنا جائز نہیں۔ استعانت کے معنی
کی تشریح اور مسئلہ توسل کی تحقیق۔ صراطِ مستقیم کی ہدایت دنیا و دین

میں کلید کامیابی ہے۔

ظاہر ہے کہ اتنے ذیلی عنوانات کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں اس لیے شروع کا حصہ اور آخر کی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں۔

سورہ فاتحہ کے مضامین

سورہ فاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے جن سے پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا ہے اور آخری تین آیتوں میں انسان کی طرف سے دعاء و درخواست کا مضمون ہے جو رب العزت نے اپنی رحمت سے خود ہی انسان کو سکھایا ہے اور درمیانی ایک آیت میں دونوں چیزیں مشترک ہیں، کچھ حمد وثناء کا پہلو ہے کچھ دعاء و درخواست کا۔

وسیلہ، استعانت اور استمداد کے مسئلہ میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے۔ امید ہے کہ اس تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء و اولیاء کو وسیلہ بنانا مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو مختار مطلق سمجھ کر وسیلہ بنایا جائے تو شرک و حرام ہے۔ اور محض واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے۔ اس میں عام طور پر لوگوں میں افراط و تفریط کا عمل نظر آتا ہے۔

تفسیر نور العرفان[1]

مفتی احمد یار خان

اور

خزائن الفرقان فی تفسیر القرآن[2]

صدر الافاضل مولینا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کا ترجمہ قرآن المعروف بہ

---

1. تفسیر نور العرفان مفتی احمد یار خان ترجمہ مولانا احمد رضا خان (باقی اگلے صفحہ پر)

"کنز الایمان" اردو زبان میں ہونے والے بہترین ترجموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر تو اس کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس ترجمہ پر ان کے بعض معتقدین نے تفسیری حواشی تحریر کیے ہیں۔ ان میں دو تفسیریں زیادہ مشہور ہیں۔ ایک تفسیر "نور العرفان" مصنفہ حکیم الامت مفتی احمد یار خان صاحب بدایونی اور دوسری "خزائن الفرقان" مصنفہ صدر الافاضل مولینا سید محمد نعیم صاحب مراد آبادی۔ یوں تو دیکھ دونوں مفسرین بڑے لائق اور نہایت فاضل ہیں۔ لیکن سچ پوچھیے تو ان کی تفسیریں اس شان کی نہیں جس شان کا ترجمہ ہے۔ فاضل بریلوی نے جس غور و فکر اور تدبر سے کام لیا ہے وہ چیز ان تفسیروں میں نظر نہیں آتی۔ بعض مقامات پر تو نری تقلید سے کام لیا گیا ہے اور بعض جگہوں پر کمزور دلائل کا سہارا لیا گیا ہے۔ مثلاً اعلیٰ حضرت نے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کا نہایت صحیح ترجمہ کیا ہے۔ "ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں" ترجمہ میں یکسانیت قائم رکھ کر مترجم نے وہی مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی ہے جو قرآن کریم کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ نَعۡبُدُ اور نَسۡتَعِیۡنُ دونوں کے ساتھ "اِیَّاکَ" لگا کر ایک جیسے درجہ میں رکھا گیا۔ یہ لفظ کسی بات پر پورا زور دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر اس لفظ کے "نَعۡبُدُ" کے ساتھ لگنے سے غیر اللہ ہماری عبادت کا مرجع بننے سے خارج ہو جاتے ہیں تو نَسۡتَعِیۡنُ کے ساتھ لگنے سے بھی غیر اللہ کو ہمارے لیے استعانت یا امداد کا مرجع بننے سے خارج ہونا چاہیے۔ وہ کون سا قرینہ ہے جس کی بنیاد پر دونوں مقامات پر اس کے الگ الگ اثرات قائم ہوں یا ایک جگہ کچھ مفہوم لیا جائے اور دوسری جگہ کچھ اور۔ اسی بات کو اس طرح بھی کہا

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) شائع کردہ ادارہ کتب اسلامیہ پاکستان، گجرات مغربی پاکستان

2. خزائن الفرقان فی تفسیر القرآن مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی۔ لاہور

جاسکتا تھا " نَعْبُدُكَ وَ نَسْتَعِيْنُكَ " ۔ لیکن چونکہ سورہ فاتحہ میں بندہ
سے عہد و اثق کرایا جارہا ہے کہ اے اللہ ہم نہ عبادت میں تیرے ساتھ کسی کو
شریک کرتے ہیں اور نہ استعانت (مدد) میں۔ اس لیے یہاں یہ پیرایہ اختیار
کیا گیا ہے۔ " اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ " (ہم تجھی ہی کو پوجیں اور تجھ سے
مدد چاہیں۔)

اس واضح بات کو دونوں لائق مفسرین نے اپنے اپنے طریقہ پر بیان کرکے
قارئین کو ایک گونہ الجھن میں مبتلا کر دیا ہے۔ مفتی احمد یار خان صاحب نے تو
اس کی تفسیر اس طرح بیان کی ہے۔

" اس سے معلوم ہوا کہ حقیقتاً مدد اللہ تعالیٰ کی ہے۔ جیسے حقیقتاً
حمد رب کی ہے۔ خواہ واسطہ سے ہو یا بلا واسطہ۔ خیال رہے کہ
عبادت صرف اللہ کی ہے۔ مدد لینا حقیقتاً اللہ سے ہے۔ مجازاً
اس کے بندوں سے۔ اس فرق کی وجہ سے ان دو چیزوں کو علیحدہ
جملوں میں ارشاد فرمایا " اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ " کو
حرفِ عطف " وَ " کے ذریعہ سے ملایا گیا ہے اس لیے دونوں ایک
حکم کے تحت آتے ہیں۔ خیال رہے کہ عبادت اور مدد لینے میں فرق
یہ ہے کہ مدد تو مجازی طور پر غیر اللہ سے بھی حاصل کی جاتی ہے (نوٹ:
غیر اللہ سے اس کی زندگی میں یا اس عقیدہ کے ساتھ کہ وہ غیر فانی بھی
ہے جبکہ باری تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ
يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ) رب فرماتا ہے۔
اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۔۔۔ اور فرماتا ہے وَ تَعَاوَنُوْا
عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى لیکن عبادت غیر خدا کی نہیں کی جا سکتی ۔۔۔ الخ

مولانا سید محمد نعیم الدین صاحب " اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ " کی تفسیر اس طرح بیان

فرماتے ہیں:

" اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ " میں یہ تعلیم فرمائی کہ استعانت خواہ بواسطہ
یا بے واسطہ ہر طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ حقیقی مستعان
وہی ہے۔ باقی آلات و خدام و احباب وغیرہ سب عون الٰہی کے
مظہر ہیں۔ بندہ کو چاہیے کہ اس پر نظر رکھے اور ہر چیز میں دستِ
قدرت کو کارکن دیکھے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ اولیاء و انبیاء سے مدد
مانگنا شرک ہے عقیدۂ باطلہ ہے۔ کیونکہ مقربانِ حق کی امداد، امدادِ
الٰہی ہے۔ استعانت بالغیر نہیں۔ اگر اس آیت کے وہ معنی ہوتے جو
وہابیہ نے سمجھے تو قرآن پاک میں اَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اور اِسْتَعِيْنُوْا
بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ کیوں وارد ہوتا۔ اور احادیث میں اہل اللہ
سے استعانت کی تعلیم کیوں دی جاتی۔ (نوٹ: اپنے اس عقیدۂ باطلہ
کے جواب دہ تو وہابیہ ہیں۔ لیکن جو استدلال یہاں استعانت بالغیر
کو جائز ثابت کرنے کے لیے کام میں لایا گیا ہے وہ منطق کی اصطلاح
میں منطقی مغالطہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔)

اس نوع کے اختلافات سے قطع نظر دیکھا جائے تو یہ تفسیریں مختصر ہونے
کی وجہ سے عوام اور اوسط طبقہ کے لوگوں کے لیے بے حد مفید ہیں۔ زیادہ
تفصیلی تفسیروں کو نفوس چندہی پڑھتے ہیں۔ اس لیے کہ لمبی چوڑی بحثیں عام
قاری کے لیے عموماً قابلِ فہم نہیں ہوتیں۔ وہ اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔
اور یا تو گھبرا کر بیچ ہی میں چھوڑ دیتا ہے یا ان سے بغیر سمجھے ہوئے سرسری طور
پر گزر جاتا ہے۔ نتیجہ دونوں حالتوں میں مایوس کن ہوتا ہے۔

ذیل میں سورۃ العصر کا ترجمہ اور دونوں بزرگوں کی تفسیر پیش کی
جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

(۱۵۲-۳۰)

ترجمہ: اس زمانہ محبوب کی قسم بیشک آدمی ضرور نقصان میں ہے۔ مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔

مولانا سید محمد نعیم الدین صاحب اس سورۃ کی تفسیر اس طرح بیان کرتے ہیں۔

تفسیر: سورہ والعصر جمہور کے نزدیک مکیہ ہے۔ اس میں ایک رکوع، تین آیتیں، چودہ کلمے اور اڑسٹھ حروف ہیں۔ عصر زمانہ کو کہتے ہیں اور زمانہ چونکہ عجائبات پر مشتمل ہے۔ اس میں احوال کا تغیر و تبدل ناظر کے لیے عبرت کا سبب ہوتا ہے۔ اور یہ چیزیں خالقِ حکیم کی قدرت و حکمت اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں اس لیے ہوسکتا ہے کہ زمانہ کی قسم مراد ہو اور عصر اس وقت کو بھی کہتے ہیں جو غروب سے قبل ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ خاسر کے حق میں اس وقت کی قسم یاد فرمائی جائے، جیسا کہ صالح کے حق میں ضحی یعنی چاشت کی قسم ذکر فرمائی گئی۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ عصر سے نماز عصر مراد ہوسکتی ہے جو دن کی عبادتوں میں سب سے پچھلی عبادت ہے اور سب سے لذیذ راجح تفسیر وہی ہے جو حضرت مترجم قدس سرہٗ نے اختیار فرمائی کہ زمانہ سے مخصوص زمانہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مراد ہے جو بڑی خیر و برکت کا زمانہ اور تمام زمانوں میں سب سے زیادہ فضیلت اور شرف والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور کے زمانہ مبارک کی قسم

یاد فرمائی ہے۔ جیسا کہ لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ میں حضور کے مسکن و مکان کی قسم یاد فرمائی ہے۔ اور جیسا کہ لَعَمْرُكَ میں آپ کی عمر شریف کی قسم یاد فرمائی۔ اور اس میں شانِ محبوبیت کا اظہار ہے کہ اس کی عمر جو اس کا راس المال ہے اور اصل پونجی ہے وہ ہر دم گھٹ رہی ہے۔ حق کی تاکید سے مراد ہے ایمان و عمل صالح۔ ان تکلیفوں اور مشقتوں پر جو دین کی راہ میں پیش آئیں۔ یہ لوگ بفضلِ الٰہی ٹوٹے میں نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کی جتنی عمر گزری، نیکی اور طاعت میں گزری۔ تو وہ نفع پانے والے ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب اس سورۃ کا شانِ نزول یہ بتاتے ہیں کہ:

" ایک دفعہ کلدہ بن امیہ حضرت ابوبکر صدیق سے بولا کہ تم تو تجارتی کاروبار میں بہت ہوشیار تھے۔ تم نے یہ کیا خسارہ اٹھا کر اسلام لاکر امیروں کی دوستی کے عوض غریبوں کی محبت چند معبودوں کے مقابل ایک اللہ کی عبادت قبول کی۔ حضرت صدیق نے فرمایا کہ مومن متقی نقصان میں نہیں رہتا۔ تب حضرت صدیق کی تائید میں یہ سورہ نازل ہوئی (عزیزی) لہٰذا یہ سورت صدیق اکبر کے فضائل میں سے ہے۔ اس کے بعد لفظ " عصر " پر بحث کرکے اس کی قسم کھانے کی وجہ بتائی گئی ہے۔ پھر اس چیز کی تشریح کی گئی ہے۔ کہ انسان کو خسارے میں کیوں کہا گیا ہے۔ لیکن جن کے ایمان قوی ہیں اور اعمال صالح وہ اس خسارے سے محفوظ ہیں۔" پھر فرماتے ہیں:

" اس سے چند مسئلے معلوم ہوئے کہ ایمان اعمال پر مقدم ہے۔ بغیر ایمان کوئی نیکی مقبول نہیں .... دوسرے یہ کہ کوئی مومن نیکیوں سے بے پرواہ نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ مومن ہر قسم کی نیکیاں کرے جیسے کہ

صالحات کے عموم سے معلوم ہوا......چوتھے یہ کہ ہمیشہ نیکیاں
کرو جیسا کہ عملوا کے اطلاق سے معلوم ہوا......وہ شخص بھی
اس خسارے سے محفوظ ہے جس نے ایمان و نیک اعمال کا ہر کسی کو
تاکیدی حکم دیا اور صبر یعنی نفس کو شرعی حدیں توڑنے سے باز
رکھا اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کی۔"

فیوض القرآن

ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی

یہ تفسیر ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی نے مرتب کی ہے۔ اللہ کی شان دیکھو جس سے جو چاہے کام لے لے۔ ڈاکٹر صاحب اردو زبان و ادب کے فاضل، اور کلام اللہ کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ حالانکہ سچ پوچھیے تو علمائے دین میں بھی یہ سعادت کسی کسی ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ اسی کو توفیقِ خداوندی سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی ہم میں اکثر لوگ تمنا کرتے ہیں۔ مگر "یہ دولت اس کو ملتی ہے کہ جو جس کے مقدر میں"

بہرحال یہ ڈاکٹر صاحب کا بڑا کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی اپنے وطن بلگرام میں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم الہ آباد یونیورسٹی میں حاصل کی۔ پروفیسر وقار عظیم اور پروفیسر احتشام حسین کے ساتھیوں اور ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے شاگردوں میں تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر اعجاز حسین اپنی مشہور و مقبول کتاب "مختصر تاریخ ادب اردو" کے دیباچہ (عرضِ حال) میں لکھتے ہیں:

"میرے چند عزیز شاگرد (جن کو اب دوست بھی سمجھنا چاہیے) اس تصنیف میں ہر وقت میرا ہاتھ نہایت خوشی کے ساتھ بٹاتے رہے۔ سید حامد حسن صاحب بلگرامی ایم اے، سید وقار عظیم صاحب ایم اے

ریسرچ اسکالر، اور سید احتشام حسین صاحب بی اے جس محنت و محبت کے ساتھ اس کتاب کے لیے جاں فشانی اٹھاتے رہے وہ صرف قابلِ قدر ہی نہیں بلکہ میرے لیے مایۂ ناز بھی ہے۔ ان کی سعادت مندی و قابلیت اور ادبی شغف کو دیکھ کر بے ساختہ دل سے دعا نکلتی ہے کہ خدا ہر استاد کو ایسے شاگرد نصیب کرے۔ ان لوگوں نے نہ صرف پروف ہی پڑھا بلکہ مواد بھی اکٹھا کیا۔ اور جا بجا مضمون بھی ترتیب دیئے۔ ان تمام باتوں کا احساس خود اپنی جگہ پر ایک شکریہ ہے۔ اب میں ان کی خاطر سے اگر شکریہ یا اس قبیل کا کوئی لفظ نہ بھی استعمال کروں تو پڑھنے والے میرا مطلب خود سمجھ لیں گے۔"[1]

بہرحال ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی اور سید وقار عظیم دونوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے درجہ اوّل میں ایم اے پاس کیا۔ اس کے بعد بلگرامی صاحب ڈی۔ اے وی کالج دہرہ دون میں اردو کے لیکچرر ہو گئے۔ وہاں کافی مقبول اور ہر دل عزیز تھے۔ پھر ڈون اسکول، دہرہ دون میں ٹیچر اور ہاؤس ماسٹر متعین ہوئے۔ اور ۱۹۴۸ء تک اس حیثیت میں کام کرتے رہے۔ اسی دوران الہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

۱۹۴۸ء کے بعد افریقین اسٹڈیز، لندن یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات و شعبۂ ثقافت ہند و پاک اور سیلون کے اورینٹل اسکول میں لیکچرر رہے۔ ۱۹۵۳ء میں لوٹ کر پاکستان آ گئے اور پلاننگ کمیشن حکومتِ پاکستان کے ڈپٹی چیف آف ایجوکیشن اور سربراہ رہے۔ ۱۹۶۲ء میں کوئٹہ کی اکیڈمی آف اسلامک اسٹڈیز

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو ڈاکٹر اعجاز حسین ایم اے ڈی لٹ صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی۔ ناشر اردو اکیڈمی۔ سندھ تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۱ء، صفحات ۹-۱۰

کا نظم و نسق سنبھالا۔ لیکن ایک سال بعد جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے رئیس الجامعہ (وائس چانسلر) مقرر ہو گئے۔ جہاں ۱۹۷۶ء تک کام کرتے رہے۔ ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۸ء تک ورلڈ فیڈریشن آف اسلامک مشن کے ڈائریکٹر اور اس کے بعد بیورو آف اسلامک ریسرچ و پبلیکیشن کے چیف رہے۔ کئی سال پبلک اسکول حیدرآباد کے سربراہ کی حیثیت سے کام کیا اور اسکول کی تنظیم کی۔ کچھ عرصہ مکہ اور شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ میں بحیثیت پروفیسر کام کیا۔ پھر مشیر برائے عالمی مرکز اسلامی تعلیم مکہ کی حیثیت سے تعیناتی ہو گئی۔ غرض پوری زندگی نہایت فعال رہے۔ اب کراچی میں قیام ہے۔

ویسے تو ڈاکٹر بلگرامی صاحب کبھی بھی دین بیزار نہیں رہے۔ ان کا انداز زندگی ہمیشہ اسلامی اور مشرقی رہا۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں جب پہلی بار حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی تو زندگی میں عظیم انقلاب رونما ہو گیا۔ خود فرماتے ہیں:

"مولائے کریم نے پہلی بار جب ۱۹۵۰ء میں زیارت حرمین شریفین اور فریضۂ حج کی سعادت نصیب فرمائی تو آستانۂ مقدسہ دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ہی دعا ۲۹ دن زبان پر رہی کہ "اے اللہ تو مجھے دین کی سمجھ عطا فرما" اس دعا کی مقبولیت کا ثمرہ تھا کہ وطن واپس آنے کے بعد کچھ عرصہ بعد ۵۶ء میں ایک عالم متبحر صاحبِ قلب بزرگ حضرت احمد عبدالصمد صاحب قبلہ فاروقی قادری چشتی سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ پہلی ہی بات جو آپ نے فرمائی یہ تھی کہ:

"انسان یا اکتسابِ فیض کرے یا ایصالِ فیض۔ اگر ان دونوں میں کچھ نہیں تو زندگی بیکار ہے"[۲]

---

[۱] تعارف قرآن (ڈاکٹر فیوض الرحمٰن) ص ۲۵۸

[۲] فیوض القرآن سعید کمپنی ایڈیشن جلد پنجم ص۔ ط

میں نے سمجھ لیا کہ اکتسابِ فیض کا وقت آ گیا۔ اور انھوں نے نہایت شفقت و محبت سے پانچ سال مجھے درس قرآن دیا۔ جب وہ یہ فریضہ ادا کر چکے اور جو میری قسمت میں تھا مجھے مل چکا تو ۱۹۶۳ء میں نہایت سکون اور جمعیت خاطر کے ساتھ اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔ وصال سے دو دن قبل میں ان کی خدمت میں دن بھر رہا اور نہ جانتا تھا کہ یہ شفیق استاد سے آخری ملاقات ہے۔

ان کے وصال کے تیسرے ہی دن مجھے پھر دیارِ بیکس پناہ میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اب میرے مضطرب قلب کے لیے کچھ تسکین کی ضرورت تھی۔ اس بار اس عزم کے ساتھ واپس کیا گیا کہ جو کچھ استادِ محترم سے ملا ہے وہ ضبطِ تحریر میں لے آؤں۔ یہ مشکل کام تھا۔ لیکن جہاں حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ التفات شاملِ حال ہو وہاں کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مجھے جامعہ اسلامیہ کی خدمات سپرد تھیں۔ اور اسی علمی اور ادبی ماحول میں بحمد اللہ پانچ ہی سال میں ترجمہ و تشریح کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ جامعہ کے جید علماء کرام نے مسودہ کو غور سے پڑھا اور ہر طرح میری اعانت اور حوصلہ افزائی فرمائی۔

کام ختم ہو چکا تھا لیکن دل کانپ رہا تھا کہ خدا جانے جو کچھ ضبطِ تحریر میں آیا وہ اس قابل بھی ہے کہ پیش کر سکوں۔ ایک قلبِ مضطرب کے لیے آستانۂ فیض و کرم میں حاضری کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ اسباب مہیا فرما دیے گئے اور مجھے طلب کر لیا گیا۔ اللہ اللہ کیا دلجوئی کیا کرم تھا کہ اس ناچیز کو روضۂ مبارک اور منبر شریف کے درمیان روضۂ مبارک سے قریب بیٹھنے، پڑھنے اور پیش کرنے

کی سعادت سے نوازا گیا۔ مجھے خود حیرت ہے کہ کس طرح روز ایک منزل مع ترجمہ و تفسیر کے پیش کرتا، کیسے آداب کو ملحوظ رکھ کر گھنٹوں بیٹھا رہتا اور کیسے ختم کرتا۔ ان کیفیات اور عنایات کو بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ البتہ آٹھویں دن سر سجدہ میں تھا اور خدا جانے اس نورانی ماحول میں اپنے رب سے کیا کہہ رہا تھا۔[1]

تفسیر کی تالیف و ترتیب کے بعد اس کی طباعت و اشاعت کا مرحلہ تھا۔ اتنی ضخیم جلدوں کو چھپوانا بھی آسان کام نہ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ مرحلہ بھی بحسن و خوبی طے کرا دیا۔ پہلی بار یہ تفسیر تین جلدوں میں لاہور سے شائع ہوئی۔ پھر الحاج محمد ذکی صاحب مالک ایجوکیشنل پریس کراچی نے اپنے ہاں سے دو جلدوں میں چھاپ دی اور اس طرح صوری و معنوی اعتبار سے ایک اعلیٰ پایہ کی چیز منظرِ عام پر آ گئی۔ چنانچہ مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی اپنے ارشاداتِ گرامی میں ان خوبیوں کی جانب ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"ماشاء اللہ حسن معنوی کے ساتھ حسن ظاہر سے بھی آراستہ ہے۔"[2]

اللہ تعالیٰ نے اس کو حسن قبول بھی عطا فرمایا۔ اور نہایت قلیل مدت میں اس کے کئی ایڈیشن نکل گئے۔ چنانچہ اس وقت جو نسخہ سامنے ہے وہ پانچواں ایڈیشن ہے۔ جو جمادی الآخر ۱۴۰۷ھ مطابق فروری ۱۹۸۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔

"فیوض القرآن" نہ صرف ان نوٹس کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر بلگرامی صاحب نے اپنے استاد احمد عبدالصمد صاحب فاروقی، قادری، چشتی کے درس کی

---

[1] فیوض القرآن سعید کمپنی ایڈیشن، جلد پنجم ص (۳۱۹)
[2] ایضاً ص ف

روشنی میں مرتب کیے تھے۔ بلکہ اس میں مختلف تفاسیر اور ترجموں سے بھی مواد حاصل کر کے شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حسنِ تالیف، زبان و بیان کی خوبیوں، صحتِ مضامین وغیرہ نے اردو تفاسیر میں اس کو ایک بلند مقام عطا کیا ہے۔ اس کی بعض خصوصیت کی جانب خود ڈاکٹر صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ترجمہ میں قرآن مجید کی تاثیر، اس کی معنویت و مقصد سے قریب لانے کے لیے قدیم مفسّرین کے انداز پر ترجمہ کے دوران جابجا چھوٹے چھوٹے مختصر مگر قرآنی مقصود کو نہایت وضاحت سے پیش کرنے والے جملے قوسین میں لکھے گیے ہیں، جگہ جگہ اس کی مختصر اور پُر اثر تشریح بھی ہے جو مستند تفاسیر پر مبنی ہے تاکہ ربطِ کلام باقی رہے۔ پڑھنے والے کی توجّہ قرآن کے مطالب پر مرکوز رہے اور کلام پاک کی ترتیب و تسلسل واضح ہوتا جائے۔ اسی طرح ایک آیت اور دوسری آیت کے ربط کو بھی دو آیات کے درمیان واضح کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ہر رکوع کے شروع میں اس کی خصوصی اہمیت اور گزشتہ رکوع سے اس کے ربط کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ ہر سورہ کے شروع میں ترتیب قرآنی میں سورت کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ایک سورہ کا ربط دوسرے سورہ سے واضح ہو جائے۔"[1]

"فیوض القرآن کو کئی جید علماء نے دیکھ کر پسند فرمایا اور اپنی آرا کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ حضرت مولانا پیر محمد کرم شاہ صاحب ازہری فرماتے ہیں،

---

[1] فیوض القرآن صفحہ ۷

"اس ترجمہ کا ہر جملہ موزوں، ہر فقرہ دلنشین، حشو وزائد سے یکسر پاک، مطالب و اسرار کا جامع۔ محترم ڈاکٹر بلگرامی صاحب نے قرآن کریم کے ان حقائق کو بے نقاب کر دیا ہے جو بہت کم کسی کو اپنے ہاں اذن باریابی دیتے ہیں۔ شریعت کا دامن بھی کہیں چھوٹنے نہیں پایا اور معرفت کے ان رموز و نکات کو بیان کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا جنھیں اب زمانہ کے شدید تقاضے پردہ کشائی پر مجبور کر رہے تھے۔ لیکن وہ اظہار کے لیے کسی محتاط اور سلیقہ مند قلم کے منتظر تھے۔"[1]

شیخ التفسیر، حضرت مولانا شمس الحق افغانی کا ارشاد گرامی ہے:

"صحتِ مضامین کے علاوہ اندازِ بیان اور اسلوبِ تعبیر ایسا اختیار کیا گیا ہے جو دورِ حاضر کے لیے موزوں اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کو متاثر کرنے والا ہے اور مشکل ترین مطالب کو آسان کر دینے والا ہے۔"[2]

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:

"اس اردو تفسیر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بلگرامی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے مستند بزرگوں کی تفسیر سے لیا ہے۔"[3]

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کا ارشاد گرامی ہے:

"زبان شگفتہ، تعبیر موثر، اسلوب جاذب، طباعت عمدہ، نستعلیق

---

۱ فیوض القرآن صفحہ م
۲ ایضاً صفحہ س
۳ ایضاً صفحہ ف

بہت خوبصورت، تشریح نہ اتنی طویل کہ طبیعت اکتا جائے نہ اتنی مختصر کہ تشنگی باقی رہے۔ ماخذ قابلِ اعتماد، سلف صالحین کی عقیدے کی پابندی۔ نہ آزادی نہ آزاد خیالی۔"[1]

نمونہ کے لیے سورہ فاتحہ کا ترجمہ اور تفسیر ذیل میں درج ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا (ہے)۔ (تمام تعریفیں قولی، فعلی، حالی اللہ ہی کے لیے ہیں۔ کہ جو کچھ ہے وہ اس کی شانِ ربوبیت کا مظہر ہے۔ ہر نعمت اور ہر چیز اور ہر کیفیت کا عطا کرنے والا وہی ہے۔ خواہ بلا واسطہ عطا فرمائے یا بالواسطہ)

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ بے حد مہربان، نہایت رحم والا (جو تعلق خالق کو مخلوق سے ہے وہ "رَحْمٰن" میں اور جو مخصوص محبت کرنے والوں سے ہے وہ "رَحِيْمِ" میں مضمر ہے۔ رحمٰن دنیا اور رحیم آخرت میں ہر دو صیغے مبالغے پر دال ہیں۔ ہر دو جگہ اس کی رحمت کارفرما ہے۔ اس کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے)

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ (وہی) روزِ جزا کا مالک ہے (تجلیات کے دن کا مالک ہے۔ "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ" اسی دن کے لیے ہے۔ وہاں اللہ ہی اللہ ہے)۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ (اے اللہ) ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ (تو ہمارا رب ہے ہم تیرے بندے ہیں۔ تیرے فرمانبردار ہیں، تیری مدد کے خواستگار ہیں۔ اللہ کی رحمٰنیت و رحیمیت دیکھو کہ بندے کو سکھا رہا ہے کہ تو جتلا کہ ہم تیری عبادت

---

۱ فیوض القرآن صفحہ ص

کرتے ہیں۔ اپنی قابلیت ایمان کو بتلا۔ اسی کو تقویت دے۔ دونوں "نَعبُدُ" و "نَستَعِینُ" کا صلہ مانگ۔

اس آیت میں "نَعبُدُکَ و نَستَعِینُکَ" کی جگہ اِیَّاکَ نَعبُدُ وَاِیَّاکَ نَستَعِینُ (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔) کہہ کر شرک کی جڑیں کاٹ دی گئی ہیں۔ ترجمہ میں تو دونوں جگہ "ہی" کا اضافہ کر کے اس نکتہ کو واضح کر دیا گیا ہے لیکن تفسیر میں بیان میں اتنا زور پیدا نہیں ہو سکا اس کی طرف قارئین کو خاص طور پر متوجہ کرنا ضروری تھا۔

تفسیر جواہر القرآن[1]

از

مولانا حسین علیؒ

تفسیر "جواہر القرآن" دراصل حضرت مولانا حسین علیؒ متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء کے تفسیری نکات پر مشتمل قرآنی معارف اور تفسیری فوائد کا بیش بہا خزینہ ہے۔ جس کی ترتیب و تدوین کا کام ان کے تلمیذ خاص حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ صاحب نے ابو احمد سجاد بخاری صاحب کی مدد سے انجام دیا۔

حضرت مولانا حسین علیؒ کا تعلق ضلع میانوالی کے ایک گاؤں واں بھچراں سے تھا۔ انھوں نے اپنے آبائی گاؤں سے چار میل دور اپنی زرعی زمینوں پر فروکش ہو کر زندگی بھر کھیتی باڑی کا کام کیا اور اسی کو اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے ذریعہ معاش بنایا۔ عمر بھر کسی نے ایک پائی کا سوال نہیں کیا اور ساٹھ برس تک جنگل میں رہ کر توحید و سنت اور علوم دین کی لِوَجہِ اللہ اشاعت

---

[1] تفسیر جواہر القرآن۔ از افادات حضرۃ مولانا حسین علی رحمۃ اللہ مرتبہ شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان رحمۃ اللہ۔ شائع کردہ کتب خانہ رشیدیہ، مدینہ مارکیٹ۔ راولپنڈی۔ ۱۳۹۹ھ

کی اور دمِ آخر تک چشمۂ فیض جاری رکھا۔

حضرت مولانا حسین علیؒ علم قرآن میں صرف تین واسطوں سے حضرت امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ المتوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی (ف ۱۳۰۲ھ) سے فیض حاصل کیا تھا۔ وہ حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ (ف ۱۲۶۲ھ) کے تلمیذ تھے اور شاہ صاحب اپنے نانا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (ف ۱۲۲۹ھ) کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے علمی مرتبہ اور دینی خدمات سے کون واقف نہیں ہے۔ آج برِّ صغیر میں دینی علوم خصوصاً علوم قرآنی، حدیث و تفسیر کی جو سلسبیل جاری ہے وہ کلیتاً ان ہی دونوں بزرگوں کا فیضان ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے قرآنی علوم و معارف حضرت مولانا حسین علی صاحب کو اپنے شیوخ کے وساطت سے وراثت میں ملے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیت اور فہم و فراست کو کام میں لا کر بہت کچھ حاصل کیا۔ انھوں نے اکلِ حلال اور صدقِ مقال کو اپنا شعار بنایا اور اتباع شریعت اور تقویٰ کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر قرآنی اسرار و رموز کی مزید راہیں کھول دیں اور قرآن فہمی میں ان کو ایسی بصیرت اور ایسا ملکہ عطا فرمایا جو ان کے کسی معاصر کو حاصل نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے حضرت مولانا حسین علیؒ کو قرآن کی معنوی تحریف کے اس دور میں محض قرآن کی خدمت و حمایت کے لیے پیدا فرمایا تھا۔ جن باتوں کا وہ تفسیر میں خاص خیال فرماتے تھے ان میں سے چند ذیل میں درج ہیں۔

(۱) ہر سورت کا ایک محور اور مرکزی موضوع ہوتا ہے اور سورت کی باقی آیات بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کے گرد گھومتی ہیں۔

(۲) سورتوں کی ترتیب اتفاقی یا اجتہادی نہیں بلکہ توفیقی ہے اور ہر سورت اپنے ماقبل و مابعد کے ساتھ باقاعدہ مربوط ہے۔ اسی طرح ہر سورت کی آیات بھی سلسلۂ نظم وضبط میں منسلک ہیں۔

(۳) آیات کا وہی مفہوم راجح ہوگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم سے بسند صحیح منقول ہو۔

(۴) حتی المقدور آیت کا ایسا مطلب بیان کیا جائے جس میں حذف و تقدیر کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

(۵) حتی الوسع آیت کا ایسا مفہوم بیان کیا جائے جس پر سرے سے کوئی خارجی اعتراض اور شبہ وارد ہی نہ ہو۔

حضرت مولانا حسین علیؒ کا سب سے زیادہ زور توحید پر ہے۔ وہ اس معاملہ میں کسی ایچ پیچ یا مداہنت کے قطعاً روادار نہیں تھے۔ شرک و بدعت کے خلاف تیغ بے نیام تھے۔ اس وقت جبکہ ان کے اردگرد پیروں، سجادہ نشینوں اور بدعتیوں کا زور تھا اور بہت کم لوگوں کو ان کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت ہوتی تھی، انھوں نے نہایت دلیری سے ان سب کا مقابلہ کیا، نتیجہ یہ کہ وہ نہ صرف شدت پسند مشہور ہوگئے بلکہ وہابی کے لقب سے نوازے گئے۔ لیکن انھوں نے کسی کی پروا نہیں کی اور اعلانیہ ان سب کی مخالفت کی۔ ان کی تفسیر میں بھی سب سے زیادہ زور توحید پر ہے جس کی وجہ سے جہاں بدعتی اور پیر پرست ان کی مخالفت پر کمربستہ رہے وہاں علمائے حق نے ان کی تعظیم وتکریم میں کوتاہی نہیں کی۔ بلکہ دل کھول کر آپ کے کاموں کی تعریف کی اور آپ کی حق پرستی کو سراہا۔ چنانچہ ایک دفعہ مفسر قرآن حضرت مولینا احمد علیؒ لاہوری نے فرمایا:

"حضرت مولینا حسین علی رحمۃ اللہ تعالیٰ بہت بلند پایہ انسان

تھے۔ وہ فانی التوحید تھے اور قرآن مجید کے حرکات وسکنات سے بھی اللہ تعالیٰ کی توحید ثابت کرتے تھے۔"

شیخ التفسیر حضرت مولینا احمد علی لاہوری کے صاحبزادے اور جانشین مولانا عبید اللہ انور ایک مرتبہ مری جاتے ہوئے دارالعلوم راولپنڈی میں تھوڑی دیر کے لیے تشریف لائے تو انھوں نے اپنے والد بزرگوار کا یہ قول بیان فرمایا:

"انجمن خدام الدین کے جلسوں میں، میں دیگر علمائے کرام کو اس لیے بلاتا ہوں تاکہ عوام ان سے مستفید ہوں لیکن حضرت مولینا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ اور مولانا حسین علیؒ کو اس لیے بلاتا ہوں تاکہ علمائے کرام ان سے استفادہ کریں۔"

چونکہ حضرت مولینا حسین علی رحمۃ علیہ کا پورا زور توحید پر تھا اور شرک جلی یا خفی کو وہ کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تفسیر کا انداز دکھانے کے لیے اِیَّاکَ نَعْبُدُ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی جو تفسیر انھوں نے بیان کی ہے اس کا کچھ حصہ یہاں پیش کردیا جائے۔ لکھتے ہیں:

تفسیر: سورۂ فاتحہ میں یہ آیت مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں اِیَّاکَ مفعول کو نَعْبُدُ فعل پر مقدم کیا گیا ہے تاکہ حصر کا فائدہ دے اور مطلب یہ ہو کہ عبادت صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے اور اس کے سوا کسی پیغمبر، فرشتہ یا ولی کی عبادت اور پکار نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ وہ سارے خود اللہ کے حکم سے اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ اسی طرح اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں فائدہ حصر کے لیے مفعول کو فعل پر مقدم کیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ

مدد صرف اللہ ہی سے مانگنی چاہیے۔ اور اس کے سوا کسی پیر یا
پیغمبر سے اور کسی فرشتہ یا ولی سے مافوق الاسباب امور میں
مدد نہیں مانگنی چاہیے۔ امام ابن کثیر بعض بزرگوں سے نقل
فرماتے ہیں کہ سارے قرآن کا مرکزی حصہ سورہ فاتحہ ہے۔ اور
سورہ فاتحہ کا مرکزی حصہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ہے۔
وہ لکھتے ہیں، اَلْفَاتِحَةُ سِرُّ الْقُرْاٰنِ وَسِرُّهَا هٰذِهِ الْكَلِمَةُ
(اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) ۔ (ابن کثیر ص ۲۵ جلد ۱)۔

حضرت مولانا حسین علیؒ کا ارشاد ہے کہ عبادت کے مفہوم میں دو چیزیں
داخل ہیں ایک غایت تذلل یعنی انتہائی عاجزی اور ذلت دوم غایت تعظیم۔
لیکن اس اعتقاد اور شعور کے ساتھ کہ معبود کو غائبانہ تصرف اور قدرت
حاصل ہے جس سے وہ نفع نقصان پر قادر ہے۔ کیونکہ معبود صرف وہی ہو سکتا
ہے جس میں دو صفتیں موجود ہوں (۱) یہ کہ وہ عالم الغیب ہو، کائنات کا
ذرہ ذرہ اس پر منکشف ہو اور زمین و آسمان کی ساری مخلوق کے ظاہر و باطن
و سر و اعلانیہ کو وہ اچھی طرح جانتا ہو (۲) یہ کہ وہ مالک و مختار متصرف
فی الامور اور اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں
اپنے لیے استحقاق عبادت کو پکار کر ذکر فرمایا ہے وہاں اپنی انہی دونوں صفتوں
کو اس کی علت قرار دیا ہے۔ اور جہاں کہیں غیر اللہ سے عبادت و پکار کی نفی
کی ہے وہاں غیر سے دونوں صفتوں کی نفی فرمائی ہے۔ کہیں دونوں صفتوں کی
نفی ہے اور کہیں صرف ایک کی۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے رَبُّكَ يَخْلُقُ ...
..... اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (قصص ۶۸ تا ۷۰)

اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔ یہاں بھی مفعول کو فعل پر اس لیے مقدم کیا تا کہ
حصر کا فائدہ حاصل ہو۔ مطلب یہ کہ جس طرح عبادت صرف اللہ ہی کے لیے

ہونی چاہیے اسی طرح استعانت (مدد طلب کرنا) بھی صرف اسی سے ہونا
چاہیے۔ نہ کسی اور سے۔ استعانت (یعنی حاجات و مشکلات میں پکارنا
اور مدد مانگنا) چونکہ عبادت کی سب سے بڑی اور اہم شاخ ہے اس لیے
عبادت کے بعد خصوصیت سے اس کا ذکر فرمایا۔ ہر آدمی جو کسی معبود کی عبادت
کرتا ہے دنیوی زندگی کے اعتبار سے اس کی عبادت کا مقصد اور لب لباب
یہی ہوتا ہے کہ اس کی تمام حاجتیں پوری ہو جائیں اور اس کی تمام مشکلیں آسان
ہو جائیں۔ اسی لیے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دعا (پکار)
عبادت کا مغز اور لب لباب ہے۔ اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ۔ اور ایک روایت
میں ہے کہ اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ ۔ یعنی پکارنا ہی اصل عبادت ہے۔ قرآن
مجید میں بھی لفظ عبادت بمعنی دعاء اور پکار وارد ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد
ہے وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ
عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ع (المومن ع ۷ - ۶)

تفسیری حاشیہ قرآن [۱]

مولانا احمد علی لاہوری

یہ حاشیہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر کیا ہے۔
اردو زبان میں قرآن کریم کی تفسیر لکھنے والوں کی برصغیر میں ایک بڑی جماعت
دکھائی دیتی ہے لیکن یہ اعزاز صرف ان ہی کو حاصل ہے کہ مفسران کے نام کا
جزو لاینفک بن گیا ہے۔
مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے قرآنی تعلیم اتنے بڑے

[۱] اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ مترجم و محشی ۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) شائع کردہ ناظم
شعبہ تالیف و اشاعت انجمن خدام الدین۔ دروازہ شیرانوالہ۔ لاہور۔

پیمانہ پردی کہ برِصغیر کا کوئی گوشہ ان کے فیض سے محروم اور خالی نہیں رہا۔
وہ ۲ر رمضان المبارک ۱۳۰۴ھ مطابق ۲۷ر مئی ۱۸۸۷ء کو جمعہ کے دن قصبہ
جلال ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ والد محترم کا اسم گرامی شیخ حبیب اللہ تھا
جو سلسلۂ چشتیہ میں بیعت تھے۔

حضرت مولانا احمد علیؒ نے مولانا عبدالحق اور مولانا عبیداللہ سندھی سے
دینی تعلیم حاصل کی۔ جب تعلیم سے فارغ ہو گئے تو مولانا عبیداللہ سندھی
ان کو اپنے ہمراہ دہلی لے گئے اور وہاں اپنی جانشینی کی سند عطا کی۔ ۱۹۱۷ء میں
دہلی سے واپسی ہوئی تو بیرون شیراں والہ میں سکونت پذیر ہو گئے اور مسجد
سبحان خاں میں درس قرآن شروع کیا۔ ۱۹۲۱ء میں ہجرت کر کے کابل چلے گئے
لیکن کچھ عرصہ بعد وہاں سے واپس آ گئے اور پھر درس و تدریس میں مصروف
ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں انجمن خدام الدین کی بنیاد رکھی اور ۱۹۲۴ء میں مدرسہ
قاسم العلوم قائم کیا۔

قرآن کریم کی تفسیر بیان کرنے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو وہ
ملکہ عطا کیا تھا کہ نہ صرف برصغیر کے مختلف حصوں سے بلکہ بیرونی ممالک سے
طلبہ فیض حاصل کرنے کے لیے لاہور آتے تھے۔ یہاں تک کہ دارالعلوم
دیوبند سے فراغت کے بعد علماء مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے اور
ماہِ رمضان میں دورہ تفسیر پڑھ کر سند حاصل کرتے۔ تقریباً چار پانچ
ہزار طلبہ اور علماء نے حضرت مولانا سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ درس و تدریس
اور اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ انھوں نے جنگ آزادی میں بھی بڑھ چڑھ
کر حصہ لیا اور اس سلسلہ میں سات مرتبہ قیدِ فرنگ کی صعوبات برداشت
کیں۔ ۱۷ر رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۳ر فروری ۱۹۶۳ء کو داعی اجل
کو لبیک کہا۔

حضرت مولانا احمد علیؒ کا شمار علماء حق کے علاوہ شیوخ طریقت میں بھی
ہوتا ہے۔ وہ علم و حکمت کے بلند مقام پر فائز تھے۔ اس کے باوجود سادگی
و فروتنی کا ایک ایسا نمونہ تھے کہ کسی کو بھی آپ کے مرتبہ عالی کا اندازہ نہیں
ہوتا تھا۔ اسی سادگی کی وجہ سے ایک مرتبہ مولانا اشرف علی تھانوی بھی آپ کو
پہچاننے میں دھوکا کھا گئے۔

واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت مولانا پہلی دفعہ مولانا
اشرف علیؒ سے ملاقات کرنے کے لیے تھانہ بھون گئے تو چونکہ جمعہ کا دن تھا
اور ریل گاڑی تقریباً ساڑھے بارہ بجے دوپہر میں تھانہ بھون پہنچتی تھی
اس لیے آپ سیدھے مسجد پیر محمد والی میں جہاں حضرت مولانا تھانوی نماز
جمعہ پڑھاتے تھے، پہنچ گئے اور جماعت میں شریک ہو گئے۔ آپ کا خیال تھا
کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد مسجد میں ملاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ نماز
سے فراغت کے بعد آپ صحنِ مسجد میں کھڑے ہو گئے اور جب مولانا مسجد سے
باہر نکلنے لگے تو آپ نے آگے بڑھ کر مصافحہ کرنا چاہا۔ مولانا تھانوی صاحب
نے کبھی آپ کو دیکھا نہیں تھا اور قاعدہ قرینہ کی بڑی سختی سے پابندی کرتے
تھے اس لیے ذرا سخت لہجہ میں کہا "دیہاتی کہیں کا، یہ کوئی طریقہ ہے ملاقات
کرنے کا۔ ادب آداب سے بالکل بے بہرہ معلوم ہوتا ہے۔" مولانا احمد علیؒ
وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔ ایک صاحب نے جو مولانا تھانوی کے ساتھ تھے اور
آپ کو پہچانتے تھے چپکے سے کہا کہ "یہ مفسر قرآن مولانا احمد علی لاہوری ہیں۔"
یہ سنا تو مولانا تھانوی زیرِ لب مسکرائے اور کہنے لگے "چلو تبلیغ ہو گئی۔"
اس کے بعد نہایت تپاک سے ملاقات کی اور آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کیا۔

حضرت مولانا احمد علی کے اخلاق و عادات اور علم و فضل کی بہت سے
لوگوں نے تعریف کی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری جو اپنے شہرۂ آفاق
قرآن، اصلاحِ عقائد کے عظیم الشان کام موثر و مقبول مواعظ
اور مخلصانہ دینی خدمتوں کی بناء پر پاکستان میں مقبولِ عام و
خاص تھے۔ اپنے زمانہ کے بہت بڑے شیوخ طریقت میں سے
تھے۔ قوت نسبت باطنی ادراک اور روشن ضمیری میں اس زمانہ
میں بڑے بڑے لوگ آتے رہیں گے۔ مگر احمد علی کم پیدا ہوں گے۔"

ڈاکٹر قاری فیوض الرحمٰن تحریر فرماتے ہیں:

"شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے ۲۰ ویں
صدی میں اسلام کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ انھوں نے تفسیر قرآن
کا درس بھی دیا اور تزکیہ قلوب کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ ان کے
تلامذہ اور متعلقین پاکستان اور بیرونِ ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
اور اعلیٰ علمی و روحانی خدمات انجام دے رہے ہیں۔"

مولانا اعجاز الحق قدوسی رقم طراز ہیں:

مولانا نے سندھ و پنجاب میں جو اسلام کی خدمات انجام دیں ان میں
اشاعتِ توحید، عشقِ رسول کریم، اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم اور اصلاحِ رسوم کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔"

مولانا سید ابوالحسن ندوی کا ارشاد ہے:

"پھر یہاں لاہور آکر مولانا احمد علی صاحبؒ سے قرآن مجید پورا
پڑھا۔ یہاں جس چیز نے متاثر کیا وہ ان کی قرآنی زندگی تھی۔
جس کو قرآن ناطق کہا جاتا ہے۔ اس سے قلب میں جلا محسوس
ہوتی تھی۔ مولانا کی زاہدانہ زندگی، درویشانہ معاشرت اور
عمل بالسنت کا مجھ پر وہ اثر پڑا جس کو برکت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔"

حضرت مولانا احمد علیؒ کا مترجم اور محشی قرآن مجید انجمن خدام الدین
لاہور کی طرف سے پہلی بار ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اب تک اسکے
کئی ایڈیشن نہایت خوبصورتی سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس ترجمہ کی خصوصیات
میں سے عام فہم زبان میں اردو ترجمہ، ربط آیات اور آیات و رکوع کے خلاصے
امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ کئی جید علماء نے اس پر شاندار تقریظیں لکھی ہیں۔
ان میں قابلِ ذکر حضرات یہ ہیں۔ امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا
سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا مفتی کفایت اللہؒ، مولانا قاری محمد شریف لکھتے ہیں:

"یہ حاشیہ قرآن پاک کی تفسیر ہے۔ مولانا مرحوم کو تفسیر قرآن پڑھانے
کا جو ملکہ تھا اس سے علماء بخوبی واقف ہیں۔ ناظرین اس سے
اندازہ کر سکتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر علماء مولانا
کی خدمت میں حاضر ہوتے اور رمضان المبارک میں دورۂ تفسیر
پڑھ کر سند لے کر جاتے تھے۔"

عبدالواحد سندھی تحریر فرماتے ہیں:

"لاہور میں ایک اور انجمن ہے جس کا نام خدام الدین ہے۔ اس
انجمن کا سب سے بڑا کام مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم دینا ہے۔ اس
انجمن نے قرآن پاک کا ایک ترجمہ اردو میں نہایت صحیح اور سلیس
چھاپا ہے۔"

غرض حضرت مولانا احمد علیؒ لاہوری نے تعلیماتِ قرآن کی اشاعت اور اسکے
مطابق عمل کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ علامہ علاؤ الدین صدیقی کا
یہ کہنا بجا اور درست ہے کہ:

"خدمتِ قرآن کے اعتبار سے اس زمانہ میں شاید کسی بزرگ نے
اتنی شہرت پائی۔ استاذی کی شہرت علم و عمل، اقتضائے علم میں

پھیلی ہے۔"

یہاں نمونہ کے لیے سورۃ والضحیٰ اور سورۃ اَلَمْ نَشْرَحْ کا ترجمہ، تفسیر اور دونوں سورتوں کا ربط بیان کیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اختصار کے باوجود مفسرِ علام نے ہر بات کو کس خوبی سے واضح کر دیا ہے۔ پہلے ترجمہ پھر خلاصہ اور تفسیری حواشی۔ بعدہٗ موضح القرآن کی پیش کردہ صراحت اور پھر دونوں سورتوں کے درمیان ربط۔ ان سب باتوں کو دیکھ کر ہر قاری سمجھ سکتا ہے کہ قرآن کریم ایک ایسی ہستی کا کلام ہے جو ہر چیز کے مَالَہٗ وَمَا عَلَیْہِ سے باخبر ہے۔ انسانی نفسیات اس سے پوشیدہ نہیں۔ اس کا کلام ایجاز و اختصار کا بہتر نمونہ ہے۔ اس کلام کو اتنے اختصار کے باوجود مبہم یا ناقابلِ فہم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ معنویت و جامعیت کے ساتھ ساتھ اس میں علم و حکمت کا ایک خزانہ موجود ہے۔ جو ان کو ملتا ہے جن کو اس کی طلب اور تلاش ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ آیات اور سورتوں میں کہیں بے ربطی نہیں۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام سورتیں موتیوں کی لڑیاں ہیں جو ایک دوسرے سے نہایت مضبوطی سے جڑی ہوئی ہیں۔ اب ان تمام خوبیوں کا جلوہ ان دو سورتوں میں دیکھیے۔

جو باتیں ان سورتوں میں بیان کی گئی ہیں ان کی بنیاد فترۃِ وحی پر ہے۔ چند روز تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول نہیں ہوا۔ کفار نے طعن و تشنیع شروع کر دی اور کہنے لگے کہ "دیکھ لیا، ان کی پیغمبری کا سلسلہ ختم ہوا۔ اب اللہ نے بھی ان کو چھوڑ دیا۔" آپ بسی قدر دل گرفتہ ہوئے۔ اس پر باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾ (۹۳ ـ ۳۰)

ترجمہ: قسم دھوپ چڑھتے وقت کی اور رات کی جب چھپ جاوے

نہ رخصت کیا تجھ کو تیرے رب نے۔ نہ بیزار ہوا ف ۱ جگہ دی ف ۲ اور پایا تجھ کو بھٹکتا۔ پھر راہ دی ف ۳ اور پایا تجھ کو مفلس۔ پھر محفوظ کیا ف ۴ سو جو یتیم ہو اس کو نہ دبا۔ اور جو مانگتا ہو اس کو نہ جھڑک۔ اور جو احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر۔

خلاصہ: زمانہ فِتْرَۃُ الْوَحِیْ قوائے ایمانیہ کے لیے موجبِ تکمیل ہے۔ ماخذ۔ آیت ۱، ۲، ۳، ۴۔

تفسیری حاشیہ: (۱، ۲) یہ چیزیں (یعنی دھوپ چڑھنے وقت کی اور رات) اس امر پر گواہ ہیں (۳) کہ آپ کے رب نے نہ آپ کو چھوڑا ہے اور نہ بیزار ہی ہوا ہے۔ (۴) وحی بند ہونے کے بعد دوبارہ جب وحی نازل ہوگی تو (وہ حالت) آپ کے لیے پہلے سے بہتر ہوگی۔ (۵) آپ کو اللہ تعالیٰ اجر عطا فرمائے گا۔ تب آپ بڑے خوش ہوں گے۔ (۶ تا ۸) کیا ان مصائب میں اللہ تعالیٰ نے پہلے کبھی آپ کا ساتھ چھوڑا (ہرگز نہیں)۔ (۹، ۱۰) فِتْرَۃُ الْوَحِیْ کے وقت ان مساکین کی خدمت کیجیے۔ واللہ عالم (۱۱) اور نعمت رب (یعنی قرآن) انہیں پڑھائیے۔ واللہ عالم۔

موضح القرآن: (ف ۱) حضرت کو کئی دن وحی نہ آئی۔ دل مکدر رہا۔ تہجد کو نہ اٹھے۔ کافروں نے کہا۔ اس کو چھوڑ دیا اس کے رب نے۔ پھر یہ نازل ہوا۔ پہلے قسم فرمائی دھوپ روشن کی اور رات اندھیری کی۔ یعنی ظاہر میں بھی اللہ کی دو قدرتیں ہیں اور باطن میں بھی۔ کبھی چاندنا ہے کبھی اندھیرا ہے۔ دونوں اللہ کے ہیں۔ اللہ سے دور کبھی نہیں۔ ف ۲ حضرت کا باپ مر گیا۔ پیٹ میں چھوڑ کر۔ دادا نے

پالا۔ وہ مرگیا آٹھ برس کا چھوڑ کر۔ چچا نے پالا جب تک جوان ہوئے۔

ف ۳ جب حضرت جوان ہوئے قوم کی رسم وراہ سے بیزار تھے۔ اور اپنے پاس کوئی رسم وراہ نہ تھی۔ اللہ نے دینِ حق نازل کیا۔

ف ۴ حضرت خدیجہ اپنی بھی قوم میں اشرف تھیں اور مالداروں سے نکاح ہوا۔ سب مال انھوں نے حاضر کیا۔

ربطِ آیات۔ سُوْرَۃُ الَمْ نَشْرَحْ۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ...... وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝

(۳۰ - ۹۴)

ترجمہ: کیا ہم نے نہیں کھول دیا تیرا سینہ ...... اور اپنے رب کی طرف دل لگا۔

تفسیر حاشیہ: (۱) اللہ تعالیٰ آپ سے (خدانخواستہ) بیزار کیسے ہو۔ بلکہ اس نے تو آپ کو شرحِ صدر فرمائی ہے (۲ و ۳) اور علاوہ اس کے یہ انعام بھی کیا کہ اصلاحِ امت کے لیے جس قانون کی ضرورت تھی وہ عطا فرما کر آپ کا بوجھ اتار دیا (۴) اور آپ کا ذکرِ خیر شرطِ ایمان میں سے ہے۔ (۵ و ۶) آپ نہ گھبرائیں۔ عسر کے بعد یسر لازمی ہے (۷-۸) تبلیغِ رسالت سے فراغت کے وقت یہ کام کیا کیجیے۔

ترجمان القرآن[1]

مولانا ابوالکلام آزاد

ضروری تفسیر کے ساتھ اردو زبان میں یہ قرآن حکیم کے مطالب کا مجموعہ

---

[1] ترجمان القرآن جلد اوّل (سورہ فاتحہ سے سورہ انعام تک) از مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ۔ اسلامی اکادمی۔ اردو بازار۔ لاہور۔

پورا مجموعہ تین جلدوں میں منقسم ہے۔ پہلی دو جلدیں مولانا ابوالکلام آزاد کے غور وفکر کا نتیجہ ہیں جوان کی زندگی ہی میں مرتب ومدون ہوکر منظرِ عام پر آچکی تھیں۔ تیسری جلد ان کے معتقدین مولانا غلام رسول مہر وغیرہ نے مولانا کا غیر مرتب وغیر مطبوعہ مواد ان کے بعد جمع کرکے ترتیب دی اور شائع کی۔ لیکن بغور مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ اس تیسری جلد میں وہ بات نہیں ہے جو پہلی اور دوسری جلدوں کا وصفِ خاص ہے۔ کاش جلد سوم بھی خود مولانا شائع کر جاتے کہ پہلی دو جلدوں کی طرح یہ بھی ایک منفرد شے اردو زبان میں ہوتی۔ لیکن مولانا نے جلد اوّل کے شروع میں جو پیش لفظ شامل کیا ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جن حالات میں وہ یہ کام کر گئے وہ بھی کرامت اور معجزہ سے کم نہیں۔ جن موانع اور رکاوٹوں سے دوچار ہونا پڑا وہ اتنے ہمت شکن تھے کہ اگر تائیدِ ایزدی شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ مواد بھی ضائع ہوجاتا۔ بہرحال اب بھی جو کچھ موجود ہے وہ اردو زبان میں دینی ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ مولانا آزاد کی ہوئی بائیس سیپاروں بالخصوص سورہ فاتحہ کی تفسیر قرآن کریم کے مطالب ومعانی کا بے بہا گنجینہ ہونے کے علاوہ ادبِ عالیہ میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اردو تفاسیر میں اس کا مقام کافی بلند ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد، رواں صدی کی نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے ایک تھے۔ ۱۷ اگست ۱۸۸۸ء میں مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں رسمِ بسم اللہ ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بلد الامین میں رہتے ہوئے حاصل کی۔ ۱۸۹۸ء میں ہندوستان آئے اور اسی وقت سے شاعری کا آغاز ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں شادی ہوگئی۔ اسی سال ہفتہ وار المصباح جاری کیا۔ ۱۹۰۳ء میں درس نظامی کی تکمیل کی۔ اس کے بعد سے باقاعدہ صحافتی اور سیاسی

زندگی کا آغاز ہوا۔ اتنی کم عمر میں ان کی ان سرگرمیوں کو دیکھ کر لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ نومبر ۱۹۰۳ء میں جب انھوں نے ماہنامہ "لسان الصدق" جاری کیا تو خواجہ الطاف حسین حالی جیسے کہنہ مشق مصنف اس کو دیکھ کر بید متاثر ہوئے اور جب ۱۹۰۴ء میں وہ مولانا آزاد سے ملے تو ان کو ابوالکلام کا بیٹا سمجھ کر ان کی خیریت دریافت کرنے لگے۔ لیکن جب انھیں بتایا گیا کہ وہ خود ابوالکلام آزاد ہیں تو انھیں یقین نہ آیا۔ اسی طرح مولانا شبلی کے ساتھ ہوا۔ ان سے خط وکتابت تو ۱۹۰۲ء سے جاری تھی۔ لیکن پہلی مرتبہ ملاقات ۱۹۰۴ء میں بمبئی میں ہوئی۔ مولانا شبلی نے بھی یہی سمجھا کہ یہ ابوالکلام آزاد کے بیٹے ہیں۔ چنانچہ کہنے لگے، "آپ کے باپ کے فضل وکمال کے کیا کہنے ہیں"۔ مگر جب پتہ چلا کہ یہ خود ابوالکلام ہیں تو حیران رہ گئے۔

۱۹۱۲ء میں الہلال جاری ہوا تو پورے ملک میں مولانا کی دھاک بیٹھ گئی۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کے بعد الہلال بند ہو گیا اور ۱۹۱۵ء میں "البلاغ" جاری ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں حکومت کے خلاف مضامین لکھنے کی وجہ سے مولانا کو بنگال سے نکال دیا گیا اور "البلاغ" بھی بند کر دیا گیا۔ مولانا رانچی چلے گئے اور وہیں نظر بند ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی سرگرمیاں اتنی بڑھیں کہ کئی مرتبہ وہ اسیر فرنگ رہے۔ آخری مرتبہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء کے آخر تک احمد نگر کے قلعہ میں قید رہے۔ کئی بار انڈین نیشنل کانگریس کے صدر چنے گئے۔ آزادیٔ ہند کے بعد وہ بھارتی کابینہ میں بحیثیت وزیر تعلیم کام کرتے رہے۔ آخر کار ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور جامع مسجد دہلی کے سامنے اردو پارک میں دفن ہوئے۔[1]

---

[1] غبارِ خاطر، مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ۔ ۱۲۲ اے۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ صفحات ۲۸ ۔ ۳۴

مولانا ابوالکلام آزاد کو قدرت نے دل و دماغ کی جو خوبیاں اور صلاحیتیں عطا کی تھیں وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ علم و ادب کا کون سا گوشہ تھا جو آپ کی دسترس میں نہ ہو۔ تمام علوم سے قطع نظر اگر ان کی قرآن فہمی کو دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ وہ اس بحر ناپید اکنار کے بھی بڑے اچھے شناور تھے۔ ساتھ ہی انھیں اردو تحریر پر بھی بڑی قدرت تھی۔ اپنی ان دونوں صلاحیتوں سے کام لے کر انھوں نے قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کرنے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ اس کا آغاز انھوں نے ۱۹۱۶ء میں کر دیا تھا لیکن ان کے اس ارادہ نے ۱۹۳۰ء میں عملی جامہ پہنا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

"۱۹۱۶ء میں جب "البلاغ" کے صفحات پر ترجمان القرآن اور تفسیر البیان کا اعلان کیا گیا تو میرے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک ایسے کام کا اعلان کر رہا ہوں جو پندرہ برس تک التواء و انتظار کی حالت میں معلق رہے گا۔ اور جو ملک کے شوق و انتظار کے لیے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ اور میرے ارادوں کی ناتمامیوں کے لیے ایک دردانگیز مثال ثابت ہوگا۔"

لیکن واقعات کی رفتار نے بہت جلد بتلا دیا کہ صورت حال ایسی ہی تھی۔ لکھتے ہیں

"۱۹۱۵ء میں جب میں نے اس کام کا ارادہ کیا تو بہ یک وقت تین چیزیں پیشِ نظر تھیں۔ ترجمہ، تفسیر اور مقدمہ۔ تفسیر میں میں نے خیال کیا تھا کہ یہ تین کتابیں قرآن کے فہم و مطالعہ کی تین مختلف صورتیں پوری کریں گی۔ عام تعلیم کے لیے ترجمہ، مطالعہ کے لیے تفسیر، اہلِ علم ونظر کے لیے مقدمہ۔

"البلاغ میں جب ترجمہ اور تفسیر کی اشاعت کا اعلان کیا گیا ہے تو ترجمہ پانچ پاروں تک پہنچ چکا تھا۔ تفسیر سورہ آل عمران تک مکمل ہو چکی تھی۔ اور مقدمہ یادداشتوں کی شکل میں قلمبند تھا۔ اس خیال سے کہ تھوڑے وقت کے اندر زیادہ سے

زیادہ کام انجام پا جائے۔ میں نے تصنیف کے ساتھ چھپائی کا سلسلہ بھی جاری کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح سال بھر کے اندر ترجمہ مکمل بھی ہو جائے گا اور چھپ بھی جائے گا۔ نیز تفسیر کی بھی کم از کم پہلی جلد شائع ہو جائے گی۔ ہر سات دن کی مشغولیت میں نے یوں تقسیم کر دی تھی کہ تین دن البلاغ کی ترتیب میں صرف کرتا تھا۔ دو دن ترجمے میں اور دو دن تفسیر میں۔[1]

بہر حال اس وقت کی مہربان حکومت کی دراندازیوں کی بدولت پندرہ سال کی مدت اسی طرح گزر گئی۔ اور خدا خدا کر کے ۱۹۳۰ء میں پہلی جلد شائع ہو سکی۔ اس سلسلہ میں مولانا فرماتے ہیں:

"بہر حال کام شروع ہو گیا۔ اور اس خیال سے کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر ترجمہ کے لیے بھی ضروری تھی، سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر ترجمہ کی ترتیب شروع کی۔ حالات اب بھی موافق نہ تھے۔ صحت روز بروز کمزور ہو رہی تھی۔ سیاسی مشغولیت کی آلودگیاں بدستور خلل انداز تھیں۔ تاہم کام کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا۔ اور ۲۰ جولائی ۱۹۳۰ء کو آخری سورت کے ترجمہ و ترتیب سے فارغ ہو گیا۔"

تا دست رسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم[2]

ویسے تو مولانا کا کیا ہوا تمام ہی ترجمہ و تفسیر زبان و بیان اور صحت کے لحاظ سے گرانقدر ہے۔ تاہم سورہ فاتحہ کی تفسیر اپنی ادبی لطافتوں کی وجہ سے اردو زبان کا ادب پارہ اور خاصہ کی چیز ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مولانا نے آیۃ

۱؎ ترجمان القرآن جلد اول صفحات ۳، ۴

۲؎ ترجمان القرآن جلد اول ص ۸

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ ایمان میں پختگی پیدا کرنے اور توحید پر یقین کو کمال تک پہنچانے میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ البتہ مختصر ترجمہ اور تشریح میں اس کو شامل کیا ہے اور چند الفاظ میں اس آیت کی روح پیش کر دی ہے۔ یہاں نمونہ کے لیے اسی کو نقل کیا جاتا ہے۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ...... صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ (۱-۷)

(ترجمہ و تشریح:) ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے۔ جو رحمت والا ہے اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالا مال کر رہی ہے۔ جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا۔ خدایا! ہم صرف تیری بندگی کرتے ہیں اور صرف تو ہی ہے جس سے اپنی ساری احتیاجوں میں مدد مانگتے ہیں۔ (خدایا!) ہم پر (سعادت کی) سیدھی راہ کھول دے۔ وہ راہ جو ان لوگوں کی راہ ہوئی جن پر تو نے انعام کیا۔ ان کی نہیں جو پھٹکارے گئے۔ اور نہ ان کی جو راہ سے بھٹک گئے۔[1]

تفہیم القرآن[2]

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ تفسیر جو چھ ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے جماعت اسلامی کے بانی سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کی لکھی ہوئی ہے۔ کچھ لوگ اس کے مداح ہیں اور کچھ سخت مخالف۔ جو مداح

۱؎ ترجمان القرآن جلد اول ص ۲۲۶

۲؎ تفہیم القرآن جلد اول تا ششم، مکتبہ تعمیر انسانیت۔ لاہور

ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ تفسیر موجودہ دور کے انسانوں کے اعتراضات دور کرنے اور ان کو مطمئن کرنے کے لیے جدید انداز سے لکھی گئی ہے اور اس لیے جدید نسل کو سکا قی اپیل کرتی ہے۔ جو مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ مولانا مودودی کسی دار العلوم کے فارغ التحصیل نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے نہ وہ عربی کے مزاج سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں اور نہ ان کا اپنا مزاج دینی ہے۔ اس لیے انھوں نے علماء دین اور سلف صالحین کی روش سے ہٹ کر اور جدت پسندی کو کام میں لاکر اپنی رائے سے یہ تفسیر لکھی ہے۔ اس لیے دین کی روح سے خالی ہے۔ ایسی صورت میں کسی غیر جانبدار کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں کن لوگوں کی رائے صحیح ہے۔ ہر چیز کے دو رخ ہوتے ہیں۔ یہ کلیہ اس معاملہ میں بھی کارفرما ہے۔ لہٰذا یہی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں فریق اپنے اپنے نقطۂ نظر سے صحیح ہیں۔ حق کس طرف ہے اس کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔

اس تفسیر کے محرکات کو جاننے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجمل طور پر مفسر کے حالاتِ زندگی بتادیے جائیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کا جدی وطن دہلی تھا۔ ان کے والد بزرگوار سید احمد حسن جو علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ اورنگ آباد (دکن) میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ وہیں ۳ رجب ۱۳۲۱ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء کو جمعہ کے دن مودودی صاحب کی ولادت ہوئی۔ چونکہ ان کا شجرۂ نسب چشتیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ خواجہ قطب الدین مودود چشتی سے ملتا ہے اس لیے ان بزرگ کی نسبت سے لفظ مودودی، نام کا ایک جزبن گیا۔ خاندان کے ایک اور بزرگ کے نام پر اصلی نام ابوالاعلیٰ قرار پایا۔ اور چونکہ ددھیال کی طرف سے سید تھے اس لیے پورا نام سید ابوالاعلیٰ مودودی ہوا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ریاست حیدرآباد کے نئے نظام تعلیم کے تحت مودودی صاحب نے محض ۱۴ سال کے سن میں مولوی کا امتحان دے کر یونیورسٹی سے میٹرک کی سند حاصل کی۔ مولوی کے نصاب میں میٹرک کے تمام مضامین کے ساتھ ساتھ عربی زبان، فقہ، حدیث اور منطق کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے حیدرآباد (دکن) میں دارالعلوم کالج کی جماعت مولوی عالم میں داخلہ لیا۔ لیکن ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ ان کے والد پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔ اور وہ اپنا سلسلۂ تعلیم ختم کرکے سب سے بڑے بھائی سید ابو محمد کے پاس بھوپال چلے گئے اور وہاں اپنے والد صاحب کی تیمارداری کرتے رہے۔ لیکن وہ اس مہلک مرض سے جانبر نہ ہوسکے اور ۱۹۲۰ء میں فوت ہوگئے۔

والد کے انتقال کے بعد مولانا مودودی نے ذاتی مطالعہ سے اپنی قابلیت میں اضافہ کیا۔ انھوں نے اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی میں اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ عربی اور انگریزی میں روانی سے بولنے اور لکھنے لگے۔ چنانچہ عرب ممالک میں پہنچ کر وہ عربی میں تقریریں کرتے تھے۔ اور نومبر ۱۹۷۰ء میں انتخابی تقریر انھوں نے انگریزی میں کی۔

سترہ سال کی عمر میں مودودی صاحب نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ مدینہ بجنور، ہفت روزہ تاج، روزنامہ الجمعیتہ وغیرہ کے ادارۂ تحریر سے منسلک رہے۔ اور جب انھیں مالی مشکلات سے کسی قدر نجات ملی تو انھوں نے تصنیف و تالیف کی جانب توجہ کی۔ سب سے پہلی اور معرکتہ الآراء کتاب "الجہاد فی الاسلام" تھی جو انھوں نے بعمر ۲۴ سال ۱۹۲۷ء میں لکھی۔

۱۹۲۹ء میں انھوں نے الجمعیتہ سے علیحدگی اختیار کرلی اور حیدرآباد

دکن چلے گئے۔ وہاں ۱۹۳۷ء تک مقیم رہے۔ وہیں سے ۱۹۳۲ء میں ماہنامہ "ترجمان القرآن" جاری کیا جو ابھی تک جاری ہے۔ اسی دوران رسالہ دینیات لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۳۷ء میں شادی ہوئی۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال کے مشورہ سے پٹھان کوٹ میں مقیم ہو گئے اور دارالعلوم قائم کیا۔ لیکن دسمبر ۱۹۳۸ء سے جون ۱۹۴۲ء تک لاہور میں قیام کرنے کے بعد پھر پٹھان کوٹ چلے گئے۔ اگست ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی وجود میں آئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آ گئے۔ یہاں رہ کر شروع میں تو حکومت سے دستور کا مطالبہ کرتے رہے پھر خود سیاست میں شریک ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی بار قید ہوئے۔ ایک دفعہ ۱۹۵۳ء میں پھانسی کی سزا بھی سنا دی گئی۔ جو بعد میں معاف ہو گئی۔ ان شدائد کے باوجود اسلامی آئین کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔[1] اور ۱۹۷۹ء میں فوت ہو گئے۔[2] مگر اسلامی آئین کے نفاذ کا خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود مولانا نے پچاس سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ لیکن تفہیم القرآن آپ کا اہم ترین کارنامہ ہے۔ اس تفسیر کے لکھنے کی ضرورت مولانا کو کیوں پیش آئی جبکہ کئی اچھی اچھی تفسیریں پہلے سے موجود تھیں؟ صاف ظاہر ہے کہ مولانا داعیٔ اسلام بن کر اٹھے تھے اور انھوں نے شروع سے اسی نیک کام کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی دنیوی مفادات کو اس مقصد پر قربان کر دیا تھا۔ جب وہ حیدرآباد دکن میں مقیم تھے اس وقت ان کو وہاں آٹھ سو روپے ماہوار پر بحیثیت پروفیسر

[1] مولانا مودودی کی تقاریر۔ حصہ اول۔ جلد اول۔ از شرت صولت اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور۔ سال طباعت ۱۹۷۶ء، صفحات ۹ تا ۹۰۔

[2] یادِ رفتگاں۔ بصف مایہ برآری۔ مطبوعہ ادارہ فکرِ نو کراچی فروری ۱۹۸۶ء

جامعہ عثمانیہ میں رکھا جا رہا تھا لیکن انھوں نے سو روپے ماہوار پر اسلام کی خاطر کام کرنے کو ترجیح دی اور حیدرآباد جیسی پُر رونق جگہ کو چھوڑ کر پٹھان کوٹ جیسی دور افتادہ بستی میں جا پڑے۔ اس سلسلہ میں ان کے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی لکھتے ہیں:

"(مولانا مودودی) نے حیدرآباد کی اس سستے زمانے کی آٹھ سو روپے ماہوار کی معقول تنخواہ کی اچھی زندگی کو ترک کر کے پردیس کے ایک گاؤں میں سو روپے کی آمدن کو قبول کر لیا۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنے مقصدِ حیات اور پیغام کی خدمت کر سکے۔ آپ غور کیجیے کہ ہم میں کتنے فیصد اور کتنے فی ہزار نہیں بلکہ فی لاکھ لوگ یہ قربانی دے سکتے ہیں۔ ابوالاعلیٰ کا یہ ایثار آج بھی میرے دل پر نقش ہے۔"

(سید ابوالاعلیٰ مودودی از ابوآفاق، صفحہ ۱۵۷، ۱۵۸)[1]

سید ابوالخیر مودودی صاحب کی اس تحریر کی تصدیق مولانا مناظر احسن گیلانی کے ایک مکتوب سے بھی ہوتی ہے۔

ان بیانات کی روشنی میں یہ بتانا مقصود ہے کہ بہت تھوڑی عمر میں مولانا مودودی نے نظامِ اسلام کے احیاء اور نفاذ کے لیے کوشش کرنے کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا تھا۔ انھیں اس بات کا بھی یقین ہو گیا تھا کہ اسلام صرف چند رسوم و رواج کی ادائیگی کا نام نہیں بلکہ وہ پوری دینی اور دنیوی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس کا اصل سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔ لہٰذا اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کا رابطہ قرآن سے قائم کیا جائے۔ عربی زبان سے ناواقفیت عام ہو چکی ہے لہٰذا مسلمانانِ ہند کے لیے خاص کر اردو زبان کو ذریعہ بنایا جائے۔ اس کے لیے مولانا نے ضروری سمجھا کہ عام فہم اردو زبان

[1] مولانا مودودی کی تقاریر جلد اول۔ ص ۱۷

میں قرآن کا ترجمہ اور تفسیر کیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ عقلیت پسندی کا دور ہے اور پہلے کے بیشتر تراجم و تفاسیر کی بنیاد عقیدہ پر رکھی گئی ہے۔ اور جدید تعلیم اور سائنس نے عقیدہ کو بڑی حد تک متزلزل کر دیا ہے۔ لہٰذا موجودہ نسل کو قرآنی تعلیم کو ان ہی کی اصطلاحوں میں سمجھایا جائے اور مغرب سے درآمد شدہ گمراہ کن نظریات کی کاٹ خود ان ہی کے ہتھیاروں سے کی جائے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد انھوں نے خود کتاب ہدایت کی تفسیر لکھنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ چالیس سال سے کم عمر میں ہی انھوں نے اس عظیم کام کا آغاز کر دیا۔ تفہیم القرآن جلد اوّل کے دیباچہ کے اختتام پر مولانا خود تحریر فرماتے ہیں:

"اس کتاب کو میں نے محرم ۱۳۶۱ھ مطابق فروری ۱۹۴۲ء میں شروع کیا تھا۔ پانچ سال سے زیادہ مدت تک اس کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ سورہ یوسف کے آخر تک ترجمانی اور تفہیم تیار ہو گئی۔ اس کے بعد پے در پے ایسے اسباب پیش آتے چلے گئے کہ مجھے نہ تو آگے کچھ لکھنے کا موقع مل سکا اور نہ اتنی فرصت ہی میسر آسکی کہ جتنا کام ہو چکا تھا اسی کو نظر ثانی کر کے اس قابل بنا سکتا کہ کتابی صورت میں شائع ہو سکے۔ اب اسے حسنِ اتفاق کہیے یا سوءِ اتفاق کہ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو یکایک مجھے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور یہاں مجھ کو وہ فرصت بہم پہنچ گئی جو اس کتاب کو پریس میں جانے کے قابل بنانے کے لیے درکار تھی۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ جس غرض کے لیے میں نے یہ محنت کی ہے وہ پوری ہو۔ اور یہ کتاب قرآن مجید کے فہم میں بندگانِ خدا کے لیے واقعی کچھ مددگار ثابت ہو سکے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔"[1]

۱۔ تفہیم القرآن جلد اوّل ص ۱۲

مولانا نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ گھر میں یا جیل میں بیٹھ کر تفسیر لکھ دی بلکہ اپنے بعض بیانات کی وضاحت کے لیے ان مقامات کو بچشم خود دیکھنا بھی ضروری سمجھا جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اپنی اس خواہش کو مولانا نے ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں پورا کیا۔ اس سلسلہ میں "مولانا مودودی کی تقاریر" کے مرتب جناب ثروت صولت صاحب فرماتے ہیں:

"مولانا مودودی نے مشرقِ وسطیٰ کا دوسرا سفر ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں اس وقت کیا جب پاکستان میں مارشل لا لگا ہوا تھا وہ ۳ نومبر ۱۹۵۹ء کو کراچی سے روانہ ہوئے اور ۵ فروری ۱۹۶۰ء کو واپس آگئے۔ یہ ان کا تحقیقی سفر تھا جس کے دوران میں انھوں نے سعودی عرب، اردن، فلسطین، شام اور مصر کے ان آثار کا مشاہدہ کیا جن کا قرآن مجید میں تذکرہ ہے۔"[1]

مولانا کے اس سفر کی مکمل روداد ان کے رفیقِ سفر محمد عاصم صاحب نے "سفرنامہ ارض القرآن" کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں قلمبند کر دی ہے۔ اس سفر میں اگرچہ ان کو ان تمام ممالک کی حکومتوں کا تعاون حاصل رہا جن ممالک کا انھوں نے سفر کیا تھا۔ اس کے باوجود بعض مقامات پر ایسی دشواریاں پیش آئیں کہ اگر تائید ایزدی شاملِ حال نہ ہوتی تو شرکاءِ سفر میں سے کسی کا بھی وجود باقی نہ رہتا بلکہ کوئی اس نقصانِ عظیم کی اطلاع دینے والا بھی نہ ہوتا۔[2] سچ پوچھیے تو مفسرین میں مولانا کے علاوہ کوئی ایک ہستی بھی ایسی نہیں دکھائی دیتی جس نے اس نیک کام میں ایسی

۱۔ مولانا مودودی کی تقاریر جلد اول صفحات ۹۱، ۹۲

۲۔ سفرنامہ ارض القرآن، سٹی پبلی کیشنز لمیٹڈ ۱۳۔ اے شاہ عالم مارکیٹ، لاہور اشاعت سوم ۱۹۷۴ء، صفحات ۲۴۸، ۲۴۹

صعوبات برداشت کی ہوں۔

اس سفر میں جو تحقیقات ہوئی تھیں اور آثار کے جو فوٹو لیے گئے تھے وہ سب مع بعض نقشہ جات تفہیم القرآن میں شامل کر دیے گئے ہیں جن کی وجہ سے اس تفسیر کو اردو کی جملہ تفاسیر میں منفرد حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ مولانا نے تفسیر بیان کرنے میں نہ آنکھ بند کر کے اپنے پیش رووں کی تقلید کی اور نہ تجدد پسندوں کی لایعنی باتوں کو سراہا۔ بلکہ دلائل و براہین کو کام میں لاکر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً بعض مفسرین نے بائبل کے اس بیان پر کہ حضرت نوح کی کشتی کوہستان آرمینیا کی بلند ترین چوٹی اراراط سے جا کر لگی تھی۔ اس چوٹی کو قرآن میں مذکور جبل جودی قرار دے دیا۔ مگر مولانا مودودی نے دریائے زاب کے کنارے واقع جبل قبیر کو کوہ جودی بتایا ہے۔ ان کی اس بات کی تصدیق نینوا کے مقام پر پائی جانے والی بعض تختیوں سے بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے خلیج سویز اور خلیج عقبہ کے نقطہ اتصال کی جگہ نیل ابیض اور نیل ازرق کے سنگم کو "مجمع البحرین" قرار دیا ہے۔ تاہم ضروری نہیں ہے کہ مولانا کی ہر بات کو حتمی سمجھا جائے۔ سہو اور غلطی کا امکان ہر حال میں باقی رہتا ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مولانا نہ تو مقلد ہیں اور نہ تجدد پسند۔

ذیل میں ان کی تفسیر کے دو ایک نمونے درج ہیں:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

ترجمہ: "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔"

تفسیر: "یعنی تیرے ساتھ ہمارا تعلق محض عبادت ہی کا نہیں ہے بلکہ استعانت کا تعلق بھی ہم تیرے ہی ساتھ رکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ساری کائنات کا رب تو ہی ہے اور ساری طاقتیں

تیرے ہی ہاتھ میں ہیں۔ اور ساری نعمتوں کا تو ہی اکیلا مالک ہے۔ اسی لیے ہم اپنی حاجتوں کی طلب میں تیری طرف ہی رجوع کرتے ہیں۔ تیرے ہی آگے ہمارا ہاتھ پھیلتا ہے اور تیری مدد پر ہی ہمارا اعتماد ہے۔"

اس مختصر تفسیر سے انھوں نے ہر طرح کے شرک کی جڑیں کاٹ دی ہیں۔

اب قرآن کریم کی وہ آیت لیجیے جس کی بنیاد پر تجدد پسند حضرات نے روس اور امریکہ کے بے بصر خلا نوردوں کی کوششوں کو عین اطاعت خداوندی قرار دیا ہے۔ مولانا نے اس آیت کا جو ترجمہ اور تفسیر بیان کی ہے وہ اس سے کتنی مختلف ہے۔ ملاحظہ ہو:

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ الخ

ترجمہ: "اے گروہ جن و انس تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔ نہیں بھاگ سکتے۔ اس کے لیے بڑا زور چاہیے۔"

تفسیر: "زمین اور آسمانوں سے مراد ہے کائنات یا بالفاظ دیگر خدا کی خدائی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی گرفت سے بچ نکلنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ جس بازپرس کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے اس کا وقت آنے پر تم خواہ کسی جگہ ہو، بہر حال پکڑ لائے جاؤ گے۔ اس سے بچنے کے لیے تمہیں خدا کی خدائی سے بھاگ نکلنا ہو گا۔ اس کا بل بوتا تم میں نہیں ہے۔ اگر ایسا گھمنڈ تم اپنے اندر رکھتے ہو تو اپنا زور لگا کر دیکھ لو۔"[1]

۱۔ تفہیم القرآن جلد پنجم صفحات ۲۶۳، ۲۶۴

اب ذرا تجدد پسندوں کی تحقیق ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں۔ "مولوی اور ملا آیت کا مطلب کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس میں جو لفظ "سلطان" آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں راکٹ۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔ اے جنوں اور انسانوں، ویسے تو تم کائنات کے آرپار جا نہیں سکتے اس لیے کہ اس میں بڑی طاقت چاہیے لہٰذا اگر تم اَقْطَارُ السَّمٰوٰتِ میں نفوذ کرنا چاہتے ہو یا اس کے پار نکلنا چاہتے ہو تو ایک راکٹ بنالو۔ پھر تمہیں کائنات سے نکل بھاگنے میں سو فیصد کامیابی ہو جائے گی۔ مسلمان بیچارے تو قَالَ اللّٰہُ قَالَ الرَّسُوْلُ میں پھنسے رہے لہٰذا اس آیت کا مطلب کیا سمجھتے۔ امریکہ والوں نے اس کا مطلب بھی سمجھ لیا اور اس کو عملی جامہ بھی پہنا دیا۔ چاند تک تو پہنچ ہی گئے اب کائنات کے پار ہونے میں تھوڑی سی کسر اور رہ گئی ہے۔ جلد ہی خدا کی خدائی سے نکل کر اپنی خدائی کا اعلان کر دیں گے۔

تفسیر صغیر[1]

مرزا بشیر الدین محمود احمد

جیسا کہ سرورق کی عبارت سے ظاہر ہے تفسیر صغیر قرآن مجید کا اردو بامحاورہ ترجمہ مع مختصر تفسیر ہے۔ مترجم و مفسر قادیانی جماعت کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی کے صاحبزادے اور خلیفہ ثانی الحاج مرزا بشیر الدین محمود احمد ہیں۔ اور ناشر ادارۃ المصنفین ربوہ ضلع جھنگ ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود سالہا سال قادیانی جماعت کے سربراہ رہے اور انھوں نے بانی مسلک کے کام کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ اپنے مسلک کی تبلیغ و اشاعت کا کام بھی نہایت

---

[1] تفسیر صغیر۔ اردو بامحاورہ ترجمہ مع مختصر تفسیر از الحاج مرزا بشیر الدین محمود احمد ناشر ادارۃ المصنفین ربوہ ضلع جھنگ ص ۲

تندہی سے انجام دیا۔ ان کا دور اس لحاظ سے کافی اہم ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کی وجہ سے اس جماعت کا مرکز قادیان کے بجائے ربوہ بنا۔ اور ان کو از سر نو جماعت کی تنظیم اور اپنے مستقر کی تعمیر و تشکیل کرنی پڑی۔ اگرچہ یہ دونوں کام بڑی ذمہ داری کے تھے تاہم جماعت کی یکجہتی اور اس مسلک کے ماننے والے بعض سربرآوردہ اشخاص کے تعاون سے انھوں نے اس ذمہ داری کو بہ احسن وجوہ پورا کیا۔ اس نقل مکانی میں ان کی جماعت کو ان مصائب و شدائد سے نہیں گزرنا پڑا جن سے مسلمانوں کے سواد اعظم کو دوچار ہونا پڑا۔

ربوہ کے مرکز سے مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے مسلک سے متعلق لیٹریچر شائع کرنے کے علاوہ قرآن کریم کا ترجمہ اور اس کی تفسیر بھی شائع کی اس میں کئی جگہ مسلمانوں کے مسلک اور عقیدہ کے خلاف باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً خاتم النبیین کی جو تفسیر و تاویل بیان کی گئی ہے اس کو سواد اعظم کے نقطۂ نظر سے نہ صرف منطقی مغالطہ بلکہ کج بحثی سے تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن زیر نظر نسخہ میں بعض ایسی خوبیاں بھی موجود ہیں جن کا اعتراف کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس کی پہلی خوبی یہ ہے کہ اس کو شایانِ شان طریقہ پر نہایت اچھے آرٹ پیپر پر شائع کیا گیا ہے۔ شروع میں سیپاروں اور سورتوں کی مکمل [illegible] ہے۔ سیپاروں کے صفحات کے نمبر الگ دیے گئے۔ سورتوں کے الگ۔ ہر سورت کے رکوع اور آیات کی تعداد بھی الگ الگ کالموں میں بتا دی گئی ہے۔ اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ مختلف سورتوں کا آغاز کس کس سیپارے میں ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر اس تفسیر کا یہ وصف ہے کہ شروع میں مضامینِ قرآن کریم کا ایک جامع انڈیکس دے دیا گیا ہے۔ یہ انڈیکس تقریباً سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں چھ کالم بنائے گئے ہیں۔ پہلے کالم میں حروف تہجی کے اعتبار سے اردو

میں مختصر الفاظ میں مضامین ہیں۔ دوسرے کالم میں صفحات کے نمبر ہیں۔ تیسرے کالم میں ان سورتوں کے نام ہیں جن میں وہ مضامین بیان ہوئے ہیں۔ چوتھے کالم میں آیتوں کے نمبر ہیں۔ پانچویں کالم میں ان حاشیوں کے نمبر ہیں جو ان میں بعض مضامین کی وضاحت کے سلسلہ میں دیے گئے ہیں۔ اور چھٹے کالم میں ان مضامین سے متعلق آیاتِ قرآنی دی گئی ہیں۔ غرض یہ جامع انڈیکس دیگر قاری کے لیے بڑی سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔ اور ترجمہ اور تفسیر پر خود غور و فکر کرنے کا موقع فراہم کر دیا ہے

ترجمہ الفاظ کے تھوڑے بہت رد و بدل سے وہی پایا گیا ہے جو دوسرے مترجم و مفسر بیان کرتے ہیں۔ البتہ تفسیر میں مفسر نے پوری آزادی کے ساتھ اپنے اور دورِ جدید کے تقاضوں کا پورا خیال رکھا ہے اور نہایت عجیب و غریب تشریح و تاویل پیش کی ہے۔ مثلاً

(۱) اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ

ترجمہ: "اے خدا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔" [1]

تفسیر: جب خدائے تعالیٰ کی قدرتِ خاص کے مظاہر دنیا میں ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں تو خدا تعالیٰ انسان کے قریب ہو جاتا ہے اور سعید طبع لوگوں کو خدا تعالیٰ نظر آنے لگ جاتا ہے اور ایک نیا ایمان ان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ بس غائب خدا ان کو حاضر نظر آنے لگتا ہے اور وہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کہہ اٹھتے ہیں اور رؤیت درحقیقت انبیاء کے زمانہ میں

---

[1] تفسیر صغیر از بشیر الدین محمود احمد

اور انبیاء کے قریب زمانہ میں حاصل ہوتی ہے۔ یعنی جبکہ کثرت سے لوگ اس قسم کی معجزانہ رؤیت کا مقام حاصل کرتے ہیں۔ اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انبیاء سے بعید زمانہ میں بھی جا کر کچھ لوگ اس قسم کے رہتے ہیں سوائے اس قلیل عرصہ کے جو کسی آنے والے موعود سے پہلے کا ہوتا ہے۔ جبکہ دنیا سعیدوں سے تقریباً خالی ہو جاتی ہے۔ مگر یہ لوگ جو زمانہ نبوت سے بعد پر پیدا ہوتے ہیں اس مقام کے حاصل کرنے والے لوگ ان میں اتنے تھوڑے ہوتے ہیں کہ خدا سے ان کا تعلق انفرادی تعلق کہلا سکتا ہے۔ اور اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ میں نَعۡبُدُ کا "نون" اور نَسۡتَعِیۡنُ کا نون بتاتا ہے کہ یہاں اس جماعت کا ذکر ہے جو کہ اجتماعی حیثیت رکھتی ہے جن میں کثرت سے خدا تعالیٰ کے قرب کو پانے والے اور ان کے نشانات کو دیکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ پر اسی مضمون کی طرف یوں اشارہ فرمایا گیا ہے کہ ثُلَّۃٌ مِّنَ الۡاَوَّلِیۡنَ وَقَلِیۡلٌ مِّنَ الۡاٰخِرِیۡنَ (سورۃ واقعہ آیت ۱۴-۱۵) مفسرین نے غلطی سے اس کے یہ معنی کر لیے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں زیادہ اور بعد میں کم حالانکہ یہ قاعدہ کلیہ بیان کیا گیا ہے کہ زمانہ رسالت اور اس کے قریب کا زمانہ میں یہ مقامِ شہود حاصل کرنے والے کثرت سے ہوتے ہیں اور جب زمانہ نبی سے دور ہو جاتا ہے تو یہ لوگ تھوڑے رہ جاتے ہیں اور ان کی حیثیت انفرادی رہ جاتی ہے۔ جماعتی نہیں رہتی۔ [1]

---

[1] تفسیر صغیر ص ۳

ترجمہ اور تفسیر کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمہ تو عوام و خواص سب کے لیے قابلِ فہم ہے لیکن تفسیر صرف مخصوصین کے لیے ہے عام آدمی تو ترجمہ سے جو کچھ سمجھ لیتا ہے، تفسیر پڑھنے کے بعد وہ بھی اس کے ذہن سے نکل جاتا ہے۔ کاش تفسیر بیان کرتے وقت بھی عوام کا خیال رکھا جاتا۔

سورہ احزاب کی درج ذیل آیت میں ترجمہ میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی ہے اور پھر اسی تبدیلی کی روشنی میں عجیب انداز سے تفسیر بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿۳۳-۴۰﴾

ترجمہ: "نہ محمد تم سے کسی مرد کے باپ تھے نہ ہیں (نہ ہوں گے)
لیکن اللہ کے رسول ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نبیوں
کی مہر ہیں۔ اور اللہ ہر ایک چیز سے خوب آگاہ ہیں۔"

یہاں خاتم کے معنی مہر بتائے گئے ہیں اور اسی کی روشنی میں حسب ذیل تفسیر بیان کی گئی ہے۔

تفسیر: یعنی آپ کی تصدیق کے بغیر اور آپ کی تعلیم کی شہادت کے بغیر کوئی شخص نبوت یا ولایت کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ لوگوں نے نبیوں کی مہر کی جگہ آخری نبی کے معنی لیتے ہیں۔ اس سے بھی ہماری پوزیشن میں فرق نہیں آتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معراج کو مدنظر رکھا جائے تو انبیاء کا شجرہ مطابق مسند احمد بن حنبلؒ یوں بنتا ہے۔

یہ شجرہ اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ نو خانے بنا کر ان میں اہلِ زمین اور انبیاء کے مقام کو اس طرح متعین کیا ہے، سب سے نیچے خانے میں اہلِ زمین ہیں پھر نیچے سے اوپر کی طرف پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ، دوسرے پر حضرت عیسیٰؑ، تیسرے پر حضرت یوسفؑ، چوتھے پر حضرت ادریسؑ، پانچویں پر حضرت ہارونؑ، چھٹے پر حضرت موسیٰؑ، ساتویں پر حضرت ابراہیمؑ اور آٹھویں خانہ میں سدرۃ المنتہیٰ پر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس شجرہ کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے۔ "ختم نبوت کے یہ معنی ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام سب نبیوں سے افضل ہے۔"[1]

(۳) اب سورۃ الناس کی آخری مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ کا ترجمہ اور تفسیر ملاحظہ ہو:

ترجمہ: خواہ وہ فتنہ پرداز مخفی رہنے والی ہستیوں میں سے ہو، خواہ عام انسانوں میں سے ہو۔

تفسیر: اس جگہ جِنَّةِ کا لفظ مخفی رہنے والی ہستیوں کے متعلق استعمال ہوا ہے اور النَّاسِ کا لفظ عام انسانوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وسوسے پیدا کرنے والے لوگ کبھی تو غیر ممالک کے ہوں گے جو نظر آتے ہوں گے اور کبھی ملکی عامۃ الناس ہوں گے جو اپنے نعروں سے مومنوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کریں گے۔[2]

---

[1] تفسیر صغیر ۵۵۰ اور ۵۵۱
[2] ایضاً ص ۸۵۳

تدبّرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

ڈاکٹر حافظ قاری فیوض الرحمٰن نے اپنی قابلِ قدر تالیف "تعارف قرآن" میں "تدبر قرآن" پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔

"یہ ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر "تدبر قرآن" کے ذیل میں ہے، عام فہم ہے تفسیر کا انداز بھی پیارا ہے[1]"

جہاں تک تدبر قرآن کا تعلق ہے یہ اردو میں لکھی جانے والی بہترین تفاسیر میں سے ایک ہے۔ اس پر یہ سرسری سا ایک سطری تبصرہ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ دو باتوں کا اعتراف خود ڈاکٹر صاحب کو بھی ہے۔ انھوں نے ترجمہ کو عام فہم اور تفسیر کے انداز کو پیارا بتایا ہے لیکن ان دونوں چیزوں پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس تفسیر کا بغور مطالعہ نہیں کیا اور ایک آدھ جگہ سے تھوڑی سی عبارت پڑھ کر ترجمہ کے عام فہم ہونے اور تفسیر کے پیارے انداز کا تو پتہ لگا لیا، لیکن اس کی تمام خوبیوں کا احاطہ نہیں کر سکے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اسلامی تحریک کے ایک خاموش کارکن ہیں۔ ان کے دل میں اسلام کا درد ہے اور انھوں نے ڈوب کر قرآن کریم کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ مولانا حمید الدین فراہی کے خاص شاگرد ہیں۔ اور کافی عرصہ تک جماعت اسلامی کے نہایت اہم رکن رہ چکے ہیں۔ مولانا مودودی کی طرح اپنی صاف گوئی کی بدولت انھیں بھی خان لیاقت علی خان کے دورِ اقتدار

---

[1] تعارف قرآن ص ۲۳۸

میں اٹھارہ مہینے تک ملتان جیل میں رہنا پڑا۔ وہ بڑے صبر و سکون سے جیل کی چہار دیواری کے اندر گزار کر باہر آگئے اور بفضلہ تعالیٰ آج تک باہر ہی ہیں۔ لیکن یہ بات آج تک معمہ بنی ہوئی ہے کہ "اس وقت مولانا مودودی کو تو اس وجہ سے نظر بند لیا گیا تھا کہ انھوں نے کشمیر کی جنگ کو جہاد نہیں کہا تھا۔ مگر مولانا اصلاحی کو کس لیے ان کے ساتھ نتھی کر دیا گیا تھا" بہر حال "رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند" کے زریں اصولوں کو سامنے رکھ کر اس معاملہ سے قطع نظر اتنا بتا دیا جائے کہ مولانا امین احسن اصلاحی دین کی خدمت حکومت سے باہر رہ کر کرنے کے قائل ہیں۔ لہٰذا جب جماعت اسلامی میدانِ سیاست میں آگئی تو انھوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنی زندگی کو قرآنی تعلیمات کی اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔ مولانا حمید الدین فراہی سے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں انھوں نے جو فیض حاصل کیا تھا وہ دوسروں کی طرف منتقل کرنے کی غرض سے اس کو تحریری شکل میں مرتب و مدون کرنا شروع کر دیا۔ زیر تبصرہ تفسیر تدبر قرآن ان کی اسی کوشش و کاوش کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے بیان واقعہ کے طور پر لکھا ہے کہ

"یہ کتاب میری چالیس سال کی کوششوں کا نتیجہ ہے"[1]

"تدبر قرآن" کئی جلدوں میں ہے۔ اس کی پہلی جلد ستمبر ۱۹۶۷ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آئی تھی۔ اس کے شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے جس میں انھوں نے قرآن کریم کی بعض خوبیوں اور اس کے زبان و بیان کے بارے میں کچھ باتیں بتائی ہیں۔ اس مقدمہ کو انھوں نے اس طرح شروع کیا ہے۔

---

[1] تدبر قرآن جلد اول شائع کردہ دار الاشاعت اسلامیہ۔ امرت روڈ کرشن نگر لاہور۔ بار اول ستمبر ۱۹۶۷ء ص "ط"

اس کتاب پر میں کوئی مقدمہ لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اب سے بہت پہلے میں نے "تدبر قرآن" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ جس کے غالباً دو تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ یہ کتاب میں نے اسی مقصد کے لیے لکھی تھی کہ یہ میری تفسیر کے لیے مقدمے کا کام دے گی۔ چنانچہ ارادہ یہی تھا کہ اسی کو تفسیر کے شروع میں لگا دیا جائے گا۔ لیکن اب جب اس نگاہ سے اس کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بہت پہلے لکھے جانے کی وجہ سے اس میں بعض کمیاں بھی رہ گئی ہیں اور اس کے بعض مقامات میں غیر ضروری طوالت بھی ہے۔ اگر اسی کو بعینہٖ کتاب کے ساتھ جوڑ دیا گیا تو یہ اس کتاب کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ چنانچہ دوسرے ضروری کاموں کو نظر انداز کر کے مجھے اس مقدمہ کے لیے قلم سنبھالنا پڑا۔

وَبِیَدِ اللّٰہِ التَّوْفِیْقِ[1]

جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے مفسّر نے اپنی پہلی کتاب "تدبر قرآن" کو چھوڑ کر تفسیر کے لیے مقدمہ از سر نو لکھی ہے اور اس کے مضمون کو بڑی حد تک بدل دیا ہے۔ چنانچہ مقدمہ کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب مذکورہ بالا کا ابتدائی حصّہ ترک کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم سے فیض حاصل کرنے کے لیے وہ ایک اہم بلکہ اہم ترین نکتہ ہے۔ غیر مسلم اور بعض روشن خیال مسلمان بھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن جب خدا کا کلام اور ہدایت کا سرچشمہ ہے تو پھر اس سے ہر شخص کو ہدایت کیوں نہیں ملتی۔

---

[1] تدبر قرآن جلد اول، شائع کردہ دارالاشاعت اسلامیہ، امرت روڈ کرشن نگر، لاہور — بار اول ستمبر ۱۹۶۷: ص ۱

اصلاحی صاحب نے ایسے لوگوں کو شروع میں جتا دیا تھا کہ "جب تم قرآن کا مطالعہ کرو تو اس کو اس نیت سے شروع کرو کہ ہمیں اس سے ہدایت حاصل کرنا ہے۔ اسی صورت میں یہ تمہارے لیے ہدایت کا سرچشمہ ثابت ہوگا۔ لیکن اگر تم اسے تنقیدی نظر سے پڑھو گے یا یہ دیکھنا چاہو گے کہ یہ موجودہ دور کے نظریات کی تائید کرتا ہے یا ہماری خواہشات کو جائز قرار دیتا ہے یا نہیں، تو پھر اس سے تمہیں کبھی بھی ہدایت حاصل نہ ہوگی"[1]

مقدمہ میں بھی فہم قرآن کے سلسلہ میں بڑی مفید باتیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی چیز فہم قرآن کے داخلی اور خارجی مسائل کی تفصیلی بحث ہے۔ اس کے تحت بہت سے ذیلی عنوانات آگئے ہیں جن میں قرآن کی زبان کو اولیت کا درجہ دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اول تو قرآن کی زبان عربی ہے۔ پھر وہ زبان اتنی فصیح و بلیغ ہے کہ اس کے مقابلے میں کسی زمانہ میں بھی کوئی کلام پیش نہیں کیا جا سکا۔ ترجموں کے ذریعہ اس کی ان خوبیوں کو سمجھنا ناممکن ہے۔ اس کی خوبیوں اور لطافتوں کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ براہِ راست عربی زبان سیکھی جائے اور اس زبان کا ذوق پیدا کیا جائے۔ جب تک یہ ذوق پیدا نہیں ہوگا قرآن کے منشاء کو سمجھنا ممکن نہیں۔ یہ کام اگرچہ دشوار گزار ہے تاہم ایک اعلیٰ مقصد کے لیے دشواری کو گوارا کرنا پڑتا ہے۔

اس سلسلہ میں دوسرا مسئلہ نظم قرآن کا ہے۔ چونکہ اس کلام

---

[1] تدبر قرآن کے مقدمہ میں یہ بات بعد میں بیان کی گئی ہے۔ دیکھیے تدبر قرآن جلد اول ص "ش"

کے مخاطب اول خود عرب تھے جو اپنی زبان کی باریکیوں سے بخوبی واقف
تھے۔ اس لیے وہ تو اس نظم کو سمجھ لیتے تھے لیکن دوسروں کے لیے یہ کام
بہت دشوار ہے۔ تاہم کلام الٰہی سے پوری طرح مستفید ہونے کے لیے
اس نظم کو سمجھنا ضروری ہے۔ لہٰذا اس میں بھی پورے غور و فکر اور تدبر
سے کام لینا چاہیے۔ تاکہ اس نظام زندگی کا ایک واضح اور مربوط خاکہ
ذہن میں آجائے جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔" نظم کی قدر و قیمت" کے
عنوان کے تحت اصلاحی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"نظم کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ محض علمی
لطائف کے قسم کی ایک چیز ہے جس کی قرآن کے اصل مقصد
کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے
نزدیک تو اس کی اصل قدر و قیمت یہی ہے کہ قرآن کے علوم
اور اس کی حکمت تک رسائی اگر ہو سکتی ہے تو اسی کے واسطے
سے ہو سکتی ہے۔ جو شخص نظم کی رہنمائی کے بغیر قرآن کو پڑھے گا
وہ زیادہ سے زیادہ جو حاصل کر سکے گا وہ کچھ منفرد احکام
اور منفرد قسم کی ہدایات ہیں۔"[1]

آگے چل کر اصلاحی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے اس تفسیر میں چونکہ نظام کلام کو پوری اہمیت دی
ہے اس وجہ سے ہر جگہ میں نے ایک ہی قول اختیار کیا ہے۔
بلکہ اگر میں اس حقیقت کو صحیح لفظوں میں بیان کروں تو
مجھے یوں کہنا چاہیے کہ مجھے ایک ہی قول اختیار کرنے پر مجبور

[1] تدبر قرآن جلد اول ص "ج"

ہونا پڑا ہے۔ کیونکہ نظم کی رعایت کے بعد مختلف وادیوں
میں گردش کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ صحیح بات
اس طرح منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ آدمی اگر بالکل اندھا
"بہرا" متعصب نہ ہو تو اپنی جان تو قربان کر سکتا ہے لیکن اس
سے انحراف برداشت نہیں کر سکتا۔"[1]

ان وضاحتوں کے بعد خارجی وسائل پر بحث کی گئی ہے اور ذیلی
عنوانات کے تحت ان پر الگ الگ روشنی ڈالی گئی ہے جیسے سنت متواترہ
و مشہورہ، احادیث و آثار صحابہ، شان نزول، کتب تفسیر، قدیم آسمانی
صحیفے، تاریخ عرب۔

آخر میں قرآن کے طالبوں کے لیے چند ہدایات دی گئی ہیں۔ اس حصہ
میں مذکورہ کتاب تدبر قرآن کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس میں پہلی
ہدایت "نیت کی پاکیزگی" کے عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ "آدمی قرآن
مجید کو صرف طلب ہدایت کے لیے پڑھے، کسی اور غرض کو سامنے رکھ کر نہ
پڑھے۔ دوسری ہدایت یہ ہے کہ قرآن کو ایک برتر کلام مانا جائے۔ تیسری
ہدایت یہ کہ قرآن کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم۔ چوتھی ہدایت
یہ کہ اللہ تعالیٰ سے رہنمائی کی دعا۔

یہ ہدایات دینے کے بعد چند حروف خاص اس تفسیر سے متعلق بیان
کیے گئے ہیں اور پھر ترجمہ و تفسیر کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

قرآن کو بجا طور پر کتاب ہدایت کہا جاتا ہے۔ اور یہ چشمۂ ہدایت
اللہ تعالیٰ نے مومن کی اس دعا کے جواب میں جاری کیا ہے جو وہ سورہ

[1] تدبر قرآن جلد اول ص "ی"

فاتحہ کی تلاوت کرتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (اے اللہ! سیدھے راستے پر چلنے کی ہدایت فرما۔) اللہ تعالیٰ نے بندۂ مومن کی دعا قبول کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ط

(اے بندے اگر تو واقعتہً ہدایت چاہتا ہے تو اس کے لیے ہم تجھے یہ نسخہ دکھا رہے ہیں، اس کو پڑھ، سمجھ اور عمل کر۔ وہ نسخہ یہ کتاب ہے۔ اس کتاب میں کوئی شک و شبہ کی بات نہیں ہے۔ لیکن اس میں ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔ ان لوگوں کے لیے جو غیب میں رہتے ایمان لاتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔

تدبرِ قرآن میں اسی چیز پر زور دیا گیا ہے کہ قرآن کا مطالعہ ہدایت حاصل کرنے کے لیے کیا جائے، کسی اور غرض سے نہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے:

"آدمی قرآن مجید کو صرف طلبِ ہدایت کے لیے پڑھے کسی اور غرض کو سامنے رکھ کر نہ پڑھے۔ اگر طلبِ ہدایت کے سوا آدمی کے سامنے کوئی اور غرض ہو گی تو وہ نہ صرف قرآن کے فیض ہی سے محروم رہے گا بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ قرآن سے جتنا دور وہ اب تک رہا ہے اس سے بھی کچھ زیادہ دور ہٹ جائے۔"

مفسرِ موصوف کے اس صائب مشورہ کی روشنی میں ضروری معلوم ہوتا ہے

کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی انھوں نے جو تفسیر بیان کی ہے نمونہ کے لیے وہی پیش کر دی جائے۔ وہ کہتے ہیں:

تفسیر: اِهْدِنَا کا مطلب صرف اسی قدر نہیں ہے کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا دے بلکہ اس کا مفہوم اس سے بہت زیادہ ہے۔ اس میں یہ مفہوم بھی ہے کہ اس راستہ کی صحت پر ہمارے دل مطمئن کر دے۔ اس پر چلنے کا ہمارے اندر ذوق و شوق پیدا کر دے۔ اس کی مشکلیں ہمارے لیے آسان کر دے اور اس پر چلا دینے کے بعد دوسری پگڈنڈیوں پر بھٹکنے سے ہمیں محفوظ رکھ۔ یہ سارا مضمون یہاں صلہ کو حذف کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ پر الف لام عہد کا ہے۔ اس سے مراد وہ سیدھا رستہ ہے جو بندوں کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے کھولا ہے جو دین اور دنیا دونوں کی فلاح و کامیابی کا ضامن ہے جس پر چلنے کی دعوت نبیوں اور رسولوں نے دی ہے۔ جس پر ہمیشہ خدا کے نیک بندے چلتے رہے جو قریب تر اور سہل تر ہے۔ جس کے ادھر ادھر سے گمراہوں اور گمراہ کرنے والوں نے بہت پیچ پیچ کی راہیں نکال لی ہیں لیکن وہ بجائے خود قائم ہے اور خدا تک پہنچنے والے اسی پر چل کر خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسی سیدھے رستہ کو حضورؐ نے ایک مرتبہ اس طرح سمجھایا کہ زمین پر ایک سیدھا خط کھینچا۔ پھر اس کے دائیں بائیں آڑے ترچھے خطوط کھینچ دیے پھر فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے اور یہ آڑے ترچھے خطوط پگڈنڈیاں ہیں اور ان میں ہر پگڈنڈی کی طرف کوئی نہ کوئی

شیطان بلا رہا ہے۔"

تفسیر القرآن

مولانا سید ظفر حسن امروہوی

یہ تفسیر نہایت اہتمام سے شمیم بک ڈپو، ناظم آباد کراچی نے شائع کی ہے
مفسّر حضرت ادیبِ اعظم الحاج مولانا سیّد ظفر حسن صاحب قبلہ امروہوی
ہیں جو دو صد سیزدہ کتابوں کے مصنف اور جامعہ امامیہ کے بانی ہیں۔
معاونین کی تعداد پینتیس ۳۵ ہے۔ جن میں مرد و خواتین دونوں شامل ہیں۔
اور یہ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان سب باتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا
ہے کہ جملہ تفاسیر میں اس تفسیر کا کتنا اونچا مقام ہوسکتا ہے۔ مفسّر چونکہ
ادیبِ اعظم ہیں اس لیے انھوں نے ترجمہ اور تفسیر میں ادبیت کا پورا خیال
رکھا ہے۔ تفسیر کو ہر شخص کے لیے دلچسپ بنانے کی غرض سے موقع کی مناسبت
سے اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ کہیں لہجہ عامیانہ ہے کہیں عالمانہ، کہیں سنجیدگی
کا عنصر غالب ہے کہیں طنز و ظرافت کی چاشنی۔ غرض مفسرین کی عام روش
سے ہٹ کر ترجمہ اور تفسیر دونوں میں روانی، ادبیت، اور دلچسپی کا
پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ مثلاً یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِکَۃَ لَا بُشْرٰی
یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۵ کا یہ
یہ ترجمہ کیا گیا ہے:

جس دن یہ لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن گنہگاروں
کو کچھ خوشی نہ ہوگی۔ اور فرشتوں کو دیکھ کر کہیں گے "دُر دُفان"

"حِجْرًا مَّحْجُوْرًا" کے ترجمہ کے طور پر جو عامیانہ محاورہ "دُر دُفان"
استعمال کیا گیا ہے اس کی بلاغت کو اہلِ ذوق حضرات ہی سراہ سکتے ہیں۔ ٥

یہ تو ترجمہ کا حال ہے جہاں انسان بڑی حد تک پابند ہوتا ہے۔ تفسیر میں
پوری آزادی ہوتی ہے۔ اس لیے وہاں فصاحت و بلاغت کے اس سے
بھی زیادہ اعلیٰ نمونے بکثرت دکھائی دیں گے۔

"تفسیر القرآن" پانچ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ جلد چہارم پارہ
"قَالَ الَّذِیْنَ ۱۹" سے پارہ "فَمَنْ اَظْلَمُ ۲۴" تک ہے۔ ان ہی پاروں
کے درمیان سورۂ احزاب میں شامل آیتِ تطہیر اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ
لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ
تَطْھِیْرًا بھی آگئی جس میں جامع قرآن نے اس مصلحت سے کہ اس کا
مرجع ازواجِ رسولؐ کو بتائیں اس کو پارہ وَمَنْ یَّقْنُتْ کی ان ابتدائی آیات
کے بیچ میں شامل کر دیا ہے۔ جن میں ازواجِ محرمات کو کچھ تنبیہ کی گئی ہے۔
"جامع قرآن" نے یہ تحریف تو کر ڈالی مگر چونکہ خالص عرب ہونے کے باوجود
عربی زبان کے قواعد سے ناواقف تھے۔ اس لیے اس آیت میں جو دو جگہ جمع
مذکر کی ضمیر "کُمْ" [عَنْکُمْ اور یُطَھِّرَکُمْ] آئی ہے اس کی جگہ جمع
مونث کی ضمیر استعمال نہ کرسکے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ چودہ سو سال سے
یہ غلطی (؟) اسی طرح چلی آرہی ہے مگر آج تک کسی کا ذہن اس طرف منتقل
نہیں ہوا۔ مفسّر علّام مولانا سیّد ظفر حسن صاحب قبلہ چونکہ ادیبِ اعظم
بھی ہیں اس لیے انھوں نے جامع قرآن کی اس غلطی کو فوراً پکڑ لیا اور نہایت
قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ سنا دیا کہ "آیت تطہیر کا ٹکڑا کہیں اور کا ہے۔"

اس نکتہ کی مزید وضاحت کے لیے سورۂ احزاب کی ان ہی آیات کا
ترجمہ اور ان کی تفسیر ذیل میں درج کی جاتی ہے:

"وَمَنْ یَّقْنُتْ مِنْکُنَّ لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ....
.... اِنَّ اللّٰہَ کَانَ لَطِیْفًا خَبِیْرًا ۵

ترجمہ: "تم میں سے جو بی بی خدا اور اس کے رسول کی تابعداری اور اچھے اچھے کام کرے گی تو ہم اس کو دوہرا ثواب عطا کرینگے اور ہم نے اس کے لیے جنت میں عزت کی روزی تیار رکھی ہے۔ اے نبی کی بیبیو تم معمولی عورتوں جیسی نہیں ہو اگر تم کو پرہیزگاری منظور ہے (تو اجنبی آدمی سے) بات کرنے میں نرم نرم (لگی لپٹی) بات نہ کرنا کہ جس کے دل میں (بدکاری کا) مرض ہے وہ کچھ اور آرزو تم سے نہ کرے اور بعنوان شائستہ بات کیا کرو اور اپنے گھروں میں قرار سے رہا کرو اور زمانۂ جاہلیت کی طرح اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو۔ پابندی سے نماز پڑھا کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اے اہلِ بیت خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ہر قسم کی برائی سے دور رکھے اور جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے ویسا پاک و پاکیزہ رکھے۔ اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی آیتیں اور عقل و حکمت کی باتیں پڑھی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو بیشک خدا بڑا باریک بین اور واقف کار ہے"۔

تفسیر: ازواج محترمات کو جو کچھ تنبیہ ان آیات میں کی گئی ہے ان کے متعلق کچھ لکھنا گستاخی ہوگی۔ رسول کے گھر کا معاملہ ہے، رسولؐ جانیں اور ان کی ازواج جانیں[1]۔

---

[1] سچ کہا حضرت ادیبِ اعظم الحاج مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ نے کہ "رسولؐ کے گھر کا معاملہ ہے، رسولؐ جانیں اور ان کی ازواج جانیں"۔ ادیب اعظم نے ان کے گھر کے معاملہ سے لیا واسطہ (باقی اگلے صفحہ پر)

کہا جاتا ہے کہ کسی گناہ کے متعلق تنبیہ نہ تھی بلکہ ان کو بتایا جا رہا تھا کہ تم کو بحیثیت عمل تمام مسلمان عورتوں کے لیے نمونۂ عمل بننا چاہیے۔ بے شک ہونا تو یہی چاہیے لیکن قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ کی خلاف ورزی اور آیہ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ (۲۲/۴ تحریم) کا نزول اس خیال پر جمنے نہیں دیتا۔

ان آیات کے بیچ میں جو ازواج محترمات کے متعلق ہیں ہم کو آیت تطہیر بھی نظر آ رہی ہے۔ بہت کچھ غور کے بعد بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آیۂ تطہیر کے اوپر اور نیچے جو آیات ہیں ان کو آیۂ تطہیر سے کیا نسبت ہے۔ اول و آخر تنبیہ اور بیچ میں ان کی انتہائی فضیلت کا اظہار کیا بے جوڑ بات ہے[1]۔ آیۂ تطہیر کے اوپر جتنے افعال آئے ہیں وہ سب جمع مونث کے صیغے ہیں جیسے اِنِ اتَّقَيْتُنَّ۔ فَلَا تَخْضَعْنَ۔ قَرْنَ۔ لَا تَبَرَّجْنَ۔ اَقِمْنَ۔ اٰتِيْنَ۔ اَطِعْنَ۔ اس کے بعد یکایک جمع مذکر حاضر کی ضمیریں استعمال ہونے لگیں۔ عَنْكُمُ۔ يُطَهِّرَكُمْ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) واسطہ ہوگا تو ان لوگوں کو ہوگا جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (اے رسولؐ ان سے کہدو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔) اور اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ (بلاشبہ نبی تو اہلِ ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں)۔ وہ تو یقیناً اس طرح کی بے نیازی نہیں برت سکتے۔

[1] مگر اسی قسم کی بے جوڑ بات تو اس آیت میں بھی (باقی اگلے صفحہ پر)

پھر جمع مونث کے فعل آنے لگے وَاذْکُرْنَ ۔ فِی بُیُوْتِکُنَّ

اگر آیۂ تطہیر میں ازواجِ رسولؐ شامل ہوتیں تو بجائے مذکر کے اس آیت میں بھی جمع مونث حاضر کی ضمیریں ہوتیں۔ ایسی بے ربطی تو فصیح و بلیغ انسانوں کے کلام میں بھی نہیں پائی جاتی۔ چہ جائیکہ مَلکِ علّام کے کلام میں۔ سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آیت تطہیر کا ٹکڑا کہیں اور کا ہے۔ جو یہاں جامع قرآن نے مصلحتاً لاکر رکھا ہے[1] اس آیت کا

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) کہی گئی ہے "یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ" (اے نبی کی بیبیو تم معمولی عورتوں جیسی نہیں ہو)۔ کیا اس فقرے سے ازواجِ رسولؐ کی فضیلت کا اظہار نہیں ہوتا؟

[1] جامع قرآن نے ایک اور موقع پر بھی ایسا ہی عمل کیا ہے۔ سورہ ھود میں جہاں یہ ذکر ہے وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰھِیْمَ بِالْبُشْرٰی (اور دیکھو ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوشخبری لیے ہوئے پہنچے)۔ جب ان فرشتوں نے حضرت ابراہیم کی زوجہ (حضرت سارہ) کو اسحٰق کی اور اسحٰق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی تو انھوں نے کہا

کہ میرے ہاں اولاد کیسے ہو سکتی ہے جبکہ ہم دونوں بوڑھے کھوسٹ ہیں۔ اس پر فرشتوں نے اس کے جواب میں کہا۔ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ رَحْمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکٰتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ [سورہ ۱۱: آیت ۷۳] (فرشتوں نے کہا "اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟ اے اہلِ بیت، تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں۔" یہاں سیاق و سباق سے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

مصداق تو وہ گروہ ہونا چاہیے جس میں اکثریت مردوں کی ہو۔ چنانچہ جن کی شان میں یہ آیت ہے ان میں چار مرد ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی علیہ السلام، امام حسنؑ اور امام حسینؑ اور ایک عورت بھی ۔ یعنی حضرت فاطمہؑ۔ پس بقاعدہ تغلیب یعنی مردوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے ضمیر جمع مذکر حاضر عَنْکُمُ و یُطَھِّرَکُمْ میں لائی گئی۔

دراصل اہلِ بیت کا لفظ عموماً بیویوں کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے اردو زبان میں بھی عام محاورہ یہی ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص کسی دوسرے سے پوچھتا ہے کہ "گھر والی کا کیا حال ہے؟" تو مراد ہوتی ہے کہ "آپ کی بیوی کیسی ہے؟" لفظ گھر والے بیویوں کے علاوہ نرینہ اولاد اور بن بیاہی لڑکیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پھر ہر زبان کا یہ بھی محاورہ ہے کہ اس موقع پر جمع مذکر کی ضمیریں اور جمع مذکر کے صیغے کام میں لائے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں بھی جہاں جہاں اہلِ بیت کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں جمع مذکر کی ضمیریں اور جمع مذکر کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ ساری بحث کج بحثی کے سوا کچھ نہیں۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) تخاطب صرف حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ حضرت سارہ سے ہے۔ لیکن ایک ہی آیت میں ان کی اکیلی ذات کے لیے ایک جگہ مونث کا صیغہ (تَعْجَبِیْنَ) استعمال کیا گیا ہے اور دوسری جگہ مذکر کی ضمیر (عَلَیْکُمْ)۔ معلوم نہیں یہاں بھی جامع قرآن نے کسی مصلحت کی بنا پر یہ بے قاعدگی برتی ہے یا ان کی طرح فرشتے بھی عربی زبان کے قواعد سے نابلد تھے۔

تفسیر فصل الخطاب

مولانا السیّد علی النقوی مجتہد

تفسیر فصل الخطاب جو ادارۂ ترویج علومِ اسلامیہ کراچی (پاکستان) نے شائع کی ہے الحاج سید العلماء مولانا السید علی نقی النقوی مجتہد (لکھنوی) کی تصنیفِ لطیف ہے۔ وہ فرقہ امامیہ کے ایک جیّد اور متبحر عالم ہیں۔ ان کا تعارف ایک فاضل شخص جناب سید محمد باقر شمس نے "مختصر حالات" کے عنوان کے تحت لکھ کر اس جلد اول کے شروع میں شائع کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مفسر موصوف غفرانمآب مولانا سید دلدار علی صاحب مجتہد العصر کی نسل سے ہیں اور پانچویں پشت میں ان کا شجرہ مولانا دلدار علی صاحب سے مل جاتا ہے۔

مولانا سید علی نقی النقوی کی ولادت ۲۲ر رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۲۱ ستمبر ۱۹۰۵ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ ابھی ان کی عمر تین اور چار سال کے درمیان تھی کہ والد بزرگوار سید ابوالحسن صاحب مجتہد کو تکمیلِ علوم کے لیے عراق جانا پڑا۔ وہ تمام متعلقین کو بھی ساتھ لے گئے۔ وہیں سید علی نقی صاحب کی بمقام نجف اشرف تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ اور دو سال کی قلیل مدت میں انھوں نے ابتدائی قاعدہ، قرآن مجید، فارسی کی دو کتابیں ختم کر کے عربی علم الصرف کی تحصیل شروع کر دی تھی۔ ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں جب سن شریف تقریباً ۱۰ سال تھا اس وقت پورے خاندان نے ہندوستان کی جانب مراجعت کی اور مولانا علی نقی نے لکھنؤ میں رہتے ہوئے سلسلۂ تعلیم جاری کیا اور عالم فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ شعبان ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں خود بغرض تکمیلِ علوم

نجف اشرف کا سفر اختیار کیا اور وہاں پانچ سال قیام کر کے بہت سے علماء سے فیض حاصل کیا اور بہت سی اسناد حاصل کر کے ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں وطن واپس آکر کئی معرکہ آرا کتابیں لکھیں۔ ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات میں عربی اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے مقرر ہو گیا۔ ۱۹۵۹ء تک اسی حیثیت میں کام کیا۔ بعدہٗ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں صدر شعبۂ شیعہ دینیات ہو کر چلے گئے اور چند سال بعد پروفیسر کے گریڈ میں اور ڈین آف شعبہ تھیالوجی کے منصب پر فائز ہو کر ۱۹۷۲ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں پاکستان تشریف لے آئے اور مجالس اور تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد تفسیر قرآن لکھنی شروع کی جس کی پہلی جلد جو پہلے دو پاروں پر مشتمل ہے ۱۹۸۵ء میں چھپی اور اس کی اشاعت کا بیڑا ملک کے ممتاز مخیر بزرگ حاجی سید علی اکبر صاحب رضوی نے اٹھایا[1]۔

تفسیر فصل الخطاب جلد اول نہایت اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ درجہ کی، کاغذ بڑھیا، گیٹ اپ شاندار، مضمون کے اعتبار سے بھی نہایت میانہ روی سے کام لیا گیا ہے۔ زبان نہایت صاف، شستہ اور رواں ہے۔ غرض ہر لحاظ سے اس کو اچھی کوشش و کاوش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

مفسر علام نے تفسیر شروع کرنے سے پہلے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے۔ جس میں قرآن سے متعلق ہر طرح کی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ مثلاً لفظ قرآن کی لغوی تشریح۔ قرآن اور حدیثِ قدسی میں فرق۔ حدیثِ نبوی

---

[1] تفسیر فصل الخطاب جلد اول صفحات "ک" تا "ن"

اور حدیثِ قدسی، قرآن کے اصطلاحی معنی، کلام الٰہی کے معنی اور قرآن کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کا معرکہ وغیرہ۔ ان میں دو موضوعات بہت اہم ہیں جن پر مفسر نے خاص توجہ دی ہے ایک جمع و تدوینِ قرآن اور دوسرا نفی تحریف۔

جمع و تدوینِ قرآن کے سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ قرآن بذریعہ وحی نازل ہوا۔ جب کوئی حصہ نازل ہوتا اور کوئی لکھنے والا آجاتا یا پہلے سے موجود ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے کاغذ یا چمڑے یا درخت کی چھال جو کچھ ملتا اس پر لکھوا دیا کرتے۔ ساتھ ہی صحابہ حفظ بھی کر لیتے تھے۔ لیکن نہ تو ساری تحریریں ایک جگہ جمع تھیں اور نہ سوائے حضرت علیؑ کے کسی کو سارا قرآن حفظ تھا۔ لہذا رحلتِ رسولؐ کے بعد حضرت علیؑ نے تو تنزیلی ترتیب کے ساتھ سارا قرآن ایک جگہ جمع کر دیا۔ مگر جب اسے آپ نے اربابِ اقتدار کے سامنے پیش کیا تو وہاں اسے رد کر دیا گیا۔ اور کہا گیا، ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ خاموشی کے ساتھ اپنے اس جمع کردہ مصحف کو واپس لائے اور اپنے ذخیرۂ خاص میں محفوظ کر دیا۔[1]

جہاں تک اہلِ اقتدار کا تعلق ہے شروع میں تو ان کی پوری توجہ بدامنی کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھانے کی طرف رہی۔ جب اس سے فرصت ہوئی اور ان لڑائیوں میں حفاظِ قرآن کی کثیر تعداد قتل ہو گئی..... تو اس وقت جمع قرآن کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اور اس خدمت کو زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا۔ جو رسالت مآبؐ کے آخری زمانہ کے کم عمر صحابہ میں سے ایک فرد تھے اور حفظ قرآن شوق و ذوق سے کیا تھا۔ انھوں نے بڑی

---

[1] تفسیر فصل الخطاب جلد اول ص ۶۴

جانفشانی و عرق ریزی کے ساتھ کچھ اپنے حافظہ کی مدد سے اور کچھ صحابہ کے پاس سے متفرق طور پر تھوڑے تھوڑے اجزاء جو تھے ان سب کو سامنے رکھ کر اور دوسرے صحابہ سے پوچھ کر قرآن مجید کو حکومتِ وقت کے زیر سایہ جمع کیا۔[1]

حکومت نے سیاسی تقاضے پورے کرنے اور اتنے پاپڑ بیلنے کے بعد قرآن جمع تو کر لیا مگر ترتیب تنزیل کے مطابق نہ ہو سکی۔ اب یہ قرآن مجید کے اسلوب کا ایک معجزہ تھا کہ غیر مرتب شکل میں یکجا ہونے کے بعد بھی اس کی آیات کی افادیت برقرار رہی۔

...... اس کے ساتھ چونکہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب نے اس کے بالمقابل اپنے جمع کردہ قرآن کی اشاعت کرنا ضروری نہیں سمجھی (غالباً رفع شر کے خیال سے ایسا کیا گیا) اس سے یقینی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ موجودہ صورت سے جو کتاب جمع ہوئی اس میں کوئی فروگذاشت ایسی نہیں ہوئی ہے جس سے اس کی حقانیت کو صدمہ پہنچا ہو۔ اس طرح واقعی و حقیقی اجماع ہو گیا اس قرآن کی حقانیت پر جو بین الدفتین موجود ہے جس میں کسی اسلامی فرقہ کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔[2]

اس کے بعد نفی تحریف کے سلسلہ میں مفسر موصوف فرماتے ہیں: "اگر حضرت امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب اس قرآن کی اشاعت پر جو ارکان حکومت کی جانب سے مرتب کیا گیا تھا صرف سکوت اختیار فرماتے تو بھی وہ اس کی حقانیت کی دلیل ہوتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت نے اس پر

---

[1] تفسیر فصل الخطاب جلد اول ص ۶۵

[2] ایضاً ص ۶۵

سکوت ہی نہیں فرمایا بلکہ اپنے کلمات میں گویا اس پر مہر تصدیق ثبت کردی۔[1]

پھر لفظی تحریف کے متعلق علماء شیعہ کے تصریحات بیان کرتے ہوئے مفسّر موصوف رقم طراز ہیں کہ شیخ ابوعلی طبرسی تفسیر مجمع البیان میں لکھتے ہیں:

"قرآن میں زیادتی کا ہونا تو باجماع باطل ہے اور کمی کے متعلق کچھ شیعہ اور سنّی ظاہر بین محدثین نے روایات نقل کر دیے ہیں کہ اس قرآن میں کچھ تغیّر و تبدّل اور نقصان ہوا ہے۔[2] لیکن ہمارے علماء میں جو صحیح مذہب ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ اور یہی وہ ہے جسے جناب مرتضیٰ قدس اللہ روحہ نے ثابت کیا ہے"

نمونہ کے لیے ایک آیت کا ترجمہ اور تفسیر پیش کی جاتی ہے:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

ترجمہ: "تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے بس مدد مانگتے ہیں۔

تفسیر: عبادت کے معنی ہیں، اظہار تذلل یا حکم کی تعمیل جو کسی کو خدا

---

[1] تفسیر فصل الخطاب جلد اول ص ۲۶

[2] اس تمام بیان سے واضح ہوتا ہے کہ مفسّر موصوف سمیت اس تحریف کے تو سب قائل ہیں کہ قرآن کی ترتیب نزول قائم نہیں رکھی گئی بلکہ حکومت نے بعض سیاسی تقاضے پورے کرنے کے لیے ترتیب اپنی مرضی کے مطابق کر لی جواب تک قائم ہے۔ البتہ کمی کے متعلق کچھ شیعہ اور سنّی ظاہر بین محدثین نے روایات نقل کر دیے ہیں اور غالباً انھیں روایات کی بنیاد پر سلسبیل فصاحت کے مرتّب نے یہ تک لکھ دیا ہے کہ "مسلمانوں کا ایک جتھا جو بظاہر اسلام کا مدعی تھا وہ یہی چاہتا تھا کہ قرآن میں تحریف ہو۔ چنانچہ اس نے تحریف سے کام لیا۔ تحریف کمی، زیادتی، تغیّر و تبدّل اور تقدم و تاخر سب پر مشتمل ہے اور ہر طرح کی روایات کتب اسلام میں ملتی ہیں جن کے راویوں کی بھی تصدیق ائمہ فنون نے کی ہے"

یا خدا کا اوتار مان کر اختیار کی جائے۔ مطلق تعظیم جیسے کسی کو دیکھ کر کھڑا ہو جانا یا سلام کو جھکنا یا ہاتھ چومنا یا آستان بوسی کرنا عبادت نہیں ہے۔ نہ مطلق حکم کی تعمیل عبادت سمجھی جا سکتی ہے۔

دوسرا فقرہ "تجھ ہی سے بس مدد مانگتے ہیں" اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرے مقابل میں اور تجھ سے بے نیاز ہو کر کسی کو ہم مددگار نہیں سمجھتے۔

نَعْبُدُ اور نَسْتَعِينُ میں جمع کے صیغے "تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں" اور "تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں" اس احساس اجتماعیت کے تحفظ کے لیے ہیں جس کے لیے نماز میں فرادی سے زیادہ جماعت کو پسند کیا گیا ہے۔ پھر نماز اگر فرادی بھی ہو تو الفاظ زبان پر یہی ہونا ضروری ہیں گویا ہر بندہ اللہ سے یہ چاہتا ہے کہ اول تو بارگاہ میں اکیلا حاضر نہ ہو بلکہ سب کے ساتھ مل کر آئے۔ اور اگر اکیلا آتا بھی ہے تو عرض معروض فقط اپنی ذات کی طرف سے نہ کرے بلکہ تمام بنی نوع کا نمائندہ بن کر جو عرض معروض کرے سب کی طرف سے کرے اور جو مانگے سب کے لیے مانگے۔

دوسرا مقام ہوتا تو "ہم" کی لفظ سے تخاطب میں عظمت کی شان پیدا ہوتی تھی مگر بڑے کی بارگاہ میں اپنی خدمت پیش کرنے کے موقع پر "میں" کی لفظ انانیت کا اظہار کرتی ہے۔ "ہم" کے استعمال میں یہ پہلو بھی ہے کہ یہ خود اپنی ہستی کو افراد اور اس کے خدمات کو قابلِ تذکرہ ہی نہیں سمجھتا اس سے انانیت اور خود غرضی دونوں باتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

اردو میں لکھی جانے والی دیگر تفاسیر

مذکورہ بالا تفاسیر کے علاوہ اور بھی بہت سی مختصر اور مفصل تفسیریں اردو زبان میں لکھی گئیں۔ ان میں سے چند کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

جامع التفاسیر

نواب قطب الدین خان دہلوی

یہ اردو میں ساتویں منزل کی تفسیر اور مختلف تفسیروں کا خلاصہ ہے اس کے لکھنے والے نواب قطب الدین خان دہلوی تھے جو ۱۲۱۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۸۹ھ میں فوت ہوئے۔ شاہ محمد اسحٰق دہلوی کے شاگرد تھے اور فقہ، حدیث اور تفسیر میں کامل تھے۔ یہ تفسیر ۱۲۹۲ھ میں مطبع مرتضوی دہلی میں طبع ہوئی۔[1]

اعظم التفاسیر

مولانا رحیم بخش

مولانا رحیم بخش نے یہ تفسیر لکھی۔ اس کی سات جلدیں ہیں جو دہلی میں میور پریس سے ۱۲۱۱ھ سے ۱۳۱۷ھ کے درمیان شائع ہوئی ہے۔ تعارف قرآن میں بتایا گیا ہے کہ:

۱۔ تعارف قرآن ص ۲۲۹

"جناب مولانا رحیم بخش صاحب دہلوی۔ آپ بہت بڑے عالم فاضل، محقق ہیں۔ آپ کی تصانیف سے "اعظم التفاسیر" نہایت عمدہ تفسیر ہے۔ خوب صراحت اور تفصیل کے ساتھ ہر ایک مضمون کو لکھا ہے۔ اردو میں کوئی تفسیر میں نے ایسی نہیں دیکھی۔"[1]

تفسیر اکسیر اعظم

قاضی احتشام الدین مراد آبادی

قاضی احتشام الدین مراد آبادی کی تصنیف ہے۔ مفسر موصوف مراد آباد کے مشہور عالم اور فقیہ تھے۔ انھوں نے ابتدائی کتب اپنے وطن میں پڑھ کر قاضی بشیر الدین عثمانی قنوجی اور میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے تکمیل علوم کی۔ ان کی یہ تصنیف کئی جلدوں میں ہے۔ ۱۳۱۳ھ میں انتقال ہوا۔[2]

تفسیر مواہب الرحمٰن

مولانا سیّد امیر علی

اس ترجمہ اور تفسیر کے مصنف مولانا سید امیر علی ہیں۔ اردو میں نہایت مفصل، مستند اور دلچسپ تفسیر ہے۔ پہلے ہندوستان میں شائع ہوئی پھر مکتبہ رشیدیہ لاہور نے نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ ان کے علاوہ پاکستان میں بعض اور ناشروں نے بھی اسے چھاپا۔[3]

۱۔ تعارف قرآن ص ۲۳۰

۲۔ نزہۃ الخواطر جلد ۸ ص ۱۵ بحوالہ تعارف قرآن ص ۲۳۶

۳۔ تعارف قرآن ص ۲۴۹

احسن التفاسیر

سید احمد حسن دہلوی

احسن التفاسیر از سید احمد حسن دہلوی کی ضخیم جلدوں میں ہے۔ مولانا حافظ عبدالرحیم کلاچوی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"احسن التفاسیر از سید احمد حسن صاحب وظیفہ خوار سرکار حیدر آباد دکن، مطبوعہ اردو تفسیروں میں سب سے زیادہ اچھی تفسیر ہے۔ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔"[1]

نزہتہ الخواطر از حکیم سید عبدالحئی سے پتہ چلتا ہے کہ مفسر سید احمد حسن دہلوی کا انتقال ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء میں ہوا۔[2]

تفسیر فوائد القرآن

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی

یہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کے ترجمہ قرآن پر نہایت تحقیقی اور فاضلانہ حاشیہ ہے۔ جو ان کے شاگرد رشید علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی (۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء تا ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) نے تحریر کیا۔ اس تفسیری حاشیہ کی تعریف بہت سے علماء نے کی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"ان کے تصنیفی اور علمی کمال کا نمونہ اردو میں ان کے قرآنی حواشی ہیں۔ جو حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ تعالیٰ کے ترجمہ کے ساتھ چھپے ہیں۔"

---

[1] لباب المعارف العلمیہ لاہور جلد ۱ ص ۳۱ بحوالہ تعارف قرآن ص ۲۵۴

[2] نزہتہ الخواطر جلد ۸ ص ۴۴ بحوالہ تعارف قرآن حاشیہ ص ۲۵۴

علامہ خالد محمود کی رائے ہے:

"مصنف نے سمندروں کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔"[1]

ڈاکٹر حافظ قاری فیوض الرحمٰن کا کہنا ہے:

"اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں اور محاسن کے اعتبار سے اب تک کے تمام شائع شدہ حواشی میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔"[2]

اس حاشیہ کی خوبی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ:

"حکومت افغانستان نے اپنے سرکاری مطبع سے قرآنی متن کے ساتھ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ اور مولانا شبیر احمد صاحب کے حواشی کو افغانی مسلمانوں کے فائدے کے لیے فارسی میں ترجمہ کر کے چھاپا ہے۔"[3]

تفسیر معارف القرآن

مولانا حافظ محمد ادریس کاندھلوی

اسی نام کی تفسیر مفتی اعظم محمد شفیع رحمتہ اللہ علیہ کی بھی ہے جس کے بارے میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ معارف القرآن نام کی یہ دوسری تفسیر مولانا حافظ محمد ادریس کاندھلوی (۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء - ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء) کی لکھی ہوئی ہے۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے دار العلوم دیوبند

---

[1] یادِ رفتگاں ص ۲۹۷

[2] ایضاً ص ۲۵۷

[3] یادِ رفتگاں۔ شائع کردہ مجلس نشریات اسلام، ۱-کے-۳ ناظم آباد مینشن ناظم آباد ۱ کراچی ص ۳۹۸

میں پڑھ کر سند فراغ حاصل کی۔ وہ امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے شاگرد تھے۔ بعد فراغت مدرسہ امینیہ دہلی، دار العلوم دیوبند حیدر آباد دکن اور جامعہ عباسیہ بہاولپور میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ ۲۴ سال جامعہ اشرفیہ لاہور میں بطور شیخ الحدیث تدریس پر مامور رہے۔ ۱۹۷۴ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ حضرت مولانا جیّد عالم ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ زندگی نہایت سادہ تھی۔ زہد و ورع اور فروتنی اور کسر نفسی آپ کی نہایت نمایاں صفات تھیں۔ سالہا سال دیوبند میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے کام کیا۔ لہٰذا اس علم سے آپ کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی۔ اسی مناسبت کی بناء پر آپ نے یہ عظیم کام انجام دیا۔ لیکن یہاں بھی اسی عجز و انکسار کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اس تفسیر میں جو کچھ بھی علم ہے وہ سب کا سب خسروانِ علم و حکمت کے دسترخوان کی بھیک ہے۔ میں نے ان دروازوں کے نام بھی ظاہر کر دیتے ہیں جہاں سے یہ بھیک ملتی ہے۔ تاکہ اگر کسی کو کچھ اور مانگنا ہو تو براہ راست وہاں سے مانگ لے۔"

تفسیر معارف القرآن میں ترجمہ حضرت شاہ عبد القادر کا ہے اور تفسیر میں متقدمین اور متاخرین کی کتب تفسیر کا خلاصہ ہے۔ کچھ جلدیں حضرت مولانا نے خود شائع کی تھیں۔ باقی جلدیں آپ کے فرزند مولانا مالک کاندھلوی نے مکمل کیں۔[1]

---

[1] معارف قرآن صفحات ۲۱۶، ۲۱۷ ـ ۲۱۸

معالم التنزیل

مولانا محمد علی صدیقی

یہ ترجمہ اور تفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے بھانجے مولانا محمد علی صدیقی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ وہ دار العلوم شہابیہ سیالکوٹ کے بانی ہیں۔ انھوں نے "معالم التنزیل" کے نام سے اپنی مجوزہ تفسیر کی کئی جلدیں شائع کر دی ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے پیش نظر ایک بڑا منصوبہ ہے اس لیے ابھی یہ کام جاری ہے۔ خیال ہے کہ تکمیل کے بعد اس تفسیر کی تیس جلدیں ہونگی۔[1]

تفسیر ہدایتُ القرآن

مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی

یہ تفسیر الگ الگ پاروں کی صورت میں مکتبہ حجازیہ دیوبند سے شائع ہوئی ہے۔ مفسر مولانا محمد عثمان کاشف ہاشمی ہیں۔

مولانا ہاشمی کا انداز یہ ہے کہ وہ متن قرآن کے نیچے ترجمہ نہیں لکھتے۔ بلکہ متن کے اختتام پر تمام مشکل الفاظ کے معانی لکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد سامنے کے صفحہ پر ترجمہ اور مختصر تفسیر لکھتے ہیں۔ یہ انداز ان لوگوں کے لیے بے حد مفید ہے جو قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ ترجمہ عام فہم اور تفسیر مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے۔[2]

---

[1] تعارف قرآن ص ۳۳۸

[2] ایضاً ص ۳۴۱

تفسیر تیسیر القرآن

مولانا قاضی شمس الدین

یہ تفسیر مولانا قاضی شمس الدین نے لکھی ہے۔ قاضی صاحب کا وطنی تعلق ضلع اٹک سے ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی اور وہیں سے سندِ فراغ حاصل کی۔ فراغت کے بعد گوجرانوالہ۔ دارالعلوم دیوبند۔ پنڈی گھیب اور فیصل آباد میں درس و تدریس کا کام انجام دیا۔ ۱۹۶۰ء میں مدرسہ صدیقیہ گوجرانوالہ کی بنیاد رکھی اور وہاں دورہ حدیث و تفسیر کے طلبہ کو سالہا سال فیض پہنچایا۔ انھوں نے یہ تفسیر چار جلدوں میں لکھی ہے اور بہت خوب ہے۔[1]

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق کے مطابق اردو زبان میں تراجم و تفاسیر کی تعداد تین سو سے متجاوز ہے۔ الغرض دنیا کی زبانوں میں تنہا اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ موجود ذخیرۂ تفسیر کو دیکھ کر یہ کہنا شاید مشکل نہیں کہ ہند و پاک میں قرآن پر اس مختصر عرصہ میں خاصا کام ہوا ہے۔[2]

---

1. تعارف قرآن ص ۳۴۶
2. دائرہ معارف اسلامیہ: پنجاب یونیورسٹی۔ ج ۶ ص ۵۳۵

تفاسیر کے اردو تراجم

علماء نے قرآن کریم کی تفسیریں براہِ راست اردو میں لکھنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ دوسری زبانوں میں لکھی جانے والی تفاسیر کو بھی اردو میں منتقل کیا۔ چنانچہ تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ ترجموں کے ذریعہ بھی اردو کے تفسیری ادب میں کافی اضافہ ہوا ہے اور یہ سلسلہ دکنی اردو کے زمانے سے ہی جاری ہے۔ فارسی میں لکھی جانے والی تفسیر حسینی کا ترجمہ اب سے صدیوں پہلے ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس کے حوالے جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے جیسے اردو ادب میں اضافہ ہوتا رہا ویسے ویسے اہم تفاسیر کا ترجمہ کبھی عربی اور فارسی سے اردو میں ہوتا رہا۔ بعد میں انگریزی میں لکھی جانیوالی تفسیریں بھی اردو میں منتقل ہوئی ہیں۔ جیسے احمدیہ انجمن کے سربراہ مولانا محمد علی لاہوری کی انگریزی تفسیر۔

اس وقت ان تفاسیر کی تعداد بھی کافی ہے جو ترجمہ کے ذریعہ مختلف زبانوں سے اردو میں منتقل ہو چکی ہیں۔ ذیل میں ان میں سے چند کے بارے میں لکھا جا رہا ہے۔

تفسیر ابن عباس

اردو ترجمہ مولانا عابد الرحمٰن صدیقی، مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی

یہ ان تفاسیر میں سے ہے جو دورِ صحابہ میں کی گئیں۔ ان کے بیان کرنیوالے خود صحابیٔ رسول حضرت عبد اللہ ابنِ عباسؓ ہیں۔ ان کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

سے دوہری قرابت داری تھی۔ وہ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ کے صاحبزادے ہونے کی وجہ سے آپ کے چچازاد بھائی بھی تھے اور ام المومنین حضرت میمونہ رضہ کی بہن لبابہ بنتِ حارث کے بطن سے ہونے کے سبب آپؐ کے بھانجے بھی تھے۔ ان کی ولادت اس زمانہ میں ہوئی جب حضورؐ مع صحابہ شعب ابی طالب میں محصور تھے۔ اور یہ زمانہ تین سال کا ہے۔ لہٰذا وثوق سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی پیدائش کے وقت شعب ابی طالب کے قیام کا کون سا سال تھا۔ اسی لیے مورخین کے درمیان ان کی عمر کے بارے میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ صاحبِ مشکوٰۃ شیخ ولی الدین ابی عبداللہ محمد "اکمال فی اسماء الرجال" میں بیان کرتے ہیں کہ "جب آنحضورؐ کی وفات ہوئی تو ان کی عمر ۱۳ سال کی یا ۱۵ سال کی تھی"[1] اس سے کچھ آگے وہ لکھتے ہیں "(وہ) امتِ محمدیہ کے بڑے عالم اور بہترین اشخاص میں سے تھے۔ آنحضورؐ نے حکمت، فقہ، تاویل قرآن کی ان کو دعا دی"[1] غلام احمد حریری مولف تاریخ تفسیر و مفسرین رقم طراز ہیں:

"ہمارے خیال میں عباس کی علمی شہرت و وسعت کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

(۱) اس کی سب سے بڑی وجہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت دعا تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ

ترجمہ: اے اللہ اس کو دین کو فہم عطا کر اور اسے قرآن کی تفسیر سکھادے۔

[1] اکمال فی اسماء والرجال (اردو) مولف صاحب مشکوٰۃ شیخ ولی الدین ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب رحمہم اللہ تعالیٰ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی ص ۵۳۲

دوسری روایت میں یوں ہے

اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (ترجمہ) اے اللہ اسے کتاب و حکمت سکھادے۔

جو شخص کتاب تفسیر بالماثور سے آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ ابن عباسؓ سے جو روایات صحیحہ تفسیر کے سلسلہ میں منقول ہیں ان میں دعائے نبوی کی تاثیر صاف جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

(۲) ابن عباس خاندانِ نبوت میں پروان چڑھے اور آغازِ طفولیت سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وابستہ فتراک رہے۔ اس کے نتیجہ میں انھوں نے بہت کچھ آپ سے سنا اور ان احوال و حوادث میں بذاتِ خود شریک ہوئے جن کے بارے میں قرآن نازل ہوا تھا۔

(۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابن عباس اکابر صحابہ کی صحبت میں رہ کر ان سے اخذ و استفادہ کرتے رہے۔

(۴) آپ عربی زبان اور ادب اور اس کے خصائص و اسالیب کے یگانہ روزگار فاضل تھے نیز اوقات عرب اشعار سے استشہاد فرماتے"[1]

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آپؓ اپنی خالہ ام المومنین حضرت میمونہ رضہ کی وجہ سے عہدِ رسالت کے آخری دو تین سالوں میں زیادہ تر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے تھے بلکہ کبھی کبھی

[1] تاریخ تفسیر و مفسرین۔ تالیف غلام احمد حریری۔ ملک سنز فیصل آباد ص ۲۹ (۰)

رات بھی کاشانۂ نبوت میں گزارتے تھے اور آپ کے ساتھ نماز تہجد اور تلاوت کلام پاک میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔ اس لیے ان کو حضور ؐ سے استفادہ کا کافی موقع ملا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے دو مرتبہ حضرت جبرئیل امین کو دیکھا بھی تھا۔[1]

حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں بہت مقرّب تھے۔ وہ ان کو اپنے نزدیک جگہ دیتے تھے اور جلیل القدر صحابہ کے ساتھ مشورہ ذلیے میں ان کو بھی شریک فرمایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس آیت کی تفسیر دریافت کی

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ (الانبیاء۔ ۳۰)

ترجمہ: کیا کفار نے دیکھا نہیں کہ آسمان و زمین بند تھے پھر ہم نے اس کو کھول دیا۔[2]

آپ نے کہا ابن عباس کے یہاں جاؤ اور جو تفسیر بیان کریں مجھے بتاتے جاؤ۔ ابن عباس نے فرمایا، "اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ آسمان خشک تھے۔ ان سے بارش نہیں ہوتی تھی اور زمین بانجھ تھی اس لیے کچھ اگتا نہیں تھا۔ بارش کے طفیل یہ پودے اگانے لگی۔ گویا آسمان کا فتق (پھٹاؤ) بارش کے ساتھ ہے اور زمین کا پھل پودے اگانے سے۔" اس شخص نے جاکر یہ تفسیر حضرت ابن عمرؓ کو بتائی۔ انھوں نے یہ سن کر فرمایا، "میں

---

[1] الکمال فی اسماء الرجال ص ۵۳۲
[2] ایضاً ص ۵۳۲

کہا کرتا تھا کہ ابن عباس کی یہ تفسیر قرآن میں جرأت مجھے پسند نہیں۔ مجھے اب پتہ چلا کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے خصوصی علم ودیعت ہوا ہے۔[1]

چونکہ حضرت عباسؓ اور بعد میں حضرت ابن عباسؓ کا گھربار اور زمین جائیداد مکہ اور طائف میں تھی اس لیے ان کا قیام دورِ خلافت میں زیادہ تر مکہ میں رہا۔ اور وہیں وہ قرآن، تفسیر اور حدیث کا درس دیتے رہے۔ آخر عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی ۶۸ھ میں جب ان کا قیام طائف میں تھا انھوں نے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

حضرت ابن عباس کے زمانہ میں تعلیم زبانی ہوتی تھی۔ اور علوم اسلامی تحریر میں نہیں آئے تھے اس لیے ان سے جو تفسیر منسوب ہے وہ بعد میں اہل علم نے ان کی مرویات سے لکھی ہے۔ اس لیے وثوق سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ تفسیر الحاقات سے پاک صاف ہے۔ تاہم یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس میں بہت سا حصہ ان کا بیان کردہ ہے۔[2]

یہ تفسیر مصر سے کئی بار چھپ چکی ہے۔ اس کو ابو طاہر محمد بن یعقوب الفیروز آبادی شافعی نے جمع کیا ہے۔

تفسیر ابن عباس کا اردو ترجمہ تین جلدوں میں مولانا عبدالرحمٰن صدیقی نے کیا ہے۔ قرآنی آیات کے نیچے مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ دیا گیا ہے اور تفسیر کا ترجمہ اس کے بعد ہے۔[3] دوسرا ترجمہ محمد رمضان اکبرآبادی شاگرد مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا ہے۔

---

[1] تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۷۰
[2] تعارف قرآن ص ۹۴
[3] تعارف قرآن ص ۳۴۳

جامع البیان فی تفسیر القرآن

چونکہ یہ عظیم مورخ و محدث ابن جریر طبری کی لکھی ہوئی تفسیر ہے اسلیے اس کو تفسیر طبری کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ مفسّر علام کا پورا نام محمد بن جریر بن یزید طبری اور کنیت ابو جعفر ہے۔ وہ اپنے زمانے کے بڑے عالم اور مجتہد تھے۔ مختلف علوم پر ان کو دسترس حاصل تھی چنانچہ ہر علم پر ان کی نہایت ضخیم تصانیف تھیں لیکن اب ان میں سے صرف دو باقی ہیں۔ (۱) تفسیر قرآن (۲) تاریخ الامم والملوک۔ طبری کی ولادت ۲۲۴ھ میں علاقہ طبرستان میں ہوئی تھی۔ تحصیلِ علم کے لیے وہ مختلف دیار و امصار میں گھومے پھرے اور آخر کار بغداد میں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں رہ کر تمام علمی کام کیے اور آخر کار شوال ۳۱۰ھ میں فوت ہوگئے۔ شروع دس سال وہ فقہ کے شافعی مسلک کو اختیار کیے رہے۔ اس کے بعد اجتہاد سے کام لے کر خود اپنا جداگانہ مسلک قائم کیا جس کی وجہ سے خاص طور پر حنبلیوں سے تصادم ہوا مگر انھوں نے اپنے مسلک سے رجوع نہیں کیا۔ اس لیے ان کی جماعت کو فرقہ جریریہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ چونکہ ان کے فقہ میں بعض باتیں شیعہ مسلک کی بھی ہیں اس لیے بعض لوگ تو ان کو ایک شیعہ فرقہ کا سربراہ کہتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ "وہ شیعہ کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے"۔ بعض حضرات صرف اسقدر کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ "آپ میں کسی حد تک تشیع پایا جاتا ہے جو چنداں ضرر رساں نہیں"۔ قطع نظر اس کے کہ کون صحیح ہے اور کون غلط، یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ ان کے فقہ پر اب دنیا کے کسی حصہ میں عمل نہیں ہوتا۔ البتہ ان کی

لکھی ہوئی تاریخ اور تفسیر آج بھی دنیا میں قدر کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

جہاں تک "تفسیر قرآن" کا تعلق ہے وہ بھی ان کی دوسری تصانیف کی طرح ناپید ہو چکی تھی لیکن اتفاق سے اس تفسیر کا ایک کامل مخطوطہ امرائے نجد میں سے امیر حمود بن عبدالرشید کے ذخیرۂ کتب میں سے مل گیا۔ اور تھوڑی ہی مدت گزرنے کے بعد اس کو نقل کر کے چھپوا دیا گیا۔ اور اب یہ بہت سی جگہوں پر دستیاب ہے۔

تفسیر ابن جریر تیس ۳۰ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ ایسی صورت میں اگر اس کو تفسیر کی انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ بہت سے علماء اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں

امام نووی کی رائے ہے کہ:

"اس امر پر پوری امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ تفسیر ابن جریر جیسی کوئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی۔ (الاتقان)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ حنبلی فرقہ کے امام ہونے کے باوجود فرماتے ہیں۔

"لوگوں میں جو کتب تفسیر متداول ہیں، تفسیر ابن جریر ان سب سے صحیح تر ہے۔ اس میں علمائے سلف کے اقوال صحیح سند کے ساتھ مذکور ہیں۔ ابن جریر مقاتل بن سلیمان اور کلبی جیسے جھوٹے راویوں سے روایت نہیں کرتے"۔

(فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۲ ص ۱۹۲)

امام جلال الدین سیوطی رقم طراز ہیں:

"تفسیر ابن جریر جملہ کتب تفسیر سے اعظم و افضل ہے۔ اس میں تفسیری اقوال کی توجیہ و ترجیح کلمات کی نحوی حالت اور

استنباط مسائل سے تعرض کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ تفسیر سابقہ کتب تفسیر پر فوقیت رکھتی ہے۔" (الاتقان جلد۲ ص ۱۹۰)

غلام احمد حریری اپنی تالیف، "تاریخ تفسیر و مفسرین" میں لکھتے ہیں:

"ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ تفسیر ابن جریر کو باقی کتب تفسیر کے مقابلہ میں دونوں قسم کا شرف تقدم حاصل ہے۔ چنانچہ یہ تفسیر زمانی سبقت و تقدم کی بھی حامل ہے اور فنی اعتبار سے بھی دیگر تفاسیر پر برتری رکھتی ہے۔ سبقت زمانی تو اس لیے کہ یہ اولین تفسیر ہے جو ہم تک پہنچی۔ اس سے قبل تفسیر کے سلسلہ میں جو کوششیں کی گئیں وہ گردشِ ایام کے ساتھ رخصت ہو گئیں اور ان میں سے کچھ بھی باقی نہیں ماسوا ان اقوال کے جن کو ابن جریر نے اپنی کتاب میں سمو لیا ہے۔ جہاں تک اس تفسیر کی فنی برتری کا تعلق ہے اس کا مدار و انحصار اس کے اسلوبِ نگارش پر ہے جو مؤلف نے اختیار کیا ہے۔"

اتنی ضخیم کتاب کا ترجمہ کرنا ویسے بھی مشکل ہے پھر اس زمانہ میں اردو داں طبقہ میں کتنے فی صد لوگ ایسے ہوں گے جو اس کو پڑھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔ ابھی تک اس پوری تفسیر کو اردو میں منتقل نہیں کیا جا سکا۔ صرف پہلے پارہ کا ترجمہ ہوا ہے جس کو بیت الحکمۃ دیوبند کی جانب سے شائع کیا گیا تھا۔

تفسیر القرآن العظیم ابن کثیر[1]

مترجم مولوی محمد

کتب تفسیر میں تفسیر ابن جریر کے بعد اس تفسیر کا درجہ ہے۔ اس کے

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مصنف حافظ ابن کثیر کا پورا نام عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر ہے۔ ان کا جدی وطن شام کا قدیم شہر بصریٰ تھا۔ یہ وہی بصریٰ ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بارہ سال کے سن میں اپنے چچا کے ساتھ تشریف لے گئے تھے۔ اور وہاں بحیریٰ راہب سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی۔ ابن کثیر ۷۰۱ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کے انتقال کے بعد سات سال کے سن میں اپنے بھائی کی رفاقت میں دمشق چلے گئے۔ وہاں بہت سے علماء سے علم حاصل کیا۔ ان میں ابن شحنہ آمدی، ابن عساکر، علامہ مزی کے اسماء قابلِ ذکر ہیں۔ آخر میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سے فیضیاب ہوئے۔ ان کا اثر اتنا زیادہ اثر ہوا کہ مستقلاً ان سے تعلق قائم ہو گیا۔ اگرچہ بنیادی طور پر ابن کثیر کا فقہی مسلک شافعی تھا لیکن بہت سے مواقع پر انھوں نے حنبلی فقہ پر عمل کیا۔ چنانچہ طلاق کے مسئلہ میں ابن کثیر امام ابن تیمیہ کے مسلک کے مطابق فتویٰ دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن تیمیہ کی طرح ان کو بھی اذیتیں دی گئیں۔ ماہِ شعبان ۷۷۴ھ میں فوت ہوئے اور مقبرہ صوفیہ میں اپنے استاد امام ابن تیمیہ کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

حافظ ابن کثیر کا علمی پایہ نہایت بلند تھا۔ علماء نے آپ کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ علامہ داؤدی طبقات المفسرین میں لکھتے ہیں:

"آپ اپنے عصر و عہد کے یکتائے روزگار فاضل اور حافظ حدیث تھے۔ امام ذہبی اور سبکی کی وفات کے بعد مدرسہ اشرفیہ کے صدر المدرسین قرار پائے۔" (طبقات المفسرین داؤدی ص ۳۲۷)

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) [1] تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ مطبوعہ علمی برقی پریس دہلی اور تفسیر ابن کثیر اردو شائع کردہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ۔ کراچی

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

"ابن کثیر نے حدیث کے متون و رجال کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ تفسیر قرآن سے متعلق مواد فراہم کیا۔ . . . . تاریخ اسلام کے موضوع پر اپنی عظیم کتاب "البدایہ والنہایہ مرتب کی"

علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ:

"ابن کثیر بڑے محدث، فقیہہ، مفسر اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے"

تفسیر ابن کثیر قرآن کریم کی تفسیر ماثور پر مشتمل کتب میں خاص درجہ شہرت رکھتی ہے۔ یہ تفسیر چار ضخیم جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تفسیر ماثور میں جو اسرائیلی واقعات مندرج ہیں وہ اجمالاً اور بعض اوقات تفصیلاً اس پر نقد و جرح کرتے ہیں۔ مثلاً آیت کریمہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً (سورہ بقرہ ۶۷) کی تفسیر کرتے ہوئے بنی اسرائیل کی گائے کا طویل قصہ ذکر کیا ہے۔ پھر اس میں سلف سے منقول روایات تحریر کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

ابو عبیدہ، ابو العالیہ اور سدی سے جو روایات منقول ہیں ان میں اختلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ روایات بنی اسرائیل کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ بلاشبہ ان کو نقل کرنا درست ہے مگر ان کی تصدیق و تکذیب نہیں کی جاسکتی لہٰذا ان پر اعتماد کرنا درست نہیں ماسوا اس روایت کے جو اسلامی حقائق سے لگا کھاتی ہو"

تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ کئی جلدوں میں ہو چکا ہے۔ مترجم مولوی محمد صاحب سابق مدرس و مہتمم مدرسہ محمدیہ و مالک و متصرم اخبار محمدی

بارہ ہندوراؤ دہلی ہیں۔ جلد اول میں پہلے چند سیپاروں کا ترجمہ و تفسیر ہے۔ ترجمہ نہایت رواں اور با محاورہ ہے۔ غرض اس تفسیر کے ترجمہ سے اردو کے تفسیری ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

تفسیر جلالین[1]

مترجم علام محمد مہدی اور مولانا محمد ابو ذر سنبھلی

جلالین لفظ جلال کا تثنیہ ہے جس کے معنی دو جلال ہیں۔ چونکہ یہ تفسیر جلال الدین نام کے دو بزرگوں نے لکھی ہے اس لیے اس کو تفسیر جلالین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پہلے بزرگ جنہوں نے اس کام کو شروع کیا جلال الدین محمد بن احمد بن محمد بن ابراہیم المحلی الشافعی تھے۔ دوسرے امام جلال الدین سیوطی۔

جلال الدین محلی ۷۹۱ھ میں مصر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے جملہ علوم میں مہارت حاصل کی۔ وہ نہایت ذکی و فہیم، عابد و زاہد اور متقی و پرہیزگار انسان تھے۔ حق کے اظہار میں نہایت نڈر اور بے باک تھے۔ کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ حکومت کی جانب سے انھیں قاضی القضاۃ کا منصب پیش کیا گیا مگر انھوں نے قبول نہیں کیا بلکہ زندگی بھر تجارت سے اپنی روزی پیدا کی۔ ان کا انتقال یکم محرم ۸۶۴ھ کو ہوا۔

علامہ جلال الدین سیوطی ۸۴۹ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابو بکر سیوطی ہے۔ آپ شافعی المسلک تھے۔ پانچ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ باپ نے انتقال سے پہلے آپ کو چند لوگوں کی تحویل میں

---

[1] کمالین شرح اردو جلالین شریف۔ مکتبہ شرکت علمیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان شہر

دے دیا تھا۔ کچھ تو ان لوگوں کی توجہ سے اور کچھ اپنی ذاتی صلاحیت اور فطرت سلیم کی بدولت نیک راہ پر گامزن ہوئے اور جملہ علوم و فنون میں مہارت حاصل کی۔ ان کے اساتذہ اور شیوخ کی تعداد اکیاون ہے۔ ان کا شمار کثیر التصانیف علماء میں ہوتا ہے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ پانچ سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مؤلف تھے۔ جن میں سے الاتقان، الدُّرُّ المَنثُورِ فِی التَّفسِیرِ المَاثُور اور تاریخ الخلفاء کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ تفسیر جلالین کی تکمیل آپ نے کی۔ ۹۱۱ھ میں فوت ہوئے۔

صاحب کشف الظنون حاجی خلیفہ کے بیان کے مطابق تفسیر جلالین کے پہلے پندرہ پارے سورہ بنی اسرائیل کے اختتام تک شیخ جلال الدین محلی نے مکمل کیے اور آخر کے پندرہ پاروں کی تفسیر جلال الدین سیوطی نے کی۔ اس میں سورہ فاتحہ کی تفسیر بھی شامل ہے

لیکن اس معاملہ میں صاحب کشف الظنون کو تسامح ہوا ہے۔ اس لیے کہ علامہ سیوطی خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے یہ تفسیر سورہ بقرہ سے سورہ اسراء تک مکمل کی۔ جہاں سورہ الاسرا ختم ہوتی ہے وہاں تحریر کیا ہے کہ میں نے جو تفسیر کی تکمیل کرنی چاہی تھی یہ اس کا اختتام ہے (مقدمہ جلالین ج ۱، ص ۲۳۷

حقیقت یہ ہے کہ امام جلال الدین المحلی نے تفسیر جلالین کا آغاز سورہ الکہف سے کر کے سورہ الناس پر اس کو ختم کیا۔ پھر سورہ الفاتحہ سے آغاز کیا۔ لیکن اس سورہ کی تفسیر ابھی ختم ہی کی تھی کہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ باقی کام امام جلال الدین سیوطی نے انجام دیا۔ انھوں نے سورہ البقرہ سے شروع کر کے سورہ الاسراء پر ختم کر دیا۔ سورہ الفاتحہ کی تفسیر چونکہ جلال الدین محلی کر چکے تھے اس لیے ان کے کام کے ساتھ ملانے

کے لیے اس کو سورہ الناس کے بعد لگا دیا۔[1]

تفسیر جلالین نہایت مختصر، دلکش اور عمیق عبارت میں ہے اس لیے ہر زمانہ میں نہایت مقبول ہوئی۔ اور نصاب میں داخل رہی۔ اس وقت بھی درس نظامی میں تفسیر کی بنیادی کتاب یہی قرار دی جاتی ہے۔ اس کی اسی مقبولیت و اہمیت کی وجہ سے اس پر بہت کام ہوا ہے۔ اردو میں بھی اس کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں۔ ایک ترجمہ اور شرح کمالین کے نام سے استاد تفسیر دارالعلوم دیوبند مولانا محمد نعیم صاحب نے کیا ہے جو مکتبہ شرکت علمیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان شہر سے شائع ہوا ہے۔ ترجمہ نہایت رواں اور شگفتہ ہے۔ اور تفسیر جلالین کے اختصار کی وجہ سے جو باتیں طلبہ کے لیے قابل فہم نہیں ان کی آسان زبان میں تشریح کر دی گئی ہے۔ غرض کمالین شرح اردو جلالین قرآن فہمی کے لیے نہایت مفید ہے۔

تفسیر جلالین کا ایک ترجمہ غلام محمد مہدی نے کیا ہے جو ۱۲۷۵ھ میں شائع ہوا تھا۔ ایک اور ترجمہ مولانا محمد ابوذر سنبھلی نے کیا تھا جو ۱۹۰۵ء میں اعجاز محمدی پریس آگرہ سے چھپا تھا۔

تفسیر مظہری[2]

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی

مترجم مولانا سید عبدالدائم جلالی

کسی ہندی نژاد کے قلم سے عربی زبان میں لکھی جانے والی غالباً یہ سب سے پہلی اور واحد تفسیر ہے جو اتنی تفصیلی، اس قدر جامع اور ایسی سادہ اور واضح ہے اور

۱۔ تاریخ تفسیر و مفسرین (غلام احمد حریری) ص ۲۸۹

۲۔ تفسیر مظہری اردو ترجمہ از مولانا سید عبدالدائم الجلالی، شائع کردہ ایچ ایم سعید کمپنی۔ ادب منزل، پاکستان چوک۔ کراچی

امتدادِ زمانہ کے باوجود جس کی شہرت و مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ یہ تفسیر حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی نے اب سے تقریباً دو سو سال پہلے لکھی تھی۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی متوفی ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء اپنے زمانہ کے عظیم محدث اور مفسر تھے۔ قاضی صاحب پانی پت کے رہنے والے تھے۔ انتہائی ذہین اور ذکی الطبع تھے کہ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا اور سولہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہو گئے۔ حدیث کی سند امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی سے حاصل کی۔ سلسلہ طریقت میں اول شیخ محمد عابد سے استفادہ کیا۔ ان کی رحلت کے بعد حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں سے بیعت ہوئے۔ ان کے علو مرتبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اپنے انتہائی علم و فضل کے باوجود ان کو ”بیہقیٔ وقت“ کہتے تھے اور خود ان کے شیخ طریقت مرزا مظہر جانِ جاناں ان کو علم الہدیٰ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔[1]

قاضی صاحب تقویٰ و دیانت میں نہایت ممتاز بلکہ بے مثال تھے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، کلام اور تصوف میں یگانۂ روزگار سمجھے جاتے تھے۔ یوں تو آپ نے مختلف علوم پر کتابیں لکھی ہیں لیکن آپ کی زیادہ شہرت آپ کی تفسیر قرآن کی وجہ سے ہے۔ اس تفسیر کو قاضی صاحب نے اپنے مرشد مرزا مظہر کے نام معنون کرتے ہوئے اس کا نام تفسیر مظہری رکھا اور آج تک یہ اسی نام سے شائع ہوتی رہی ہے۔

۱؎ تعارف قرآن — حواشی صفحات ۱۵۹، ۱۶۰

تفسیر مظہری کا اسلوب سادہ اور بے تکلفانہ ہے۔ قاضی صاحب نے امام جلال الدین سیوطیؒ کی تفسیر ”درِ منثور“ کا طرز اختیار کیا ہے یہی طرز سلف صالحین کا ہے۔ آپ ہر آیت کے مضمون کو احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال سلف سے واضح فرماتے ہیں۔ چونکہ بنیادی طور پر ایک حنفی فقیہ ہیں۔ اس لیے آیاتِ قرآنی سے فقہی مسائل اور شرعی احکام کا استنباط نہایت اچھے انداز سے کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی احناف و شوافع وغیرہ کے نظریاتی اختلافات بھی واضح کر دیئے ہیں۔ تفسیر مظہری میں فقہ کے بے شمار مسائل بکھرے پڑے ہیں۔ اور تاریخ ادبیات کے بیان کے مطابق اگر ان مسائل کو جمع کیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب الفتاویٰ مرتب ہو سکتی ہے۔[1]

اس تفسیر کی بے پناہ افادیت کو دیکھتے ہوئے ندوۃ المصنفین دہلی کے رکن مولانا عبدالدائم جلالی رامپوری نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا اور ندوۃ المصنفین نے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۱ء تک کے عرصہ میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ دس جلدوں میں شائع کیا۔ پھر پاکستانی مسلمانوں کے فائدہ کے لیے سعید اینڈ کمپنی کراچی نے بارہ جلدوں میں چھاپ کر وقفِ عالم کیا۔ چنانچہ کمپنی کے مالک محترم حاجی محمد زکی صاحب پہلی جلد میں عرضِ ناشر کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں۔

> ”اس اہم تفسیر کے گوناگوں فوائد اور دورِ حاضر کی اہم ضرورت کے پیشِ نظر بفضلہ تعالیٰ ہم نے اس اہم کام کی اشاعت کی ہمت کی تھی۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ جون ۱۹۷۹ء

۱؎ تعارف قرآن ص ۲۵۲

میں بارہویں جلد کی اشاعت پر یہ تفسیر مکمل ہوگئی۔"[1]

بیان القرآن[2]

مولانا محمد علی لاہوری

یہ ترجمہ وتفسیر، مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مشہور تفسیر بیان القرآن سے مختلف ہے۔ اس کے لکھنے والے لاہوری احمدیہ جماعت کے سرخیل مولانا محمد علی لاہوری ہیں اور اس کو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے شائع کیا ہے۔ مولانا محمد علی نے ابتداءً قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر انگریزی زبان میں کیا تھا۔ لیکن پھر اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی غرض سے اس کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ چونکہ اردو میں تفسیر کو زیادہ پھیلا کر بیان کیا گیا ہے اس لیے اس کی ضخامت کافی بڑھ گئی ہے۔ پہلی مرتبہ سہولت کے خیال سے اس کو تین جلدوں میں چھاپا گیا تھا۔ یہ ایڈیشن ۱۹۲۲ء تک کے عرصہ میں شائع ہوا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد اس کے تین ایڈیشن ایک ایک جلد میں شائع ہوئے ہیں۔ یعنی ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۲ء اور ۱۹۸۰ء میں اس کو نہایت اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ مترجم ومفسر خود تمہید فرماتے ہیں:

" وہ مقدس پیغام (قرآن کریم) ان لوگوں کی زبان میں نازل ہوا جنھوں نے دنیا میں اس کے حامل بننا تھا۔ مگر آج اس عالم کے مختلف اطراف واکناف میں رہنے والے مسلمان اس زبان

---

[1] تفسیر مظہری شائع کردہ ایچ ایم سعید کمپنی، عرض ناشر ص ۲

[2] بیان القرآن اردو ترجمہ از مولانا محمد علی۔ شائع کردہ احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام لاہور ۱۴۰۱ھ۔

سے ناآشنا ہیں۔ اور بہت ہیں کہ اس پیغام کو پڑھتے ہیں مگر انھیں علم نہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس پیغام کی غرض یہ تھی کہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں اور غلط راہوں کو چھوڑ کر اپنی دینی اور دنیوی فلاح کا صحیح راستہ اختیار کریں۔ تو اس کا مطلب سمجھے بغیر وہ غرض حاصل نہیں ہوسکتی۔ میں نے جب تبلیغِ اسلام کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے انگریزی میں اس پاک کلام کے ترجمہ اور مطلب کو بیان کیا تو بہت سے احباب نے یہ اصرار کیا کہ اردو زبان میں بھی اپنے اہلِ ملک کے فائدہ کے لیے اسے شائع کیا جائے۔ مگر یہاں کی ضروریات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے از سرِ نو یہ کام کرنا پڑا۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ ہر ایک مسلمان قرآن کریم کو پڑھے اور اس کے مطلب پر آگاہ ہو کر اپنی روزمرہ زندگی میں اور مشکلات پیش آمدہ میں اپنا ہادی اور رہنما بنالے۔ اس راہ کو اختیار کیے بغیر مسلمان کبھی موجودہ مشکلات سے باہر نہیں نکل سکتے۔"

آگے چل کر مترجم ومفسّر جناب محمد علی فرماتے ہیں:

" اس ترجمہ اور ان حواشی میں ایک بات کی طرف بالخصوص توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ قرآن کریم سے اجنبیت نے جن دلوں میں یہ خیال پیدا کیا ہے کہ اس پاک کتاب کے مضامین میں کوئی ترتیب نہیں انھوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ موجودہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہے اور یہ ایک ابلغ اور محکم ترتیب ہے۔ مخالفین میں غور وخوض کی کمی نے بے ترتیبی کا خیال پیدا کیا یہاں تک کہ اس زمانہ میں ایک مسلمان نے بھی ان خیالات سے

متاثر ہو کر ایک ترتیب نزول اپنے پاس سے بنا کر قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔۔۔۔۔۔"

غرض مترجم و مفسر نے سطور بالا میں جو خیالات پیش کیے ہیں وہ مسلمانوں کے سواد اعظم سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ بلکہ دیکھا جائے تو اس میں مرزا بشیر الدین محمود کی تفسیر صغیر سے نمایاں فرق نظر آئے گا۔ اس فرق کو جاننے کے لیے مندرجہ ذیل آیات کا ترجمہ اور تفسیر ملاحظہ کیجیے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۟ (۲۲: ۳۳: ۳۰)

ترجمہ: محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

تفسیر: خاتم النبیین کی تفسیر احادیث نبوی سے: خاتم النبیین کے معنی لغت سے اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام ایک قوم ہیں اور کسی قوم کا خاتم یا خاتم ہونا صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے یعنی ان میں سے آخری ہونا۔ پس نبیوں کے خاتم کے معنی نبیوں کی مہر نہیں بلکہ آخری نبی ہیں۔ یہاں ان سب احادیث کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں جن میں خاتم النبیین کی تشریح کی گئی ہے یا جن میں آنحضرت صلعم کے بعد نبی کا نہ آنا بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ احادیث متواترہ ہیں جو صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے مروی ہیں۔ اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت صلعم کے بعد نبی نہیں۔[1]

---

[1] بیان القرآن۔ از مولانا محمد علی لاہوری صفحہ (متن اور حاشیہ) ص ۱۱۰۳

ان کے علاوہ اور بہت سی مکمل اور نامکمل تفاسیر ہیں جو عربی یا فارسی سے اردو میں منتقل ہوئی ہیں۔ ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) التفسیرات الاحمد۔ اس کا پورا نام "التفسیرات الاحمدیہ فی بیان آیات الشرعیہ"، لیکن تفسیر احمدی کے نام سے مشہور ہے۔ اسکے مؤلف ملا جیون امیٹھوی (۱۰۴۷ھ تا ۱۱۳۰ھ) ہیں۔ اردو میں ترجمہ حکیم سید امیر حسن خاں سہانے کیا ہے۔

(۲) تفسیر عزیزی موسوم بہ تفسیر فتح العزیز از شاہ عبد العزیز محدث دہلوی۔ سورہ بقرہ حصہ اول ــــــ شائع کردہ ایچ ایم سعید کمپنی۔

(۳) انوار الرحمٰن ترجمہ و تفسیر آل عمران۔ ترجمہ عبد الصمد ــــــ شائع کردہ ادارہ علمیہ لاہور۔

(۴) بستان التفاسیر اردو تفاسیر اردو ترجمہ تفسیر فتح العزیز (فاتحہ و البقرہ) ــــــ مترجم محمد علی چاند پوری۔ مطبوعہ مطبع فاخری، دہلی۔

(۵) تفسیر ابن عربی۔ از شیخ اکبر محی الدین ابن عربی ــــــ ترجمہ از امیر حسن خاں سہا۔

(۶) انوار التنزیل۔ ترجمہ تفسیر بیضاوی (ابو الخیر عبد اللہ بن عمر البیضاوی متوفی ۶۸۵ھ) قاضی ناصر الدین مطبوعہ قاسمی پریس دیوبند۔

(۷) تفسیر فی ظلال القرآن (پارہ الم) از سید قطب شہید ــــــ ترجمہ مولانا ساجد الرحمٰن

منظوم تراجم و تفاسیر

(۱) ریاض دلکشا ــــــ تفسیر سورہ یوسف

(۲) تفسیر منظوم ــــــ آغا شاعر قزلباش دہلوی۔

باب پنجم

مذکورہ بالا جائزہ سے نتائج کا استخراج اور اس پر تبصرہ

اردو میں تفسیر نگاری کے مکاتبِ فکر

اور

ان کے اسلوب و منہاج کا جائزہ

قرآن کریم یقیناً کتابِ ہدایت ہے۔ جب اس کا نازل کرنے والا خود فرماتا ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ

لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی بتا رہا ہے کہ یہ کتاب اسی شخص کو ہدایت دیتی ہے جو ان باتوں پر یقین و ایمان رکھتا اور عمل کرتا ہو۔ یعنی وہ غیب پر ایمان رکھتا ہو، نماز ادا کرتا ہو اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کو دیا ہو اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہو۔

راہ ہدایت کے متلاشی کو ہدایت پانے کے لیے تین مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہو۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس کو سمجھے اور تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس کے مطابق عمل کرے۔ یہ تینوں مرحلے صحیح خطوط پر طے ہونے چاہئیں۔ یعنی اس کتاب کی تلاوت صحیح ہونی چاہیے اس کی تفہیم صحیح ہونی چاہیے۔ اور اس کے اوامر و نواہی کی تعمیل صحیح ہونی چاہیے۔

اور تلاوت تفہیم اور تعمیل کی صحت کی ضمانت صرف وہی ذات دے سکتی ہے۔ جس پر یہ کتاب نازل ہوئی اور جو نوعِ بشر کے لیے ہادی بن کر مبعوث ہوئی۔ وہ ذات حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اگر قرآن کریم کتابِ ہدایت ہے تو حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم ہادیٔ برحق ہیں۔ لہٰذا ہادیٔ برحق سے بڑھ کر صحیح ہدایت کون دے سکتا ہے۔ اور ہمارا صرف عقیدہ ہی نہیں ہے کہ ہدایت کے تینوں مرحلوں کی صحت کا حضورؐ نے پورا پورا اہتمام کیا۔ بلکہ اس کے لیے ہمارے پاس ایسے شواہد موجود ہیں جو ناقابلِ تردید ہیں اور جن کا اعتراف غیروں کو بھی ہے۔

قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ تو باری تعالیٰ نے خود یہ کہہ کر کیا ہے۔ "نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ" (ہم ہی نے اسے نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔) اس ذات نے تو اپنا وعدہ اس طرح پورا کیا کہ اس کتاب کا جتنا حصہ وہ نازل کرتا اتنا حصہ حضورؐ کے لوحِ قلب پر محفوظ ہو جاتا۔ پھر آپؐ اس کی حفاظت کا یہ انتظام کرتے کہ جو صحابی اس وقت آپؐ کے پاس موجود ہوتا اس کو وہ حصہ لکھوا دیتے اور زبانی یاد کرا دیتے۔ اس طرح کلام پاک سینہ اور سفینہ دونوں میں محفوظ ہو جاتا۔ اس اعلیٰ انتظام کی کسی قدر تفصیل ایک غیر مسلم سے سنیے۔ وہ کہتا ہے:

"تمام ذرائع اس بات پر متفق ہیں کہ جب قرآن کا کوئی جز نازل ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خواندہ صحابہ میں سے کسی ایک کو بلاتے اور اس وحی کا اس کو املا کرا دیتے اسی وقت اس بات کی بھی نشاندہی فرما دیتے تھے کہ جو کچھ

پہلے نازل ہو چکا ہے اس متن کے کس مقام پر اس نئے جز کو درج کیا جائے۔ ...... روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کاتبوں سے ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جو کچھ ان کو املا کرایا ہے اس کو آپؐ کے سامنے پڑھ کر سنائیں۔ تاکہ اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو آپؐ اسے درست فرما دیں۔ ایک اور مشہور روایت یہ بھی ہے کہ ہر سال ماہِ رمضان المبارک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پورا قرآن مجید (جتنا نازل ہو چکا ہوتا) حضرت جبرئیل کو پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت سے پہلے کے مہینے میں حضرت جبرئیل نے آپؐ سے دو مرتبہ پڑھوا کر سنا تھا۔ ...... یہ بات معلوم ہے کہ کس طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ سے مسلمان ماہِ رمضان کے دوران شب بیداری کرتے اور عام نمازوں کے علاوہ تمام قرآن کی تلاوت کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ کئی ذرائع سے مزید انکشاف ہوتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کاتب حضرت زیدؓ متون کے آخری مرتبہ جمع کرنے کے موقع پر موجود تھے۔ دوسری جگہ بہت سی دوسری شخصیتوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مومنین کو یہ بھی ہدایت فرمائی تھی کہ وہ قرآن کریم کو حفظ کریں۔ چنانچہ اگر پورا نہیں تو اس کا کچھ حصہ جس کی قرأت نمازوں میں کی جاتی تھی ضرور حفظ کر لیتے تھے۔ اس طرح

ایسے حفّاظ کی ایک جماعت پیدا ہو گئی جن کو تمام قرآن یاد تھا اور اس کو وہ حضرات دُور افتادہ مقام پر پھیلاتے تھے۔ متن کو دو طریقوں پر، یعنی تحریر اور حفظ کے ذریعہ محفوظ کرنے کا یہ قاعدہ بے انتہا مفید ثابت ہوا"[1]

یہ تو عہدِ رسالت میں قرآن کریم کی حفاظت کا انتظام تھا۔ اس کے بعد خلافتِ راشدہ میں اس کی صحت کا پورا خیال رکھا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت زیدؓ بن ثابت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھوائے ہوئے نسخہ کی نقل کرائی اور بقول مارِس بوکائیے خلیفہ ثانی کی تحریک پر زیدؓ نے مدینہ میں جتنی بھی معلومات فراہم ہو سکتی تھیں حاصل کیں۔ حفّاظ کی شہادت مختلف چیزوں پر افراد کی نجی طور پر لکھی ہوئی الکتاب کی نقلیں سب کچھ اس مقصد کے لیے تھا کہ نقل کرنے میں تمام ممکنہ غلطیوں سے بچا جا سکے۔ اس طرح قرآن کی ایک بے انتہا قابلِ اعتماد نقل تیار ہو گئی"[2]

یہ قابلِ اعتماد نقل حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کے پاس محفوظ رہی اور انھوں نے اپنی وفات کے وقت اپنی صاحبزادی حضرت حفصہؓ زوجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سپرد کی"[3]

---

[1] بائیبل، قرآن اور سائنس، مصنّفہ موریس بوکائیے (اردو) ناشر ادارہ القرآن والعلوم الاسلامیہ، ۴۳۲ ڈی۔ گارڈن ایسٹ نزد لسبیلہ چوک کراچی ۵ سنہ اشاعت فروری ۱۹۸۱ء ص ۱۶۲

[2] ایضاً ص ۱۶۲، ۱۶۳ [3] ایضاً ص ۱۶۳

حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت تک پہنچتے پہنچتے فتوحات کا
دائرہ کافی وسیع ہو چکا تھا۔ بہت سے وہ عرب قبائل جو دُور دراز
کے علاقوں میں آباد تھے، مسلمان ہوئے تو انھوں نے قرآن کریم کو اپنے
لہجہ اور قرأت میں پڑھنا شروع کر دیا۔ ادھر غیر عربوں میں اسلام
پھیلا تو چونکہ عربی زبان ان کے لیے اجنبی تھی اس لیے وہ صحیح قرأت کے
ساتھ قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ان قباحتوں کی وجہ سے اختلافات
اور تنازعات شروع ہو گئے۔ جب اس کی اطلاع حضرت عثمان غنیؓ
کو ہوئی تو صحابہ کے مشورے سے آپ نے سب مسلمانوں کو ایک قرأت
پر جمع کرنے کی تدبیر کی۔ چونکہ قرآن کریم کے مخاطب اول قریش تھے
اور خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق بھی اسی قبیلہ سے تھا۔
لہٰذا قریش کی قرأت کو ترجیح دی گئی اور خلیفہ ثالث نے اسی کے مطابق
کئی نقلیں کر کر ایک ایک نقل ہر صوبہ کے والی کے پاس بھجوادی اور یہ حکم
جاری کیا کہ سب مسلمانوں کو اسی کے مطابق قرأت کرنے کے لیے کہا جائے
تاکہ پوری اسلامی دنیا میں یکسانیت رہے اور کلام پاک جس شکل میں
نازل ہوا ہے اسی میں قائم و برقرار رہے۔ اس سلسلہ میں موریس بوکائیے
کا بیان بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ کہتا ہے:

"ممکن ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں یہ بات پیدا ہو کہ آخر وہ کیا
چیز تھی جس نے پہلے تین خلفا خصوصاً حضرت عثمانؓ کو قرآن
کریم جمع کرنے اور متن پر نظر ثانی کرنے کی جانب مائل کیا۔
وجوہات فی الحقیقت نہایت سادہ ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ
علیہ وسلم کی رحلت کے بعد ابتدائی دہائیوں میں اسلام کی
اشاعت بہت تیزی سے ہوئی۔ اور یہ ان قوموں میں پھیلا

جن کی مادری زبان عربی نہیں تھی۔ اس صورت میں یہ بات
ضروری ہوئی کہ ایک ایسا متن تیار کیا جائے جس میں ابتدائی
صحت برقرار رہے۔ حضرت عثمانؓ کے نظر ثانی کرانے کا یہی
مقصد تھا۔"[1]

ابتداً قرآن کریم میں نقطے اور اعراب نہیں تھے۔ عربوں کو اس کی زیادہ
ضرورت بھی نہیں تھی۔ لیکن غیر عربوں میں صحت کو برقرار رکھنے کے لیے اس چیز
کو ضروری سمجھا گیا۔ اور نقطے اور اعراب لگا کر قرآن کریم کی موجودہ شکل دے دی
گئی۔ اور یہ سب کام پہلی صدی ہجری ہی میں مکمل ہو گیا۔ ان سب تدابیر
کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہوا اور الکتاب آج تک اپنی اصلی
حالت میں محفوظ ہے۔ اور ان شاء اللہ تعالیٰ تا قیامت مستند رہے گا۔ یہاں
بھی موریس بوکائیے کی شہادت ملاحظہ ہو:

"حضرت عثمانؓ سے جن نسخوں کو منسوب کیا جاتا ہے وہ تاشقند
اور استنبول میں موجود ہیں۔ نقل کرنے میں ایک آدھ ممکنہ سہو
سے قطع نظر اس وقت جو قدیم ترین نسخے معلوم ہیں اور پوری
اسلامی دنیا میں دریافت ہوئے ہیں وہ یکساں ہیں۔ یہی بات
ان نسخوں پر بھی صادق آتی ہے جو یورپ میں محفوظ ہیں (پیرس کی
نیشنل لائبریری میں ایسے پارے موجود ہیں جو ماہرین کی
تحقیق کے بموجب آٹھویں اور نویں صدی عیسوی یعنی دوسری
اور تیسری صدی ہجری تک پرانے ہیں)۔"[2]

---

1. بائبل، قرآن اور سائنس ص ۱۶۳
2. ایضاً ص ۱۶۴

قرآن کریم کے متن کی صحت کے بارے میں اس قدر تفصیل سے لکھنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ کتاب ہدایت کی حفاظت کا وعدہ اللہ رب العزت نے کس کس طرح پورا کیا ہے۔ چودہ سو سال سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد بھی اس میں ایک نقطہ اور ایک شوشہ کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ دنیا کی کوئی کتاب بھی اس معاملے میں قرآن کریم کی سہیم و شریک نہیں ہے۔ دوسرے ان لوگوں کو توجہ دلانا مقصود ہے جو خود کو مسلمان کہلانے کے باوجود اس بات کے مدعی ہیں کہ قرآن میں ہر طرح کی تحریف ہوئی ہے۔ ان کو خدا کا خوف کرنے کی ضرورت ہے کہ اس طرح وہ اللہ کے اس ارشاد کے علی الرغم "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ" وہ اس کے وعدہ کو غلط قرار دے رہے ہیں۔ ساتھ ہی انھیں اس بات پر شرمانا چاہیے کہ ایک غیر مسلم نہایت وثوق سے کہہ رہا ہے کہ "اس وقت جو قدیم ترین نسخے معلوم ہیں اور پوری اسلامی دنیا میں دریافت ہوئے ہیں وہ یکساں ہیں۔ یہی بات ان نسخوں پر بھی صادق آتی ہے جو یورپ میں محفوظ ہیں۔"

بہرحال یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ قرآن کریم نزول کے وقت سے اب تک اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہے۔ لہٰذا تلاوت کی صحت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اور اس صحیح متن کی روشنی میں جو تفسیر کی جائے گی وہ بھی صحیح ہوگی۔ اور اس کے مطابق جو عمل کیا جائے گا وہ بھی عین منشاء الٰہی کے مطابق ہوگا۔

جیسا کہ صدر میں بتایا جا چکا ہے، قرآن کریم کے مخاطب اول عرب تھے جن کی زبان عربی تھی اور قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لیے اس کے معانی و مطالب سمجھنے میں تو انھیں کوئی دقت نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ چونکہ خالقِ دوجہاں کا کلام ہونے کی وجہ سے اس میں ایجاز و اختصار اور بیان و بلاغت کسی بھی انسان کے کلام سے بدرجہا فائق و برتر ہے۔ اس لیے اس کے

مقصود اصلی تک پہنچنا ہر عرب کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ اور بہت سے مقامات ایسے تھے جہاں انھیں بھی وضاحت و صراحت کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام اس ذات سے زیادہ بہتر طریقہ پر کون کر سکتا تھا۔ جس کے قلب مطہر پر اس کا نزول ہو رہا تھا۔ چنانچہ احادیثِ صحیحہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جہاں ضرورت پڑتی تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تفسیر فرما دیتے تھے اور جن مواقع پر صحابہ کرام کو وضاحت درکار ہوتی تھی وہاں وہ خود دریافت کر لیتے تھے اور حضورؐ توضیح و تشریح فرما دیتے تھے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث مل جائے تو وہ تفسیر کا بہترین ماخذ سمجھی جائے گی۔ لیکن جس طرح اور مسائل میں موضوعات کی کثرت ہے اسی طرح تفسیری روایات میں بھی بہت تھوڑی ایسی ہیں جو قابلِ اعتماد سمجھی جائیں۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی الاتقان میں فرماتے ہیں:

"(تفسیر کا ایک ماخذ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا جاتا (ہے) اور یہ سب سے بہترین ماخذ ہے لیکن ضعیف اور موضوع روایت سے پرہیز لازم ہے۔ کیونکہ اس طرح کی بہت زیادہ روایتیں آئی ہیں اور اسی لیے امام احمد نے کہا ہے کہ: "تین قسم کی روایتیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔" مغازی، ملاحم اور تفسیر امام ممدوح کے اصحاب میں سے محققین نے کہا ہے کہ "اس قول سے امام صاحب کی مراد یہ ہے کہ بیشتر صورتوں میں ان امور کی صحیح اور متصل سندیں نہیں پائی جاتی ہیں۔ ورنہ یوں تو اس کے متعلق اکثر صحیح روایتیں بھی آئی ہیں جیسے سورہ الانعام کی آیت میں لفظ "ظلم" کی تفسیر "شرک" کے ساتھ جیسا یَسِیْرًا کی "عرض" کے

ساتھ اور قولہ تعالیٰ "وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ" میں لفظ "قُوَّةٍ" کی تفسیر "تیر اندازی" کے ساتھ بہ صحت مروی ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ تفسیر کے متعلق صحیح روایتیں فی الواقع بہت ہی کم ہیں بلکہ اس قسم کی روایتوں سے اصل مرفوع احادیث حد درجہ قلت کے ساتھ پائی گئی ہیں۔ اور انشاء اللہ میں اسی کتاب کے آخر میں ان سب روایتوں کو بھی بیان کروں گا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں وہ تفسیر اعلیٰ و افضل سمجھی جائے گی جو صحابہ کرامؓ سے منقول ہو۔ اس لیے کہ ان ہی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست اخذ فیض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں تاریخ تفسیر و مفسرین میں غلام احمد حریری تحریر فرماتے ہیں:

"صحابہ قرآن کی وہی تفسیر بیان کرتے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے یا جس آیت کا سبب نزول انھوں نے خود ملاحظہ کیا ہوتا۔ یا جو چیز بطریق اجتہاد و استنباط ان پر منکشف ہوتی۔"[2]

علامہ جلال الدین سیوطی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"(تفسیر کا دوسرا ماخذ) صحابی کے قول سے اخذ کرنا ہے۔ کیونکہ اس کی تفسیر علماء کے نزدیک بمنزلہ اس روایت کے ہے جو نبی کریم

---

1. الاتقان حصہ دوم (اردو) ترجمہ مولانا محمد حلیم انصاری۔ ناشر نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب۔ آرام باغ، کراچی ص ۵۶۶
2. تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۶۵

صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع ہو۔ جیسا کہ حاکم نے اپنی مستدرک میں کہا ہے۔ اور ابو الخطاب حنبلی نے کہا ہے کہ "جب ہم یہ کہیں کہ صحابی کا قول حجت نہیں ہے تو اس سے احتمال ہوتا ہے کہ اسکی طرف رجوع نہ کرنا چاہیے۔ مگر درست وہی پہلا قول ہے۔ یعنی صحابیؓ سے اخذ کرنا چاہیے کیونکہ صحابی کا قول روایت کی قسم سے ہے نہ کہ رائے کے باب سے۔"[1]

امام جلال الدین سیوطی کے حوالہ سے غلام احمد حریری نے مشہور مفسّر صحابہ کے حسب ذیل اسمائے گرامی تحریر کیے ہیں:

(۱) حضرت ابو بکرؓ — (۲) حضرت عمرؓ
(۳) حضرت عثمانؓ — (۴) حضرت علیؓ
(۵) حضرت ابن عباسؓ — (۶) حضرت ابن مسعودؓ
(۷) حضرت ابی بن کعبؓ — (۸) حضرت زید بن ثابتؓ
(۹) حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور (۱۰) حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ[2]

لیکن جب علامہ سیوطی تفسیری روایات کے بارے میں قطعیت کے ساتھ یہ فرماتے ہیں۔

"میں کہتا ہوں کہ تفسیر کے متعلق صحیح روایتیں فی الواقع بہت ہی کم ہیں۔ بلکہ اس قسم کی روایتوں سے اصلی مرفوع احادیث حد درجہ قلت کے ساتھ پائی گئی ہیں۔"

تو کیا آثار صحابہ کے بارے میں یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں بھی بہت سے

---

1. الاتقان حصہ دوم (اردو) ص ۵۶۶
2. تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۶۵

جعلی اور وضعی ہیں۔ خود غلام احمد حریری نے الاتقان کے حوالہ سے بتایا ہے کہ

"ابن الحکم کا قول ہے کہ میں نے امام شافعی کو یہ فرماتے سنا،
ابن عباس سے تفسیر کے سلسلہ میں تقریباً ایک سو احادیث ثابت
ہوئی ہیں۔" [۱] (الاتقان جلد ۲ - ص ۱۸۹)

اس کے بعد حریری صاحب اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اگر یہ بات واقعی امام شافعی نے فرمائی ہو تو اس سے یہ حقیقت
واضح ہوتی ہے کہ جو تفسیر ابن عباس کی جانب منسوب ہے اس میں
واضعین نے کس عظیم جسارت سے کام لیا ہے۔ اس کی سب سے
نمایاں دلیل یہ ہے کہ اس تفسیر میں ابن عباس سے جو اقوال نقل کیے گئے
ہیں اس میں کھلا ہوا تناقض پایا جاتا ہے۔" [۲]

اسی طرح تفسیر کے متعلق اپنی معلومات کے سلسلہ میں حضرت علیؓ کے جو بیانات
کتابوں میں درج ہیں وہ ان کے اپنے نہیں معلوم ہوتے بلکہ بعد کے لوگوں کے
ہیں جو حضرت علیؓ کی جانب منسوب کر دیے گئے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی تعلی
صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ہونا ممکن نہیں ہے۔

"تم لوگ مجھ سے سوال کرو! کیونکہ واللہ تم جو بات دریافت
کرو گے میں تم کو اس کی خبر دوں گا۔ ہاں مجھ سے کتاب اللہ کی
نسبت پوچھو اس لیے کہ واللہ کوئی آیت ایسی نہیں جس کی بابت
مجھ کو علم نہ ہو خواہ وہ رات کو اتری ہو یا دن کو، بہت ہموار
میدان میں نازل ہوئی ہو یا پہاڑ میں۔" [۳]

---

۱ تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۸۲ ۔ ۲ ایضاً ص ۸۲

۳ رسالہ فہم القرآن از ڈاکٹر عبدالرشید استاد شعبۂ علوم اسلامی جامعہ کراچی
ناشر طاہر سنز اردو بازار کراچی ص ۲۸

بنقرہ ——— "فرمایا۔ اگر میں چاہوں کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر سے ستر
اونٹوں کو لاد دوں تو میں کر سکتا ہوں۔" [۱]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاندین نے جس طرح احکام او امر نواہی
اور تاریخی واقعات کے سلسلہ میں احادیث نبوی اور آثار صحابہ میں موضوعات
کے انبار لگا دیے ہیں اسی طرح تفسیری روایات میں بھی خواہ وہ احادیث
کے نام سے ہوں یا آثار صحابہ کی قسم سے بہت کچھ جعلسازی سے کام لیا
ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں بڑی احتیاط اور تحقیق سے کام لینے کی ضرورت
ہے۔ لیکن جب یہ تصدیق ہو جائے کہ وہ صحیح ہیں تو پھر ان پر نہ صرف
یہ کہ اعتماد کرنا چاہیے بلکہ ان دونوں کو تفسیر کے اعلیٰ ترین ماخذ میں
شمار کرنا چاہیے۔

امام جلال الدین سیوطی نے تیسرا ماخذ تفسیر مطلق لغت کو اور
چوتھا ماخذ کلام کے معنی مقتضی اور شریعت کو قرار دیا ہے۔

ان چار ماخذات کی نشاندہی کرنے سے پہلے علامہ سیوطی نے
علماء کے حوالے سے مفسرین کے لیے جو طریقۂ کار بتایا ہے وہ زیادہ
مدلل اور معقول ہے۔ اور اسی کے مطابق عمل کرنا مناسب ہے۔ یہ ضرور
ہے کہ ہر زمانہ میں لوگوں کی عقل اور سمجھ بوجھ کو دیکھتے ہوئے بات کیجائے
لیکن ان حدود سے تجاوز کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ اپنی رائے سے کوئی
بات کہنا یا قرآن کو اسرائیلیات فلسفۂ قدیم، مسائل تصوف یا جدید
سائنس کے نظریات سے گرانبار کر دینا یا ان کا ترجمان قرار دینا یقیناً

---

۱ رسالہ فہم القرآن از ڈاکٹر عبدالرشید۔ استاد شعبۂ علوم اسلامی جامعہ کراچی
ناشر طاہر سنز اردو بازار کراچی ص ۲۸

گمراہی ہے۔ قرآن کریم کتاب ہدایت ہے اور اس کو ہدایت کا سرچشمہ سمجھ کر
ہی پڑھا جائے اور اس کی تفسیر کی جائے۔

علامہ سیوطی نے مفسرین کے لیے حسب ذیل طریقہ کار بتایا ہے اور
یہی صحیح ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"علماء نے کہا کہ: جو شخص کتاب اللہ کی تفسیر کا ارادہ کرے
وہ پہلے قرآن شریف کی تفسیر قرآن ہی میں تلاش کرے اسلیے
کہ قرآن شریف میں جو چیز ایک جگہ مجمل ہے اسی کی دوسرے مقام
پر تفسیر کر دی گئی ہے۔ اور جو شے ایک جگہ مختصر کر کے بیان
ہوئی ہے وہی شے قرآن شریف کے اندر دوسرے مقام پر
تفصیل سے بیان کر دی گئی ہے۔ (ابن جوزی نے تو ایک خاص
کتاب ہی ان امور کے بیان میں لکھی ہے جو کہ قرآن کریم میں ایک
جگہ اجمالاً بیان ہوئے ہیں اور دوسری جگہ اسی میں ان کی تفسیر
کر دی گئی ہے۔ میں نے ایسی باتوں کی چند مثالوں کی طرف مجمل
کی نوع میں اشارہ کر دیا ہے) پھر جب وہ مفسر قرآن شریف
کی تفسیر قرآن ہی سے نہ کر سکے تو اسے لازم ہے کہ (اس کے بعد)
قرآن کریم کی تفسیر کو سنت (صحیحہ) سے تلاش کرے۔ کیونکہ
سنت (حدیث) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی
شارح ہے اور اس کو واضح کرتی ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا
ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی باتوں کا بھی حکم
دیا ہے وہ سب احکام ایسے ہی ہیں جن کو آپ نے قرآن کریم
سے ہی سمجھا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ
لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (فی آیات اُخر)

ترجمہ: ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی
ہے تاکہ تم خدا کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے مقدمات
فیصل کرو۔ (یعنی ان ہدایت کے مطابق جو دیگر آیات میں
بیان کی گئی ہیں۔) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے
یہ بھی فرمایا ہے کہ "آگاہ رہو بے شک مجھ کو قرآن دیا گیا ہے
اور اسی کے مطابق ایک اور چیز بھی اس کے ساتھ عطا ہوئی
ہے یعنی سنت) اور اگر سنت سے بھی تفسیر کا پتہ نہ ملے تو
اب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اقوال کی طرف رجوع کرنا
چاہیے۔ اس لیے کہ بلاشبہ وہ لوگ قرآن کے بہت بڑے عالم
تھے۔ کیونکہ انھوں نے تمام قرآن اور احوال نزول کے وقت
دیکھے تھے۔ اور یوں بھی کہ وہ لوگ کامل فہم، صحیح علم اور
عمل صالح کی صفات سے متصف تھے۔"

(الاتقان حصہ دوم ۵۵۶)

تفسیر قرآن کے لیے ان ماخذات کے بعد تابعینؒ اور تبع تابعین سے
رجوع کرنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ ساتھ شانِ نزول یا اسباب نزول سے
بھی مدد لینی چاہیے۔ لیکن اس معاملہ میں افراط سے کام نہ لیا جائے۔
یعنی ہر آیت کے لیے شانِ نزول کی جستجو میں نہ رہا جائے کیونکہ ایسے
واقعات بہت محدود تعداد میں ہیں جو کسی آیت کے نزول کا سبب بنے
اسی طرح تفسیر بالرائے سے حتی الوسع پرہیز کیا جائے اس لیے کہ اس کے
لیے بڑی سخت وعید ہے۔ البتہ جو لوگ عربوں کے اسلوب کلام، عربی
الفاظ اور ان کے وجوہ دلالت سے بخوبی آگاہ ہوں۔ اس کے ساتھ
ساتھ وہ اشعار جاہلی، اسباب نزول، ناسخ و منسوخ اور ان امور سے

نابلد نہ ہوں۔ جو مفسر کے لیے از بس ناگزیر ہیں۔ ان کے لیے اپنی
رائے سے تفسیر کرنا جائز ہے۔ ایسے لوگوں کو اصحاب الرائے کہا جاتا ہے۔

شروع میں تفسیر بہت سادہ اور مختصر ہوتی تھی۔ بعض اوقات تو
صرف اشارے ہی ہوتے تھے۔ مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت
کیا گیا کہ مغضوب علیہم کون لوگ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "یہود"۔ کہا گیا،
اور "الضالین" یہ کون ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
"نصاریٰ"۔

اسی طرح عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً کی
تلاوت فرمائی تو میں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے کیا
معنی ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص زیادہ عقلمند ہوگا وہی
تم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کی ہوئی چیزوں سے بہت پرہیز
کرے گا۔ اور اطاعتِ الٰہی پر بہت زیادہ عمل پیرا ہوگا۔

جیسے جیسے آغازِ اسلام سے دوری ہوتی گئی ویسے ویسے تفسیر کی
ضرورت بھی بڑھ گئی اور اس میں تفصیل بھی پیدا ہوتی گئی۔ ویسے بھی
عرب لوگ "مَا قَلَّ وَدَلَّ" کے قائل ہیں۔ عجمی مزاج تفصیل کا طالب
ہے۔ چنانچہ جب علوم اسلامی کی اشاعت کا کام عجمیوں نے اپنے ہاتھ
میں لیا تو انھوں نے دیگر علوم کی طرح تفسیر میں بھی تفصیلات بھر دیں۔
ابن جریر طبری پہلے مفسر ہیں جن کی تفسیر "جامع البیان فی تفسیر القرآن"
نہایت تفصیلی ہے۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ سے تفسیر قرآن میں
اسرائیلیات بھی شامل ہونا شروع ہو گئیں۔ بعض یہود جب دائرہ اسلام

میں داخل ہوتے تو انھوں نے قرآن کریم کے مجمل بیانات کی تفسیر
بائیبل میں درج تفصیلات سے کی۔ پھر یہ دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اور
یہود و نصاریٰ کے اثر سے بائیبل کی بہت سی من گھڑت داستانیں
بھی تفسیر میں شامل ہو گئیں۔ اور اب وہ عام مسلمانوں کے لیے جزو
ایمان کا درجہ حاصل کر گئی ہیں۔

نزول قرآن کے وقت بعض ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ
سے کوئی نہ کوئی قرآنی آیت نازل ہوئی۔ چونکہ یہ واقعات صحابہ کے
علم میں ہوتے تھے۔ اس لیے جب وہ ایسی آیات کی تفسیر بیان کرتے تو
ان واقعات کو اسبابِ نزول یا شانِ نزول کے طور پر پیش کرتے تھے۔
ان اسباب سے ان آیات کے مطالب سمجھنے میں مدد ملتی تھی۔ آج بھی
ایسی آیات کی تفسیر کو بہتر طریقہ پر سمجھنے میں ان کی شانِ نزول سے کافی
مدد ملتی ہے۔ مثلاً یہ آیت بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں نازل ہوئی
تھی جس کی وجہ سے ایسے موقعوں کے لیے حکم خود بخود معلوم ہو گیا
تھا۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ
تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ
عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○ (الانفال ۸: ۶۷) (ترجمہ: کسی نبی کے لیے زیبا
نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ زمین میں دشمنوں
کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو۔ حالانکہ
اللہ کے پیشِ نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے)۔

اس قسم کے اور بھی واقعات ہیں مگر محدود تعداد میں۔ جن کی
طرف آیاتِ قرآنی اشارہ کر رہی ہیں۔ ایسے واقعات کا علم درحقیقت
آیات قرآنی کے معنی سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے۔ اس طرح شانِ نزول

کی تلاش و جستجو ضروری ہے تاکہ آیت کا محل نزول صحیح معلوم ہو جائے"۔
شاہ ولی اللہؒ نے "فوز الکبیر" میں اس موضوع پر کافی روشنی ڈالی ہے۔
مگر بعض مفسّرین نے اس معاملہ میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ جیسے
محمد ابن اسحاق کلبی۔ اس نے اسباب میں اتنی زیادتی کی ہے کہ ہر آیت کے تحت
ایک قصہ نقل کر دیا ہے۔

خلافتِ عباسیہ کے زمانہ میں جب یونان سے فلسفہ درآمد ہوتو ہر چیز
کو فلسفہ کے رنگ میں رنگا جانے لگا۔ اسی کی مدد سے مسلمانوں میں ایک
نئے علم "علم الکلام" کا اضافہ ہوا۔ شروع میں اس کا مقصد نیک اور
درست تھا۔ اس لیے کہ مخالفین و معاندین کو ان ہی کی دلائل سے خاموش
کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بعد میں اس کی لَے اتنی بڑھتی کہ قرآن کریم کی تفسیر بھی
کلیتہً یا بہت کچھ اسی کی روشنی میں کی جانے لگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتابِ
ہدایت فلسفہ کی کتاب معلوم ہونے لگی۔ اس معاملہ میں معتزلہ نے بہت
شدت برتی۔ اور اس کی وجہ سے بحث و مباحثہ اور مناظروں کی گرم بازاری
شروع ہو گئی اور دین کی حرارت سرد پڑ گئی۔ جار اللہ زمخشری کی "کشاف"
اور امام فخر الدین رازی کی "تفسیر کبیر" اسی نوع کی تفسیریں ہیں۔ اول الذکر
اگرچہ ادبی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے لیکن اعتزال کے توسط سے اس میں
فلسفہ کا رنگ آگیا ہے۔

چھٹی ساتویں صدی ہجری میں "تصوّف" کو کافی فروغ حاصل ہوا
اور حضرت محی الدین ابن عربیؒ کے اثر سے توحید وجودی یا وحدت الوجود
کے نظریہ کو اتنی مقبولیت نصیب ہوئی کہ قرآن کریم کی تفسیر تصوّف کی اصطلاحوں
میں کی جانے لگی۔ اور حضرت ابن عربیؒ نے تفسیر قرآن پر توحید وجودی کا
اتنا گہرا رنگ چڑھایا کہ شریعت اور شرعی مسائل پس منظر میں جا پڑے

اور معلوم ہونے لگا کہ قرآن کریم تصوّف کی کتاب ہے۔

موجودہ زمانہ میں سائنس اور سائنسی ایجادات کا بہت زور
ہے۔ اور سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے اقوامِ عالم کی قیادت ان ہی
قوموں کے ہاتھ میں ہے جو سائنس کو ترقی دے رہی ہیں۔ اس کی بنا پر
ہمارے بعض دانشوروں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ یہ قومیں ترقی کے میدان
میں ہم سے اس لیے آگے ہیں کہ انھوں نے قرآنی تعلیم پر عمل کرتے ہوئے
اپنی توجہ کو سائنسی علوم پر مرکوز کر دیا ہے۔ ہم مسلمان تو صرف نماز،
روزے کے چکر میں پڑ گئے ہیں اور انھوں نے مقصد تخلیقِ آدم کو پیشِ نظر
رکھتے ہوئے ہر اس کام کو اپنا لیا ہے جو دنیا میں ترقی و سر بلندی کا موجب
ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و کبریائی اور اس کی قدرت
و خلاقیت کو سمجھنے کے لیے کائنات کی مختلف اشیاء پر غور و تدبر کرنے کیلئے
جو ہدایت دی گئی ہے اس کو ان مرعوب ذہنیت کے دانشوروں نے
سائنسی ایجادات و اختراعات کی جانب اشارات قرار دے کر مسلمانوں
کو مشورہ دینا شروع کر دیا ہے کہ اب بھی اگر تم دنیا میں ترقی کرنا چاہتے
ہو تو قرآن کے ان اشاروں کو سمجھو اور ان کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ
سائنسی ایجادات کرو۔ بعض حضرات نے اس سلسلہ میں کتابیں بھی لکھی
ہیں۔ جیسے دو قرآن، سائنٹیفک قرآن، تجلیاتِ قرآن وغیرہ۔ ان کے
علاوہ آئے دن اس موضوع پر مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انکے نزدیک
قرآن سائنس کی کتاب ہے اور اس کی تفسیر سائنس ہی کی روشنی میں ہونی
چاہیے۔ اور اسی کے مطابق ہمارا نظامِ زندگی مرتب ہونا چاہیے۔ علامہ اقبال
کے اس مصرعہ کے مصداق یہی لوگ ہیں۔

ع خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

اس سلسلہ میں ایک غیر مسلم کی رائے سن لیجیے۔ بائبل قرآن اور سائنس کے مصنف موریس بوکائیے اپنے ایک لیکچر میں جس کا عنوان "قرآن اور جدید سائنس" ہے، واضح الفاظ میں کہتے ہیں:

" تاہم ان سائنسی مباحث سے ہمیں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ قرآن مجید خاص طور پر ایک مذہبی کتاب ہے اور اس سے یہ توقع ہرگز نہیں رکھی جا سکتی کہ اس کا مقصد بنیادی طور پر سائنسی معلومات فراہم کرنا ہے۔ جب انسان کو تخلیق سے متعلق امور اور متعدد قدرتی حوادث پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ اس طرح کی مثالوں کو سامنے رکھ کر اس مقصد کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور اس کی ربوبیت پر زور دینے کے لیے ہوتا ہے۔ یہ حقیقت کہ اس غور و خوض میں ہی ہمیں سائنسی معلومات سے متعلق جو حوالے مل جاتے ہیں وہ یقیناً خدا کا ایسا انعام ہیں جن کی قدر و قیمت اس دور میں اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جب سائنس پر مبنی دہریت اس کوشش میں ہے کہ الوہیت پر ایمان و عقیدہ کو ختم کر کے وہ اپنا اثر قائم کرلے لیکن قرآن کو اس بات کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی فوق الفطرت باتوں کو منوانے کے لیے اس طرح کی غیر معمولی خصوصیات کو کام میں لائے۔ اس قسم کے سائنسی بیانات دراصل وحی والہام کا صرف ایک مخصوص پہلو ہے۔"[1]

---

[1] قرآن اور جدید سائنس از موریس بوکائیے (اردو ترجمہ) مقام اشاعت بالاکوٹ اکیڈمی متصل مسجد قدسیہ۔ اورنگ آباد ناظم آباد کراچی ۱۹۸۰ء ص ۱۹

طنطاوی جوہری کی تفسیر "الجواہر فی تفسیر القرآن الحکیم" سائنسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔

زمانہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے نظریات و عقائد میں تبدیلیوں کی وجہ سے قرآن کریم کی تفسیریں مختلف نہج پر لکھی گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تفسیروں کی کئی اقسام ہو گئیں پہلی اور افضل ترین قسم تو دراصل وہ ہو گی جو ہادئ برحق صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع ہو۔ اس کے بعد صحابہؓ سے منقول تفسیری روایات ہیں۔ لیکن چونکہ صحابہ کرام بھی عموماً وہی باتیں کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو پہنچی ہیں۔ علاوہ ازیں نزولِ قرآن کے زمانہ میں وہ موجود تھے اور اکثر آیات کے اسباب اور مواقع سے بھی وہ آگاہ تھے اس لیے بعض حضرات ان کی تفسیری روایات کو بھی احادیث کی طرح سمجھ کر دونوں پر مشتمل تفاسیر کو ایک ہی قسم میں شمار کرتے ہیں۔

کچھ حضرات تو اس قسم کو تفسیر بالماثور کا نام دیتے ہیں۔ اور کچھ تفسیر بحسب الآثار کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

برصغیر سے باہر لکھی جانے والی عربی تفاسیر کی حسب ذیل اقسام ہیں۔

(۱) تفسیر بالماثور یا تفسیر بحسب الآثار
(۲) تفسیر بحسب اللغۃ
(۳) تفسیر بحسب المذاہب الفقہیہ
(۴) تفسیر بحسب المذاہب الکلامیہ
(۵) تفسیر بحسب العلوم العمرانیہ
(۶) تفسیر بحسب العلوم الکونیہ
(۷) تفسیر بحسب الصوفیہ

(۱) تفسیر بالماثور یا تفسیر بحسب الآثار

اس قسم میں وہ تفاسیر شامل ہیں جو احادیثِ نبوی، آثار صحابہؓ اور اقوالِ تابعین کو مدِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں جو کتابیں اس انداز میں لکھی گئی ہیں ان میں سے چند ذیل میں درج ہیں۔

(۱) تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس مولف ابو طاہر نیروز آبادی مطبع ازہریہ

(۲) جامع البیان فی تفسیر قرآن " ابن جریر طبری" الامیریہ

(۳) تفسیر القرآن العظیم " عماد الدین ابن کثیر" التجاریہ

(۴) الجواہر الحسان " عبدالرحمن ثعالبی" الجزائر

(۵) الدر المنثور " جلال الدین سیوطی" میمنیہ

(۲) تفسیر بحسب اللغۃ

جس تفسیر میں قرآن پاک کی تشریح و توضیح کی جاتی ہے اور زمانۂ نزول قرآن کے اشعار اور خطبوں سے استشہاد کیا جاتا ہے وہ تفسیر بحسب اللغۃ کہلاتی ہے۔ اس انداز پر لکھی جانے والی چند تفاسیر کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) مجاز القرآن مولف ابوعبیدہ

(۲) معانی القرآن " فراء

(۳) الکشاف " محمود بن عمر جاراللہ زمخشری

(۳) تفسیر بحسب المذاہب الفقہیہ

جو تفسیر فقہی اور احکامی مسائل کے استنباط کی بنیاد پر لکھی جائے۔

وہ اس ذیل میں آتی ہے۔ اس نوع کی تفاسیر کی تعداد کثیر ہے۔ ان میں سے چند کتابوں کے نام ذیل میں درج ہیں۔

(۱) احکام القرآن، مولف احمد بن علی رازی ابوبکر جصاص مطبع البہیۃ المصریہ

(۲) احکام القرآن، ابوبکر بن العربی، سعادۃ

(۳) الجامع الاحکام القرآن، قرطبی، دار الکتب

(۴) تفسیر بحسب المذاہب الکلامیہ

اس قسم کی تفاسیر میں کلامی نقطۂ نظر کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اور عقلی دلائل سے قرآن کے مفہوم و مراد کو سمجھایا جاتا ہے۔ عقائد کی تفہیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ چند تفاسیر کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) مفاتیح الغیب معروف بہ تفسیر کبیر، مولف امام فخر الدین رازی مطبع امیریہ

(۲) جامع التاویل ابومسلم اصفہانی (معتزلی)

(۳) تاویلات القرآن امام ابوالمنصور ماتریدی

(۵) تفسیر بحسب العلوم العمرانیہ

عمرانیات یا معاشرتی اور تمدنی نقطۂ نظر سے کی جانے والی تفسیر اس ذیل میں آتی ہے۔ اس قسم کی تفسیر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن ہر دور کے انسانی مسائل کو حل کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس سلسلہ کی تفاسیر ذیل میں درج ہیں۔

(۱) تفسیر المنار مولف علامہ رشید رضا بہ امداد مفتی محمد عبدہٗ

(۲) الدروس الدینیہ مطبوعے الازہر

مطبع المنار

(۶) تفسیر بحسب العلوم الکونیہ

علوم الکونیہ ان علوم کو کہا جاتا ہے جن پر دنیاوی ترقی و تنزّل کا بہت کچھ انحصار ہے۔ آجکل یہ حیثیت سائنسی علوم کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب قرآن کریم پورے نظامِ زندگی کا احاطہ کرتا ہے تو سائنسی علوم بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں کہے جاسکتے۔ لیکن اس پر اتنا زور دینے کی ضرورت نہیں کہ قرآن بجائے کتابِ ہدایت کے سائنس کی کتاب معلوم ہونے لگے۔ اس نوع کی چند تفسیریں ہیں۔ ان میں قابلِ ذکر درج ذیل ہے۔

(۱) تفسیر الجواہر مولف طنطاوی جوہری مطبع مصطفیٰ حلبی

(۷) تفسیر بحسب الصوفیہ

اس قسم کی تفسیر میں مسائلِ تصوّف کا استخراج و استنباط آیات قرآنی سے کیا جاتا ہے۔ اور تشریح و توضیح صوفیہ کے نقطۂ نظر سے کیجاتی ہے۔ خاص طور پر نظریۂ وحدت الوجود کا ثبوت بہم پہنچایا جاتا ہے اس قسم کی حسب ذیل تفاسیر قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) تفسیر قرآن الکریم مولف سہل تستری مطبع سعادہ
(۲) عرائس البیان " ابومحمد روزجہاں " ہند
(۳) تفسیر ابنِ عربی " عبدالرزاق قاشانی " امیریہ

برصغیر میں تفسیر قرآن کا کام

چونکہ پورا تحقیقی مقالہ اسی موضوع پر ہے اور اس پر کافی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے اس لیے مزید کچھ لکھنا غیر ضروری ہے۔ صرف اتنا بتادینا کافی ہے کہ یہاں تفسیر کا کام بہت دیر سے شروع ہوا۔ ابتداء عربی تفاسیر سے ہوئی۔ ان میں بھی قابلِ ذکر گجرات یا دکن میں لکھی گئیں۔ شمالی ہندوستان میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس خلا کو پورا کیا۔ ان کی تفسیر مظہری اٹھارہویں صدی میں منصۂ شہود پر آئی لیکن بہترین تفاسیر میں اس کا شمار ہے۔ اردو میں تفسیر کا کام بہت پہلے شروع ہو گیا تھا اور دکن اور شمالی ہند میں بڑی تعداد میں مکمل اور جزوی تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن رواں صدی میں جو تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ اپنے حجم اور مواد کے اعتبار سے نہایت گراں قدر ہیں۔ یہ تفسیریں کئی کئی جلدوں میں ہیں اور مفسّرین نے قرآن کریم کے منشاء و مقصود کو مختلف انداز سے سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ علماء نے براہِ راست اردو میں لکھنے کے ساتھ ساتھ متعدد مشہور عربی تفاسیر کو بھی اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اور اب کہ برصغیر کے مسلمانوں کا عربی زبان سے تعلق بہت کم رہ گیا ہے۔ عربی کے اس نادر و نایاب ذخیرہ کو ان کے لیے سہل الحصول بنادیا ہے۔ تفسیر لکھنے کا کام ہر مکتبِ فکر کے لوگوں نے کیا ہے۔ نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ سے ان تفاسیر میں اختلاف کا پایا جانا تو ایک قدرتی امر ہے لیکن کسی کی نیت پر شک نہیں کیا جاسکتا۔

تفسیر کی جو قسمیں سطورِ بالا میں بتائی گئی ہیں ان سب کا اطلاق برصغیر میں لکھی جانے والی بالخصوص اردو کی تفاسیر پر نہیں ہوتا۔ اکثر تفاسیر میں تو کوشش کی گئی ہے کہ عام فہم انداز میں قرآن کے منشاء و مقصود کو واضح

کر دیا جائے تاکہ عام آدمی جان سکے کہ اللہ کے کلام سے دینی اور دنیوی
زندگی میں کس طرح ہدایت حاصل کی جائے۔ بعض حضرات نے آیاتِ
قرآنی میں تسلسل کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض حضرات نے
جدید ذہن کو مطمئن کرنا چاہا ہے۔ غرض ہر مفسر کے پیشِ نظر قرآنی تعلیم
کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابلِ فہم بنانا اور ہدایت پہنچانا ہے۔
اور اس مقصد کے نیک ہونے میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

چونکہ برصغیر میں مختلف مکاتبِ فکر کے مسلمان آباد ہیں لہٰذا اردو
زبان میں لکھی جانے والی تفاسیر کی قسمیں اسی اعتبار سے قائم کی جاسکتی ہیں۔
یہ قسمیں ذیل میں درج ہیں۔

(۱) تفسیر بحسب سوادِ اعظم اہلِ سنت
(۲) تفسیر بحسب جماعت اہلِ سنت
(۳) تفسیر بحسب امامیہ اثنا عشریہ
(۴) تفسیر بحسب جماعت قادیانی
(۵) تفسیر بحسب جماعت احمدی لاہور

جائزہ

اس مقابلہ کے موضوع کی وسعت کا اندازہ ہر وہ شخص کرسکتا ہے جس کو
علم ہے کہ مسلمانوں نے اپنی مذہبی کتاب یعنی قرآن حکیم کے ساتھ کس قدر
اعتنا کیا ہے۔ ویسے تو جملہ قرآنی علوم پر اتنا کام ہوا ہے کہ اس کی وسعتوں کا
احاطہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن اس کتابِ ہدایت کی تفسیر و تشریح کی جانب
کچھ زیادہ ہی توجہ کی گئی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے جب تک اس کو پوری
طرح اور صحیح طور پر سمجھا نہ جائے گا اس کے مطابق عمل کے لیے قدم کیسے

آگے بڑھے گا۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر چودہ سو سال سے اس بحرِ ناپیدا
کنار کے اندر غواصی کی جارہی ہے اور ہر غواص نے اپنی اپنی بساط کے
مطابق اس سے گوہر آبدار نکالے ہیں۔ اور انھیں اپنے خزینوں میں سلیقہ
سے سجایا ہے۔ یہ سب مل کر اتنا بڑا خزانہ جمع ہوگیا ہے کہ اس کا ایک
سرسری سا جائزہ لینا بھی کسی ایک انسان کے لیے دشوار ہے۔ چہ جائیکہ
ایک طرف اس عظیم گنجینہ کا عمومی جائزہ لینا اور دوسری طرف رواں
صدی کے دوران اردو ادب میں جمع شدہ سرمایہ کو کسی قدر عمیق نظر
سے دیکھنا۔ ان دونوں کاموں کی وسعتوں کا تصور بھی انسان کو پست
ہمت کر دینے کے لیے کافی ہے۔ لیکن چونکہ اس نیک کام کو کرنا تھا اس لیے
السَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ کہہ کر کام شروع کیا اور اللہ تعالیٰ
نے اس کو تکمیل کی منزل تک پہنچا دیا۔

مقالہ ہٰذا میں کام کی نوعیت تو ظاہر و باہر ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ
کتابِ ہدایت کو ہمارے دینی رہنماؤں نے کس کس طرح سمجھا ہے اور
دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ
نَسْتَعِیْنُ سورہ فاتحہ کی ایک آیت ہے جو دن میں بار بار پڑھی جاتی
ہے۔ یہ دراصل بارگاہِ ربّ العزت میں ایک عہد ہے جو بندہ اپنے رب
سے بار بار کرتا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں اسی لیے
اس کی وضاحت و صراحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس آیت کا ظاہری
مطلب تو یہ ہے کہ "اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور اے اللہ
ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں"۔ لیکن اس کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان
اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک تو اس آیت سے عبادت اور استعانت
دونوں کے لیے ایک ہی حکم نکلتا ہے۔ یعنی ان دونوں میں اللہ کے ساتھ

کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ لیکن دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ عبادت میں
تو واقعی کسی کو شریک نہیں ہونا چاہیے مگر استعانت میں شرکت کی
گنجائش نکلتی ہے۔ اس اختلاف کی صورت میں فیصلہ کرنا مشکل نظر آیا۔
لہٰذا ایسے بعض اختلافات کی نشاندہی کر دی گئی لیکن فیصلہ دوسروں کی
صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔ اللہ جس کو جیسی توفیق دے۔

قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے ہیں جہاں اختلاف کی تو کوئی گنجائش
نہیں ہے، البتہ قرآن کریم میں اس قدر ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے
کہ عوام کو سمجھانے کے لیے مفسرین کو تفصیلات بیان کرنا پڑیں۔ ان تفصیلات
کے بیان کرنے میں بھی کئی جگہ اختلاف محسوس ہوتا ہے۔ حتی الامکان ایسے
مقامات کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

لیکن جن مفسرین کا اس مقالہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے کاموں کا
الگ الگ جائزہ لینا اور ان کا باہم مقابلہ کرنا ہی نہایت دشوار امر تھا
اسی لیے زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی بلکہ جستہ جستہ
مقامات پر ان تفاسیر (صرف اردو تفاسیر) کا سرسری سا جائزہ لے لیا
گیا ہے۔ ممکن ہے اس جائزہ سے ان حضرات کو کچھ سہارا مل جائے جو آئندہ
الگ الگ تفاسیر پر کام کریں اور ان کا جائزہ لیں۔

جن علماء نے رواں صدی میں اردو زبان میں تفسیریں لکھی ہیں ان
سب ہی نے نہایت لگن، محنت اور عقیدت کے جذبے سے کام کیا ہے اور
پورے غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کے بعد تفاسیر بیان کی ہیں اور اس بات
کی پوری کوشش کی ہے کہ اسلاف سے بھی جس قدر ممکن ہو رہنمائی حاصل کریں۔
اس کے باوجود کہیں کہیں نقطۂ نظر میں اختلاف ہو گیا ہے۔ لیکن یہ اختلاف
بھی اکثر اوقات دلائل کی بنیاد پر ہوا ہے لہٰذا ان حضرات کو تو الزام دینا

مناسب نہیں البتہ قارئین کو غور و فکر کر کے خود کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔
اور پھر اس فیصلہ کی روشنی میں نیک نیتی سے عمل کرنا چاہیے۔

اکثر حضرات کا یہ کہنا ہے کہ اردو زبان کم عمر ہے اور زیادہ تر بے توجہی
کا شکار رہی ہے۔ ان کے اس بیان میں حقیقت کا عنصر کافی ہے۔ لیکن
اس زبان کی یہ خصوصیت بھی قابلِ داد ہے کہ اس کم عمری اور بے توجہی کے
باوجود یہ کئی میدانوں میں بہت سی ترقی یافتہ زبانوں سے گوئے سبقت لے گئی
ہے۔ ان ہی میں ایک علوم اسلامی کا دائرہ ہے۔ چنانچہ اسلام کے دینی مسائل
و موضوعات پر جتنا ذخیرہ اردو میں ہے اتنا سوائے عربی کے اور کسی زبان
میں نہیں ہے۔ اس مقالہ کی تیاری کے دوران یہ حقیقت ہم پر پوری طرح
منکشف ہو گئی ہے۔ اور اس حقیقت کو جھٹلانا اب انتہائی ہٹ دھرم آدمی
کے سوا اور کسی کے لیے ممکن نہیں رہا۔ ویسے تو علوم اسلامی پر ہی اردو میں
بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن قرآن کریم کے تراجم اور تفاسیر کی
جانب تو ہمارے علماء نے کچھ زیادہ ہی اعتنا کیا ہے۔ غالباً یہ
دعویٰ کسی طرح بھی بے بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اردو میں
قرآن کے جتنے ترجمے ہوئے ہیں اتنے سب زبانوں میں ملا کر
بھی نہیں ہوئے۔ اور تفاسیر میں بھی کیفیت اور کمیت دونوں
اعتبار سے عربی کے بعد اس کا دوسرا نمبر ہے۔ زبان و بیان کے
اعتبار سے ان تراجم و تفاسیر میں کافی تنوع ہے۔ اگرچہ فی زمانہ
مسلمان اپنے عمل اور کردار کے لحاظ سے اس مقام پر نہیں
ہیں جہاں سے وہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں پر اپنا
تفوق جتا سکیں۔ پھر بھی برصغیر میں انفرادی اور اجتماعی طور پر
دینی علوم پر اب بھی اتنا کام ہو رہا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم بھی

اس معاملہ میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تفسیری ادب میں چونکہ تفہیم دین کی راہ ہموار ہوتی ہے اس لیے تراجم اور تفاسیر کی جانب زیادہ توجہ ہے۔ جو لوگ یہ نیک کام انجام دے رہے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں اس کے لیے جزائے خیر دے اور ان کی نیک نیتی کی برکت سے عام مسلمانوں کو عمل نیک کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ اِھْدِنَا اِلٰی سِوَآءِ الصِّرَاطِ ط وَتَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ o

---